وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ

حجۃ الوداع

و

عمرات النبی ﷺ

تالیف

برکۃ العصر حضرۃ الحافظ الحاج مولانا محمد زکریا کاندھلوی ثم المدنی

ترجمہ

مولانا محمد یوسف لدھیانوی

ناشر

مکتبۃ الخلیل الاسلامی

۲/۲۳۵ ، بہادر آباد [illegible] کراچی

(۱) اسلامی کتب خانہ ۔ علامہ بنوری ٹاؤن۔ کراچی

(۲) درخواستی کتب خانہ۔ علامہ بنوری ٹاؤن۔ کراچی

(۳) کتب خانہ مظہری۔ گلشن اقبال۔ کراچی

(۴) مولانا اقبال نعمانی۔ آفیسرز کالونی گارڈن روڈ۔ کراچی

(۵) مکتبۃ الشیخؒ ۳۶۷/۳ بہادر آباد۔ کراچی

(۶) مکتبہ سید احمد شہید۔ اردو بازار۔ لاہور

فہرست مضامین رسالہ حجۃ الوداع

رسالۂ عمرات النبی صلی اللہ علیہ وسلم

حجۃ الوداع کا نام حجۃ الاسلام اور حجۃ البلاغ بھی ہے جیسا کہ البدایہ والنہایہ میں ہے اور بعض میں حجۃ التمام بھی ذکر کیا گیا ہے۔ تفصیل خطبہ منیٰ میں آئے گی۔ ان شاء اللہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً و مسلماً، اما بعد! جب میں پہلی مرتبہ مشکوٰۃ شریف کی تدریس میں کتاب الحج پر پہنچا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قصۂ حجۃ الوداع میں روایات کی کثرت اختلاف نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ کیونکہ میرے لئے اس فن شریف کی تدریس کا یہ پہلا موقعہ تھا۔ اگرچہ زمانۂ تعلیم ہی سے یہ روایات موجب خلجان تھیں کیونکہ ان کے طرق و متون اور راویوں کے درمیان تطبیق و ترجیح میں شدید اختلاف تھا۔ ان ابحاث پر مشائخ نے اگرچہ طویل کلام کیا ہے۔ چنانچہ نووی لکھتے ہیں کہ قاضی عیاض نے کہا ہے کہ:

"ان احادیث پر لوگوں نے بکثرت کلام کیا ہے۔ چنانچہ بعض نے بڑی عمدہ اور منصفانہ بحث کی ہے۔ اور بعض نے تکلف کرکے کوتاہی سے کام لیا ہے۔ بعض نے کثرت کلام سے بحث کو طویل کر دیا ہے اور بعض نے بقدر ضرورت پر اکتفاء کیا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ تفصیلی کلام ابوجعفر طحاوی حنفی نے کیا ہے۔ چنانچہ موصوف نے ہزار ورق سے زیادہ میں اس پر بحث کی ہے۔ ان کے علاوہ ابوجعفر طبری، ابوعبداللہ بن ابی صفرہ اور ان کے بھائی مہلب، قاضی ابوعبداللہ بن مرابط، قاضی ابوالحسن بن قصار بغدادی اور حافظ ابوعمر بن عبدالبر وغیرہ نے ان احادیث پر بہت کچھ لکھا ہے۔"

نووی کا کلام مع اضافہ از شرح مواہب زرقانی مختصراً۔ تفصیل اوجز میں ہے۔

اسی طرح قصۂ حجۃ الوداع میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث سب سے جامع ہے جس میں محدثین اور اہل سیر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حج مبارک کی تفصیل ذکر کی ہے۔ انہوں نے اسی حدیث کو مدار بنایا ہے۔ اسی بنا پر شیخ ابن ہمام نے فتح القدیر کی کتاب الحج کے آغاز میں اسی حدیث کو ذکر فرمایا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

جی چاہا کہ اس رسالہ کے آغاز میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث طویل سے برکت حاصل کروں کہ یہ بہت بڑی اصل اور اس باب کی جامع ترین حدیث ہے۔

اور نووی شرح مسلم میں فرماتے ہیں:

"یہ ایک عظیم الشان حدیث ہے جو بہت سے فوائد اور نفیس واہم قواعد پر مشتمل ہے قاضی کہتے ہیں کہ لوگوں نے اس حدیث کے فقہی مسائل پر بکثرت کلام کیا ہے، اور اس حدیث کی شرح میں ابن منذر نے ایک بڑا رسالہ تالیف کیا ہے، اور اس سے ڈیڑھ سو سے زیادہ مسائل اخذ کئے ہیں اور اگر مزید غور و فکر اور بحث و تفتیش سے کام لیا جاتا تو تقریباً اتنے ہی اور مسائل اس سے نکل سکتے تھے۔"

نووی ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"حجۃ الوداع کی حدیث کو بہترین طریقے سے روایت کرنے میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ تمام صحابہ سے سبقت لے گئے ہیں انہوں نے مدینہ طیبہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روانگی سے لے کر آخر تک حجۃ الوداع کا پورا واقعہ ذکر فرمایا ہے۔"

(بہرحال ان احادیث پر متقدمین نے اگرچہ طویل کلام کیا ہے)، مگر قصہ حجۃ الوداع پر مشتمل جو کتابیں میرے پاس موجود تھیں ان میں شیخ ابن قیم کی زاد المعاد سب سے جامع نظر آئی۔ شیخ ابن قیم کے کلام میں واقعہ کی تفصیل اگرچہ موجود تھی مگر ان لوگوں کے لئے جو موصوف کے فقہی مسلک سے متفق نہیں کچھ زیادہ مفید نہیں تھی کیونکہ اول تو اس میں حنبلی مذہب کی تائید ہے، علاوہ ازیں اس میں احناف کے قول کو دوسروں کے اقوال سے ممتاز نہیں کیا گیا۔ اس لئے جی چاہا کہ زاد المعاد سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حج مبارک کے بیان کی تلخیص کروں۔ اور اصل قصہ کو اس رسالہ کا متن قرار دوں اور متعلقہ مباحث کو بطور حاشیہ کی شرح کے بنا دوں۔ نیز حضرات احناف کے اقوال اور دلائل و توجیہات بھی ذکر کروں۔ مگر چونکہ مختصر وقت میں قصہ کا استحضار مقصود تھا، اور تمام متعلقہ مباحث کا ذکر اس قلیل فرصت میں ممکن نہ تھا اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس قصہ کا خلاصہ بطور متن کے پہلے مرتب کر لیا جائے اور شرح و تعلیق کا اضافہ بشرط فرصت فارغ اوقات میں ہوتا رہے۔ چنانچہ بتاریخ ۲۲ ربیع الاول [illegible]ھ شب جمعہ کو مقامی وقت کے مطابق بارہ بجے اس رسالہ کا آغاز کیا۔ واللہ الموفق لکل خیر والمیسر لکل عسیر

محمد زکریا کاندھلوی   مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور

قال الشیخ ابن القیم: فصل فی هدیه صلی الله علیه وآله وسلم فی حجته

ترجمہ: شیخ ابن قیم فرماتے ہیں: فصل: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقۂ حج کے بیان میں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حجوں کی تعداد

شیخ ابن قیم فرماتے ہیں: فصل: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقۂ حج میں۔ اس میں تو اختلاف نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد صرف سنہ ۱۰ھ میں ایک حج کیا۔ یعنی حجۃ الوداع [اس کو حجۃ الوداع کہنا جائز ہے جیسا کہ پہلے بھی گزر چکا ہے اور آئندہ بھی آئے گا] البتہ اس میں اختلاف ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت سے پہلے حج کیا یا نہیں؟ - ترمذی شریف میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین حج کئے دو ہجرت سے پہلے الخ امام ترمذی فرماتے ہیں: یہ حدیث بروایت سفیان غریب ہے۔ امام بخاری اسے بروایت ثوری نہیں پہچانتے۔ شیخ اکبر ابن عربی نے اپنی کتاب "محاضرۃ الابرار ومسامرۃ الاخیار" میں اسی پر جزم کیا ہے۔ اسی طرح صاحب سفر السعادۃ نے بھی، چنانچہ وہ فرماتے ہیں: جمہور علماء اس پر ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد صرف ایک حج کیا۔ اور یہ حجۃ الوداع کہلاتا ہے۔ اور اس میں اختلاف نہیں کہ یہ سنہ ۱۰ھ میں ہوا ہے باقی رہا قبل از ہجرت کا سوال؟ سو جامع ترمذی میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبل از ہجرت دو حج کئے۔ صاحب دار المعلی نے نقل کیا ہے کہ آپ نے تین یا چار سے زیادہ حج کئے مگر کوئی تعداد محفوظ نہیں۔

ابن اثیر فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت سے قبل ہر سال حج کیا کرتے تھے۔ ابن جوزی کہتے ہیں کہ آپ نے متعدد حج کئے جن کی تعداد نہیں جانتا ہے۔ ابن جوزی کا یہ قول حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح میں، قسطلانی نے مواہب میں، زرقانی شارح مواہب اور شارح سفر السعادۃ نے اسی طرح نقل کیا ہے۔ ابن جوزی کے قول کا مضمون حاکم نے سفیان ثوری سے بھی روایت کیا ہے ----- سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نے حج کیا۔ آپ نے ہندوستان سے چالیس حج پیدل کئے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس نے حج نہ کیا ہو، جیسا کہ الاقناع میں ہے۔ اور القریٰ لقاصد ام القریٰ میں تخریج ابن ابی عثمان ابن ساج سے نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ مجھے سعید نے خبر دی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے ستر حج پیدل کئے۔ الحدیث۔

یہ حضرت شیخ مدظلہ نے حاشیہ میں تحریر فرمایا ہے کہ حتی الامکان میں جہاں عبارت "قال" کے لفظ سے شروع ہوگی وہ حافظ ابن قیم کی عبارت ہے اور قلت سے حضرت شیخ مدظلہ کی اپنی عبارت ہوگی۔ ترجمہ میں "قال" کی جگہ صرف (ق) اور قلت کی جگہ (ش) کی علامت رکھی گئی ہے یعنی ق سے مراد ابن قیم اور ش سے مراد حضرت شیخ مدظلہ۔ (مترجم)

وتأتى؟ ولما أذن الحج بادر رسول الله صلى الله عليه وسلم إليه وتهيأ؟ ولما عزم
صلى الله عليه وسلم اعلم الناس انه حاج

ترجمہ: ابن قیم فرماتے ہیں: جب حج کا حکم نازل ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تیاری شروع کی۔ اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ فرمایا تو لوگوں کو عام اطلاع فرمائی کہ آپ حج پر جا رہے ہیں۔

حج کب فرض ہوا؟

ابن قیم فرماتے ہیں: جب حج کا حکم نازل ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر تاخیر کے اس کی تیاری شروع کی۔ اور حج کا حکم سنہ ۹ ہجری میں نازل ہوا (ارشاد)۔ علامہ عینیؒ نے فرضیت حج کے سلسلہ میں سنہ ۵ھ سے سنہ ۱۰ھ تک متفرق اقوال ذکر کئے ہیں اور اپنی جانب سے کسی قول کو ترجیح نہیں دی۔ البتہ امام قرطبی سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے سنہ ۹ھ کو ترجیح دی ہے۔ اسی طرح ملا علی قاری نے بھی فرضیت میں مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد فرمایا: "اس میں کل گیارہ اقوال ہیں، ان میں سے آٹھ قول مع قائل کی تعیین کے ساتھ احقر نے مفصل ذکر کئے ہیں۔" شیخ ابن تیمیہ اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں: "اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ سنہ ۹ھ سے پہلے حج فرض نہیں ہوا۔" مگر میں کہتا ہوں کہ احقر نے ایک قول سنہ ۱۰ھ کا بھی نقل کیا ہے۔ چنانچہ رافعی نے کتاب الحج میں اسی پر جزم کیا ہے اور یہی المنتقی میں ہے۔ اور صاحب الخمیس نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے۔ چنانچہ کہا ہے کہ صحیح قول کے مطابق سنہ ۹ھ ہی میں حج فرض ہوا۔ قسطلانیؒ المواہب میں فرماتے ہیں: جمہور کا قول یہ ہے کہ حج سنہ ۶ھ میں فرض ہوا کیونکہ آیت "واتموا الحج" اسی سال نازل ہوئی۔ اس کے علاوہ دوسرے اقوال بھی انہوں نے ذکر کئے ہیں۔ شافعیہ میں سے صاحب الروضہ نے بھی سنہ ۶ھ کا قول جمہور کی طرف منسوب کیا ہے۔ شافعی نے سنہ ۶ھ پر جزم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "جو شخص اس سے قبل کا دعویٰ کرے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں۔" قاضی عیاض نے بھی جیسا کہ طحاوی میں ہے اسی کو صحیح کہا ہے۔ ابن عابدین فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سال حج نہ کرنے میں کئی احتمال ہو سکتے ہیں۔ اور انہوں نے اس احتمال کو ترجیح دی ہے کہ شاید وقت حج گزرنے کے بعد حج فرض ہوا ہوگا۔ لیکن مناسب یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے سال حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بھیجا اور دوسرے سال خود بنفس نفیس تشریف لے گئے۔ مگر شیخ ابن قیم نے حضرت ابوبکر کے بھیجے جانے کو حج کے لئے نہیں بلکہ اطلاع و اعلان کے لئے بتایا ہے کہ آئندہ سال کوئی مشرک حج کو نہ آئے اور کوئی شخص برہنہ طواف نہ کرے الخ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادۂ حج کا اعلان

رتی؟ اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ فرمایا تو لوگوں کو عام اطلاع فرمائی کہ آپ حج پر جا رہے ہیں

فتجهز والخروج معه وسمع بذالك من حول المدينة فقدموا يريدون الحج مع رسول الله صلى الله عليه وسلم قلت: ومع النبي صلى الله عليه وسلم نساؤه ووافاه في الطريق خلائق لا يحصون . فكانوا من بين يديه ومن خلفه وعن يمينه وعن شماله مد البصر

ترجمہ: چنانچہ لوگوں نے آپ کے ساتھ حج کو جانے کی تیاری کی اور مدینے کے گرد و پیش کے لوگوں کو اس کی خبر ہوئی تو وہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کے ارادے سے جمع ہو گئے (رش)، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ازواج مطہرات بھی تھیں، اور بے شمار مخلوق آپ سے راستے میں آ کر ملتی رہی، چنانچہ آپ کے آگے پیچھے دائیں بائیں حد نظر تک آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے

—— اور آپ نے اس وقت ان کو یہ نہیں بتایا تھا کہ رمضان کا عمرہ حج کے برابر ہے، جیسا کہ ابن حزم کو وہم ہوا ہے۔ ابن قیم فرماتے ہیں: یہ کھلا وہم ہے کیونکہ یہ بات آپ نے حج سے مدینہ طیبہ واپس آ کر ارشاد فرمائی تھی، اور یہی صحیح ہے۔ جیسا کہ اس سلسلے میں متعدد روایات امام نسائی وغیرہ کے نسخہ میں وارد ہیں جیسا کہ رسالے کے آخر میں آئے گا۔

ان دنوں مدینہ شریف میں چیچک یا گرمی دانوں کے مرض کی وجہ سے بہت سے لوگ حج کیلئے نہیں جا سکے تھے اس لئے ان کی دلجوئی کی خاطر آپ نے فرمایا کہ "رمضان کا عمرہ حج کے برابر ہے" یہ بات ابن حزم نے "المحلی" میں کہی ہے۔ اور ابھی اوپر گزر چکا ہے کہ یہ وہم ہے کیونکہ آپ نے یہ ارشاد حج سے واپسی پر فرمایا تھا کہ رمضان کا عمرہ حج کے برابر ہے۔

شرکائے حجۃ الوداع کی تعداد

چنانچہ لوگوں نے آپ کے ساتھ حج کی تیاری کی، اور مدینے کے گرد و پیش کے لوگوں کو اس کی خبر ہوئی تو وہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کے ارادے سے جمع ہو گئے (رش)، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ازواج مطہرات بھی تھیں۔ جو کجاووں میں سوار تھیں۔ جیسا کہ طبقات میں ہے۔ اور بے شمار مخلوق آپ سے راستے میں آ کر ملتی رہی۔ امام نسائی نے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں میں حج کا اعلان کیا تو کوئی ایسا شخص باقی نہ رہا جو سواری یا پیدل آنے کی قدرت رکھتا ہو اور نہ آیا ہو۔ چنانچہ آپ کے آگے پیچھے دائیں بائیں حد نظر تک آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے۔ شرح سفر السعادۃ میں بھی اسی طرح

وخرج من المدینة نهاراً

اور آپ دن کے وقت

ہے۔ ان کی تعداد میں اختلاف ہے حاشیہ مشکوٰۃ میں لمعات سے نقل کیا ہے کہ بعض روایات میں ہے کہ ان کی تعداد حساب و شمار سے زیادہ تھی۔ اور ان کی تعداد معین نہیں ہو سکی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری غزوہ غزوہ تبوک کے شرکاء کی تعداد ایک لاکھ کو پہنچی تھی۔ حجۃ الوداع کا سفر اس کے بعد ہوا یقیناً اس سفر میں مزید تعداد کا اضافہ ہوا ہوگا۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک لاکھ چودہ ہزار [۱۱۴۰۰۰] افراد تھے۔ دوسری ایک روایت میں ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار [۱۲۴۰۰۰] تھے۔ واللہ اعلم۔ ملا علی قاری نے اس پر اضافہ کیا ہے کہ ایک قول کے مطابق ایک لاکھ تیس ہزار [۱۳۰۰۰۰] تھے۔ اور اوجز میں اسی طرح ہے۔

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آغاز سفر سے پہلے مواقیت کی تعلیم فرمائی۔ چنانچہ ابن ماجہ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو خطبہ دیا اس میں فرمایا کہ "اہل مدینہ ذوالحلیفہ سے احرام باندھیں گے" اور صحیح بخاری میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے مسجد میں کھڑے ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ آپ ہمیں کہاں سے احرام باندھنے کا حکم فرماتے ہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اہل مدینہ ذوالحلیفہ سے احرام باندھیں گے۔

مدینہ سے روانگی کی تاریخ دن اور وقت

اور آپ نے ابو دجانہ کو اور بقول بعض سباع بن عرفطہ کو مدینہ میں اپنا نائب مقرر فرمایا جیسا کہ سیرت ابن ہشام اور البدایہ والنہایہ میں ہے۔ اور خود دن کے وقت الشجرہ کے راستے مدینہ سے روانہ ہوئے جیسا کہ الخمیس اور [illegible] میں ہے۔ امام بخاری نے صحیح بخاری میں باب باندھا ہے "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے راہ شجرہ نکلنے کا بیان" اور اس میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ذکر کی ہے۔" اور "معجم البلدان" میں لکھتے ہیں: "الشجرہ ذوالحلیفہ میں ایک درخت ہے جہاں پر حضرت ابوبکر کی بیوی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے بطن سے محمد بن ابی بکر کی ولادت ہوئی۔ یہ ببول کا درخت تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ وہاں نزول فرماتے اور وہیں سے احرام باندھتے تھے۔ یہ مدینہ سے چھ میل کے فاصلے پر ہے۔" اور "بذل المجہود" میں ہے: "یہ درخت ذوالحلیفہ میں مدینہ سے چھ میل کے فاصلے پر ہے الخ" اور "الخمیس" میں ہے کہ یہ مدینہ سے چھ میل ہے بقول بعض چار میل اور بقول بعض سات میل۔

فصلی الظہر بالمدینۃ اربعًا وخطبھم قبل ذالک خطبۃ۔
ثم ترجل وادھن وارتدی ثم ارتحل، واتاہ آت بوادی العقیق

ترجمہ: پس مدینہ شریف میں ظہر کی چار رکعتیں پڑھیں اور اس سے پہلے ایک خطبہ دیا۔
پھر سر میں کنگھی کی، تیل لگایا، چادریں زیب تن کیں، پھر سفر کا آغاز فرمایا اور وادی عقیق میں آپ کے پاس ایک آنے والا فرشتہ آیا۔

جو حافظ بیہقی نے بسند واقدی نقل کیا ہے کہ ذوالحجہ کا چاند پنجشنبہ کو دکھائی دیا اس سے آٹھویں دن ہوا۔ تفصیل کے لئے عمدۃ البخاری ملاحظہ فرمائیں۔

پس مدینہ شریف میں ظہر کی چار رکعتیں پڑھیں۔ اور اس سے پہلے ایک خطبہ دیا جس میں لوگوں کو احرام کا طریقہ اور اس کے سنن و واجبات کی تعلیم دی۔ ابن قیم نے طبری کے اس قول کو وہم قرار دیا ہے کہ آپ جمعہ کے بعد نکلے کیونکہ بہت سی روایات میں یہ تصریح موجود ہے کہ آپ نے مدینہ شریف میں ظہر کی چار رکعتیں ادا فرمائیں اور ذوالحلیفہ پہنچ کر دو رکعت نماز عصر ادا فرمائی۔ پھر سر میں کنگھی کی، تیل لگایا، چادریں زیب تن کیں، پھر سفر کا آغاز فرمایا۔

اور وادی عقیق میں آپ کے پاس ایک آنے والا فرشتہ آیا۔

وادی عقیق میں فرشتے کی آمد

[عقیق بفتح اول و کسر ثانی۔ دو قاف اور ان کے درمیان یا۔ جیسا کہ معجم البلدان میں ہے] اور اس آنے والے فرشتے نے عرض کیا: کہئے "عمرہ فی حجۃ" اور بخاری کے الفاظ میں "آج رات میرے پاس ایک آنے والا میرے رب کی جانب سے آیا۔ اس نے کہا: کہئے "عمرۃ فی حجۃ" اور البدایہ والنہایہ میں ہے کہ ذوالحلیفہ ہی وادی عقیق ہے۔ صاحب معجم نے "عقیق" پر مبسوط کلام کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ عقیق چار ہیں۔ یہ دراصل وہ قدیم وادیاں ہیں جو سیلابوں کی وجہ سے بن گئی تھیں۔ منجملہ ان کے ایک عقیق وہ ہے جس کے بارے میں یہ حدیث آئی ہے: "بے شک آپ وادی مبارک میں ہیں"۔ اور یہ وہی ہے جو وادی ذوالحلیفہ کے اندر ہے۔ قاضی عیاض فرماتے ہیں: العقیق وہ وادی ہے جہاں اہل مدینہ کے مویشی رہا کرتے تھے۔ اور یہ مدینہ سے دو تین میل پر اور بقول بعض چھ یا سات میل پر ہے۔ یہ عقیق اصغر کہلاتا ہے۔ اور اسی میں بیر رومہ ہے۔ اس سے آگے عقیق اکبر ہے اور اس میں بیر عروہ ہے۔ اور اس کے علاوہ ایک وادی عقیق اور ہے جو ان دونوں سے بڑی ہے۔ اس میں بیر علی ہے۔ پوری تفصیل معجم البلدان

ثم طيبته عائشة بيدها بذريرة وطيب - ولم يغسله بعده

ترجمہ: پھر حضرت عائشہؓ نے اپنے ہاتھ سے آپ کے ذریرہ اور خوشبو لگائی۔ اور بعد میں آپ نے اسے دھویا نہیں۔

میں ہے۔ اور مالکیہ و حنفیہ کے نزدیک بھی جیسا کہ اوجز میں ہے اور اسی میں ہے کہ ابن قدامہ فرماتے ہیں کہ جو شخص احرام کا ارادہ کرے۔ اکثر اہل علم کے نزدیک اس کے لئے مستحب ہے کہ وہ پہلے غسل کرے۔ اہل ظاہر نے اس غسل کو واجب کہا ہے۔ جیسا کہ اوجز میں ہے۔

احرام کیلئے خوشبو لگانا

پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے ہاتھ سے آپ کے سر اور بدن پر ذریرہ اور خوشبو لگائی۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: "ذریرہ بروزن عظیمہ فتل کیا ہوا اور ورس کے ساتھ خوشبو کی ایک خاص قسم ہے۔ جو اہل حجاز وغیرہ کے یہاں معروف ہے۔ امام نوویؒ اور ان کے علاوہ بہت سے حضرات نے فرمایا ہے کہ یہ ایک خوشبودار جڑی بوٹی کا برادہ ہے۔ جو ہندوستان سے آتی ہے۔" صاحب تحیط المعظم نے قصب الذریرہ کے اقسام کو تفصیل سے لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہندی میں اسے چرائتہ کہتے ہیں۔ اور اس کا برادہ خوشبودار ہوتا ہے۔ اور ذریرہ کا لگانا بعینہٖ خوشبو کے لئے مفید ہے۔ اور ایسی خوشبو جس میں مشک ملا ہوا تھا، لگائی۔ حتی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مانگ اور ریش مبارک میں مشک کی چمک نظر آتی تھی۔ اور بعد میں آپ نے اسے دھویا نہیں۔ مسلم شریف کی ایک حدیث سے "غسل سے پہلے خوشبو لگانا" مفہوم ہوتا ہے۔ اس سے قاضی عیاضؒ کو یہ وہم ہوا ہے کہ آپ نے خوشبو لگا کر اسے دھو دیا تھا۔ حالانکہ تکرار اور تعدد سے کوئی چیز مانع نہیں یعنی اس کی یہ توجیہ کی جا سکتی ہے کہ غسل سے پہلے بھی خوشبو لگائی گئی اور بعد میں بھی۔ (دوشی) قاضی عیاضؒ کو تاویل کی ضرورت اس واسطے ہوئی کہ وہ مالکی مذہب کے ہیں۔ اسی بنا پر آبی نے بھی شرح مسلم میں اس کی متعدد توجیہات کی ہیں۔ لیکن احرام کے بعد آپ کی "ریش مبارک میں مشک کے چمکنے کی احادیث" جنہیں صاحب البدایہ والنہایہ نے ذکر کیا ہے۔ ان توجیہات کی نفی کرتی ہیں۔ ہدایہ میں ہے "اور خوشبو لگائے اگر اس کے پاس موجود ہو۔ امام محمدؒ کے نزدیک ایسی خوشبو لگانا مکروہ ہے جو احرام کے بعد بھی باقی رہےؒ۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا بھی یہی قول ہے۔ ہمارے مشہور مذہب کی دلیل حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خوشبو لگایا کرتی تھی۔ الحدیث۔ اور جو خوشبو احرام کے بعد باقی ہے وہ اتصال کی وجہ سے گویا محرم کے تابع ہے بخلاف کپڑے کے کہ وہ محرم سے جدا ہوتا

لہ جیسا کہ انہوں نے [illegible] میں فرمایا ہے۔ شیخ مدظلہ

ثم لبس ازاره ورداءه ثم صلى الظهر ركعتين

ترجمہ: پھر آپ نے احرام کی دو چادریں زیب تن کیں۔ پھر دوگانہ ظہر ادا کیا

ہے " مختصر" - ابن عابدین کہتے ہیں: (محرم) اپنے بدن کو خوشبو لگائے خواہ ایسی خوشبو ہو جو باقی رہے۔ مگر کپڑے کو ایسی خوشبو نہیں لگا سکتا۔ جس کا جسم باقی رہے۔ یہی صحیح تر ہے" قسطلانی "المواہب" میں فرماتے ہیں۔ کہ امام شافعیؒ و احمدؒ، امام ابوحنیفہؒ کے ساتھ ہیں۔ اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ میں اس کو پسند نہیں کرتا" شرح سفر میں بھی یہی لکھا ہے۔

میں کہتا ہوں: "مسئلہ خوشبو میں ائمہ کا مسلک بیان کرنے میں ناقلین کا اختلاف ہے۔ صحیح وہ ہے جو اوجز میں مذاہب اربعہ کی فقہی کتابوں سے نقل کیا ہے اور اس کا خلاصہ حاشیہ لامع میں یہ ہے کہ محرم کیلئے ایسی خوشبو لگانا جس کا جسم احرام کے بعد تک باقی رہے امام مالکؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک مطلقاً ممنوع ہے خواہ بدن پر ہو یا کپڑے پر۔ اور امام شافعیؒ و احمدؒ کے نزدیک مطلقاً مباح ہے خواہ بدن پر ہو یا کپڑے پر۔ اور امام ابوحنیفہؒ و ابو یوسفؒ کے نزدیک بدن پر مباح ہے اور کپڑے پر جائز نہیں" ائمہ کے مذاہب میں یہی تفصیل صحیح ہے۔"

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: "حدیث یعلیٰ سے استدلال کیا گیا ہے کہ احرام کے بعد خوشبو کا باقی رہنا ممنوع ہے۔ جمہور کی طرف سے اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ حدیث یعلیٰ کا واقعہ جعرانہ کا ہے جو بالاتفاق ۸ھ میں ہوا۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ صحیح حدیث کہ انہوں نے اپنے ہاتھ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احرام کے وقت خوشبو لگائی تھی۔ بالاتفاق ۱۰ھ کا واقعہ ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے آخری عمل ہی کو لیا جاتا ہے۔"

"پھر آپ نے احرام کی دو چادریں زیب تن کیں" وفاء الوفا میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ سے غسل فرما کر اور چادریں پہن کر نکلے تھے۔ اور صحیح بخاری کے لفظ بروایت ابن عباسؓ یہ ہیں: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تیل لگا کر کنگھی کر کے اور دو چادریں پہن کر مدینہ سے چلے" پھر دوگانہ ظہر ادا کیا۔ جیسا کہ مسلم و نسائی کی روایت میں تصریح ہے اور بخاری شریف میں ہے "کہ آپ نے صبح کی نماز پڑھی پھر سوار ہوئے" بخاری و مسلم کی روایت میں تطبیق اس طرح ہو سکتی ہے کہ بخاری کی روایت میں "ثم" کا لفظ تراخی کیلئے ہے۔

دوگانۂ احرام کا حکم

اس میں اختلاف ہے کہ یہ دو رکعتیں فرض نماز کی تھیں یا دوگانہ احرام کی۔ اس کی بحث اوجز[1] میں صلی بذی الحلیفۃ رکعتین کے ذیل میں مذکور ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ

---

[1] اوجز از حضرت شیخ زکریا مدظلہ کی بہت عمدہ تالیف ہے، جو شرح مؤطا مطبوعہ ہے۔ مترجم

ثم اهل بالحج والعمرة۔

ترجمہ: پھر حج و عمرہ دونوں کا احرام باندھ کر تلبیہ پڑھا۔

یہ دو رکعتیں دوگانۂ احرام تھیں۔ ان میں سورۃ کافرون اور سورۃ اخلاص پڑھی جاتی ہے۔ جیسا کہ مرقات میں ہے۔ نووی فرماتے ہیں: اس حدیث سے احرام کے وقت دو رکعتیں پڑھنے کا استحباب معلوم ہوا۔ یہ دو رکعتیں احرام سے قبل پڑھی جاتی ہیں۔ اور یہ ہمارے اور تمام علماء کے مذہب میں نفل ہیں۔ البتہ قاضی وغیرہ نے حسن بصری سے ان کا یہ مسلک نقل کیا ہے کہ ان دونوں کا فرض نماز کے بعد ہونا مستحب ہے۔ کیونکہ مروی ہے کہ یہ دو رکعتیں نماز ظہر کی تھیں۔ صحیح وہی ہے جو جمہور کا قول ہے اور یہی حدیث کا مفہوم بھی ہے۔ ابن قیم فرماتے ہیں: یہ کہیں منقول نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرض ظہر کے علاوہ دوگانۂ احرام بھی ادا فرمایا تھا۔ پوری تفصیل اوجز میں ہے۔ ہدایہ میں ہے کہ اور دو رکعتیں پڑھے کیونکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے اپنی طویل حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دو رکعتیں پڑھنا روایت کیا ہے۔ لیکن مجھے نفل نماز کا ذکر اس میں کہیں نہیں ملا۔ اوجز میں بہت ہی بسط و تفصیل سے اس مسئلہ پر بحث کی ہے۔ ابن حزم نے کہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ظہر سے قبل پہلے احرام باندھا تھا مگر ابن قیم نے اس کی تردید کی ہے جیسا کہ آگے آتا ہے۔

تلبیہ کے حکم میں اختلاف

پھر جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ذوالحلیفہ کے یک روزہ قیام میں پانچ نمازیں پڑھ چکے تو حج و عمرہ دونوں کا احرام باندھ کر تلبیہ پڑھا۔ اس میں اختلاف ہے کہ تلبیہ واجب ہے یا سنت یا رکن؟ اس کی تفصیل اوجز میں ہے۔ جس کا خلاصہ حاشیہ لامع میں یہ ہے کہ: ——— حافظ کے قول کے مطابق تلبیہ میں دس مذہب ہیں۔ ان میں سے معروف مذہب چار ہیں۔ اول یہ کہ تلبیہ سنت ہے اس کے ترک سے کچھ واجب نہیں ہوتا۔ یہ امام شافعیؒ و احمدؒ کا قول ہے۔ دوم یہ کہ واجب ہے اور اس کے ترک پر دم واجب ہوگا۔ یہ مالکیہ کے اصحاب الفروع کا مختار قول ہے اور بعض شافعیہ سے بھی منقول ہے۔ سوم یہ کہ واجب ہے مگر افعال حج میں سے کوئی فعل مثلاً اونٹ کی طرف توجہ ہو جانا اس کے قائم مقام ہو جاتا ہے۔ مالکیہ میں سے ابن شاس نے اپنا کلام اس سے شروع کیا ہے۔ اور حنفیہ میں سے صاحب ہدایہ نے اس کی مثل نقل کرکے اس پر اتنا اضافہ کیا ہے کہ کوئی دوسرا ذکر یا سائق ہدی بھی تلبیہ کے قائم مقام ہو سکتا ہے۔ چہارم یہ کہ رکن ہے اور یہ اہل ظاہر وغیرہ کا مذہب ہے۔

ط: نووی کی اصل عبارت اسی طرح ہے۔ بظاہر کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے [illegible] احرام کا فرض نماز کے بعد ہونا [illegible]

فی مصلّاہ، وقلّد قبل الاحرام بدنہ

ترجمہ: اپنی نماز کی جگہ میں۔ اور احرام سے پہلے اپنی ہدی کے اونٹوں کو قلادہ پہنایا۔

میقات سے پہلے احرام باندھنے کا حکم

یہاں ایک اور طویل فقہی بحث ہے وہ یہ کہ کیا احرام مواقیت ہی سے باندھنا واجب ہے اور میقات سے اس کی تقدیم جائز نہیں؟

جیسا کہ اہل ظاہر کا مذہب ہے۔ یا تقدیم بھی جائز ہے؟ جیسا کہ ائمہ اربعہ کا مذہب ہے؟ پھر ائمہ اربعہ کا اس امر میں اختلاف ہے کہ میقات سے پہلے احرام باندھنا افضل ہے یا میقات سے؟ امام مالکؒ و احمدؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں مواقیت ہی سے احرام باندھنا افضل ہے۔ اور امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل امت کی آسانی کیلئے تھا۔ مگر ان علماء حدیث قولیہ کی بنا پر جو ابوداؤد میں ذکر کی ہے، تقدیم مستحب ہے۔ امام ابوداؤد نے حضرت ابوامامہؓ سے نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ: جو شخص اپنے گھر سے پاک ہو کر (وضو یا غسل کر کے) فرض نماز کے لئے نکلا اس کا ثواب ایسے ہے جیسے کوئی گھر سے احرام باندھ کر حج کیلئے جائے الخ۔ اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ احرام کی تقدیم افضل ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس جگہ تلبیہ شروع کیا

اپنی نماز گاہ ہی میں آپ نے تلبیہ پڑھنا شروع کیا! اس سلسلہ میں روایات مختلف ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس جگہ سے احرام باندھا؟ (تلبیہ شروع کیا) اس بارے میں تین باتیں وارد ہیں: نماز کی جگہ سے، جب سوار ہوئے، جب بیداء کی بلندی پر چڑھے۔ ان روایات کے درمیان تطبیق ابن عباسؓ کی روایت میں آگے آرہی ہے۔ امام احمدؒ کے نزدیک تینوں کی گنجائش ہے۔ اور بعض کے نزدیک پہلی صورت راجح ہے۔ ابن قیمؒ کا میلان بھی اسی جانب ہے۔ شافعیہ و مالکیہ کے نزدیک دوسری صورت راجح ہے۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: "تینوں کے جواز پر ہر جگہ کے علماء متفق ہیں۔ اختلاف صرف افضلیت میں ہے"۔ صاحب البدایہ والنہایہ نے اس سلسلہ کی روایات بڑی تفصیل سے ذکر کی ہیں۔

ہدی کو قلادہ پہنانے کا حکم

اور احرام سے پہلے اپنی ہدی کے اونٹوں کو (اور گائیوں کو) قلادہ پہنایا! جیسا کہ حضرت جعفر بن محمد الصادقؒ کی حدیث ہے۔ جو صحیح مسلم، ابوداؤد وغیرہ میں ہے۔ اوجز میں ہے کہ قلادہ پہنانا بالاجماع سنت ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ ایک جوتے کا ہو یا دو کا؟ ابن رشد کہتے ہیں: ہدی اونٹ یا گائے کی ہو تو اس میں اختلاف نہیں کہ ان کو قلادہ پہنایا جائے۔ بکری کو قلادہ پہنانے میں اختلاف ہے۔ امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ نہ پہنایا جائے۔ اور امام

واشعرها

ترجمہ: اور ان کا اشعار کیا۔

فائدہ: اشعار اور ادواۃ ظاہری کہتے ہیں کہ پہنایا جائے۔ "واشعرها" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدی کے اونٹوں کی نگہداشت پر حضرت ناجیہ اسلمی مقرر تھے، جیسا کہ طبقات میں ہے، اور طبری نے واقدی کی مغازی سے یہی نقل کیا ہے ـــ اور ذکر کیا گیا ہے کہ عمرۃ حدیبیہ اور عمرۃ القضاء میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہدایا پر حضرت ناجیہ رضی اللہ عنہ ہی مقرر تھے، جیسا کہ الخمیس میں ہے۔

ہدی کے اشعار کا حکم

: دائیں یا بائیں جانب میں ان کا اشعار کیا۔ اس سلسلہ میں روایات و مذاہب مختلف ہیں کہ اشعار دائیں جانب کیا گیا یا بائیں جانب، جیسا کہ آگے مفصل آتا ہے۔ فائدہ: مسئلہ اشعار مشہور اختلافی مسئلہ ہے، جو اوجز میں بہت تفصیل سے مذکور ہے کہ اشعار میں تین بحثیں ہیں۔ اس کی تشریح، اس کا حکم، کن جانوروں کا اشعار کیا جائے؟ ..... پہلی بحث ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ دوسری بحث اس کے حکم میں اختلاف ہے، جمہور علماء بشمول ائمہ ثلاثہ اس کو سنت کہتے ہیں، امام ابو یوسف اور امام محمد فرماتے ہیں یہ بہتر ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ ان کے نزدیک سنت ہے، جیسا کہ بدائع میں ہے۔ اور ہدایہ میں ہے کہ اشعار امام ابوحنیفہ کے نزدیک مکروہ ـــ صاحبین کے نزدیک افضل اور امام شافعی کے نزدیک سنت ہے۔ امام شافعی کی دلیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین سے مروی ہے۔ صاحبین کی دلیل یہ ہے کہ قلادہ پہنانے سے مقصود یہ ہے کہ اگر ہدی کا جانور کسی پانی پر جائے تو اس سے تعرض نہ کیا جائے اور اگر گم ہو جائے تو واپس کر دیا جائے۔ اور یہ مقصود اشعار سے بدرجہ اتم حاصل ہوتا ہے کیونکہ یہ قلادہ کی بہ نسبت زیادہ لازم ہے۔ اس اعتبار سے یہ سنت ہے مگر اس کے معارض اشعار میں مثلہ ہونا ہے اور مثلہ کی ممانعت بھی ہے اس بنا پر ہم اسے حسن کہتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ کی دلیل یہ ہے کہ یہ مثلہ ہے جو ممنوع ہے اور جب جواز و عدم جواز میں تعارض ہو جائے تو عدم جواز کو ترجیح دی جاتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اشعار کرنا ہدی کے جانوروں کی حفاظت کی غرض سے تھا کیونکہ مشرکین اس کے بغیر تعرض سے باز نہیں آتے تھے۔ اور کہا گیا ہے کہ امام صاحب نے اشعار کو مطلقاً مکروہ نہیں کہا، بلکہ اپنے زمانے کے اشعار کو مکروہ کہا ہے کیونکہ لوگ اس میں حد سے تجاوز کرنے جاتے تھے۔ اور پوری تفصیل اوجز میں ہے۔ اور کوکب میں مسئلہ اشعار پر مختصر مگر بہت عمدہ کلام کیا ہے۔

وسلت عنہا الدم وساق الہدی معہ

ترجمہ: اور ان سے خون صاف کیا، اور ہدی کے جانور اپنے ساتھ لئے۔

محل اشعار میں اختلاف

پھر اشعار دائیں جانب ہو یا بائیں جانب؟ اس میں روایات اور مذاہب میں اختلاف ہے۔ جن کی تفصیل اوجز میں ہے۔ ہدایہ میں بائیں جانب کو ترجیح دی گئی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ بائیں جانب تیر مارنا مقصود تھا اور دائیں جانب اتفاقی تھا۔ شیخ ابن ہمامؒ نے نیز ہمارے شیخ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری ثم مدنی نے بذل میں دونوں قسم کی روایات ذکر کی ہیں۔ اس کی پوری تفصیل الاوجز میں ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس میں امام مالکؒ سے چار روایتیں منقول ہیں ان میں سے راجح بائیں جانب کی روایت ہے۔ اور ابن رسلان کے علاوہ عام ناقلین مذاہب نے صرف اسی کے ذکر کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ امام احمد سے بھی ایک روایت یہی ہے جیسا کہ المغنی میں ہے۔ ان کی دوسری مشہور روایت جو امام شافعیؒ کا قول اور امام ابو یوسفؒ سے ایک روایت ہے۔ جیسا کہ شرح لباب میں ہے۔ یہ ہے کہ دائیں جانب اشعار کیا جائے۔ باجی کہتے ہیں کہ بائیں جانب اشعار کرنا آپ کی سنت ہے۔ صاحبین بھی اسی کے قائل ہیں جیسا کہ عینی وغیرہ میں ہے۔ اور امام محمدؒ نے موطا میں اسی کو لیا ہے۔

اور ان سے خون صاف کیا۔ جیسا کہ البذل میں ہے۔ اور صحیح مسلم اور ابو داؤد وغیرہ کی متعدد روایات میں یہ مضمون وارد ہوا ہے۔ ترمذی کے الفاظ یہ ہیں "واماط عنہ الدم"۔ اور اس سے خون صاف کیا، کوکب میں ہے کہ اس سے مراد یہ نہیں کہ اس جگہ سے خون بالکل صاف کر دیا تھا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ بہتے خون سے کوہان کی اس جانب کو رنگ دیا۔ اور اگر ہٹا دینے کے لفظ کے متبادر معنی لئے جائیں تو اشعار کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے کیونکہ اشعار کی حقیقی غرض اسی میں مضمون ہے۔ دیکھنے والوں کو علم نہیں ہو سکتا بالخصوص جب کہ وہاں خون کا بھی کوئی اثر نہ ہو۔

میقات سے ہدی کے جانور ساتھ لے جانا

اور ہدی کے جانور اپنے ساتھ لئے۔ ابن قیمؒ نے ابن حزم کے اس قول کو وہم قرار دیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدی کے جانور اپنے ساتھ لئے۔ اور یہ ہدی نفل تھی۔ یہ وہم صرف دوسرے جز میں ہے یعنی ان کا ہدی کا نفل ہونا۔ رہا پہلا جز یعنی ہدی کے جانوروں کو ساتھ لے جانا اس میں وہم نہیں کیونکہ یہ ایک معروف

یہ بات مشہور ہے کہ یہ اختلاف اس اختلاف پر مبنی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احرام کی کیا صورت
تھی! اور بعض نے اس کے برعکس یہ کہا ہے کہ ائمہ کے نزدیک احرام کی جو افضل صورت متحقق ہوئی ہے
اس کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احرام کو ترجیح دی جاتی ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ سب کے
نزدیک معلوم نہیں چنانچہ نوویؒ لکھتے ہیں: "باقی رہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حج! تو اس میں اختلاف ہے کہ
آپ مفرد تھے یا متمتع یا قارن؟ علماء کے یہ تین قول ہیں جو ان کے سابقہ مذاہب کے مطابق ہیں، ہر فریق نے
اپنے مذہب کو ترجیح دیتے ہوئے دعویٰ کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حج ایسا ہی تھا۔ مگر صحیح یہ ہے
کہ آپ اولاً مفرد تھے، پھر عمرہ کا احرام باندھ کر قارن ہو گئے۔" اھ۔ آپ دیکھتے ہیں کہ نوویؒ نے مذاہب کو
بیان کرتے ہوئے افضلیت افراد کو صحیح کہا ہے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کے بیان میں وہ لکھتے ہیں
کہ صحیح یہ ہے کہ آپ بالآخر قارن ہو گئے تھے۔ فقہ حنبلی کی کتاب "الروض المربع" میں ہے: "امام احمدؒ فرماتے ہیں
کہ مجھے اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قارن تھے۔ لیکن میں تمتع کو پسند کرتا ہوں۔"
بہت سے اہل علم نے امام احمد کا یہ قول نقل کیا ہے جس کی تفصیل اوجز میں ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ
اپنے فتاویٰ میں فرماتے ہیں: "امام احمد سے جو چیز منصوص ہے وہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قارن
تھے، حتیٰ کہ انہوں نے فرمایا کہ مجھے ذرا بھی شک نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قارن تھے۔ اور یہی قول
ائمہ حدیث مثلاً اسحاق بن راہویہ وغیرہ کا ہے۔ اور یہی صحیح ہے جس میں کسی ریب و تردد کی گنجائش نہیں۔ ابن
حزم نے اپنی تالیفات میں اس کی تقریر کی ہے۔" اھ

یہاں یہ جاننا بھی مناسب ہوگا کہ ائمہ اربعہ شکر اللہ سعیہم کا اس میں اختلاف ہے کہ اقسام حج
میں سے افضل کون سی قسم ہے؟ حج کی تین قسمیں مشہور و معروف ہیں یعنی افراد، قران، تمتع۔ ائمہ اربعہ اس
پر متفق ہیں کہ یہ تینوں صورتیں جائز ہیں۔ اور ایک چوتھی قسم ہے یعنی حج فسخ کر کے عمرہ کا احرام باندھ لینا۔
چنانچہ امام بخاریؒ نے باب باندھا ہے "تمتع، قران اور افراد کا بیان اور جس کے پاس ہدی نہ ہو اس کے لئے فسخ
کا حکم" تو یہ آخری صورت حنابلہ کے نزدیک راجح ہے، جیسا کہ حاشیۂ لامع میں "باب من اهل فی زمن
النبی صلی اللہ علیہ وسلم" کے ذیل میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ لیکن اوجز میں مذاہب کے بیان میں
لکھا ہے کہ امام احمدؒ سے دو روایتیں ہیں ایک یہ کہ تمتع افضل ہے پھر افراد، پھر قران۔ اور دوسری یہ کہ اگر
ساتھ ہدی لایا ہو تو قران افضل ہے ورنہ تمتع۔ اور مالکیہ کے نزدیک جیسا کہ ان کی فقہی کتابوں میں ہے۔

افراد افضل ہے پھر قران پھر تمتع۔ اور شافعیہ کی اس میں بھی روایتیں ہیں جو نووی نے ذکر کی ہیں اور کہا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ افراد افضل ہے پھر تمتع پھر قران۔ اور ان کی عام کتب فقہ میں بھی یہی ہے لیکن افراد کی فضیلت کے لئے ان کے ہاں یہ شرط ہے کہ اسی سال عمرہ بھی کرے۔ ورنہ تمتع اور قران افضل ہونگے۔ جیسا کہ شارح اقناع اور شارح منہاج نے تصریح کی ہے۔ اور حنفیہ کے نزدیک مختار یہ ہے کہ قران افضل ہے پھر تمتع پھر افراد۔ تفصیل اوجز میں ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کی نوعیت میں اختلاف

شیخ ابن قیم لکھتے ہیں: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کی نوعیت کے بارے میں پانچ جماعتوں کو وہم ہوا ہے۔ پہلا گروہ وہ ہے جو کہتا ہے کہ آپ نے بغیر عمرہ کے صرف حج مفرد کیا تھا۔ صاحب البدایہ والنہایہ نے اس مضمون کی روایات کو ذکر کر کے ان کے متعلقات میں مفصل کلام کیا ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو کہتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمتع کیا تھا یعنی عمرہ کے احرام سے فارغ ہو کر آپ نے حج کا احرام باندھا تھا۔ اس کو بھی صاحب البدایہ والنہایہ نے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ قاضی ابو یعلیٰ وغیرہ اسی کے قائل ہیں۔ اور زرقانی شرح مواہب میں بھی یہی ہے۔ تیسرا گروہ وہ جو کہتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم متمتع تھے۔ قارن نہیں تھے۔ مگر آپ نے احرام نہیں کھولا تھا کیونکہ آپ اپنے ساتھ ہدی کے جانور لے کر گئے تھے۔ صاحب مغنی وغیرہ کا بھی قول ہے۔ جیسا کہ البدائع میں ہے۔ زرقانی شرح مواہب میں حافظ کی تقلید میں کہتے ہیں کہ امام طحاوی اور ابن حبان وغیرہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ چوتھا گروہ جو اس کا قائل ہے کہ آپ نے قران کیا تھا۔ اور دو طواف اور دو سعیں کیں۔ حنفیہ اسی کے قائل ہیں جیسا کہ آگے تفصیل سے آ رہا ہے۔ اور پانچواں گروہ جو کہتا ہے کہ آپ نے حج مفرد کیا تھا اور بعد میں تنعیم سے عمرہ کیا تھا۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے اپنے فتاویٰ میں یہ قول مالکیہ و شافعیہ کی ایک جماعت سے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ قول غلط ہے۔ قسطلانی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حج و عمرہ کا قران کیا تھا۔ اور دونوں احرام اکٹھے کھولے تھے۔ اور دونوں کے لئے ایک طواف اور ایک سعی کی تھی۔ اور یہ چھٹا قول ہی شیخ ابن قیم کے نزدیک راجح ہے۔ اسی وجہ سے اسے اوہام میں ذکر نہیں کیا گیا۔ اور اوپر گذر چکا ہے کہ چوتھا قول حنفیہ کا ہے۔ ان کے قول اور شیخ ابن قیم کے نزدیک جو قول راجح ہے اس کے درمیان صرف اتنا فرق ہے کہ حنفیہ طواف و سعی کے تکرار کے قائل ہیں اور مصنف (ابن قیم) قائل نہیں۔

حنفیہ کے نزدیک قارن پر دو طواف اور دو سعی لازم ہیں

ان اقسام کو تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے شیخ ابن ہمام نے فتح القدیر میں حنفیہ کے قول کو ترجیح دی ہے نیز اوجز میں حضرت عائشہؓ کی حدیث والذین جمعوا الحج والعمرۃ فانما طافوا طوافا واحداً اور جن لوگوں نے حج وعمرہ کو جمع کیا انہوں نے بس ایک ہی طواف کیا کے ذیل میں اس مسئلہ پر مفصل بحث کی ہے۔ اور اس حدیث کا نیز اس مضمون کی دیگر احادیث کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ احادیث کسی کے نزدیک بھی اپنے ظاہر پر محمول نہیں ہیں۔ کیونکہ تین طواف یعنی طواف قدوم، طواف زیارت اور طواف وداع تمام علماء کے نزدیک ثابت ہیں۔ اس لئے بس ایک ہی طواف کیا کی تاویل سب کے قول پر ضروری ہے۔ اس کی متعدد تاویلات اوجز میں تفصیل سے ذکر کی ہیں سب سے اچھی توجیہ میرے نزدیک یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حج اور عمرہ کے دونوں احراموں سے فارغ ہونے کیلئے ایک ہی طواف کیا۔ بخلاف اس کے جو کہا گیا ہے کہ دونوں احرام کھولنے کے لئے دو طواف اور دو سعیں کرے۔ اس کے بعد اوجز میں حنفیہ کے اس قول کے دلائل بیان کئے ہیں کہ قارن کے ذمہ دو طواف اور دو سعیں ہیں۔ چنانچہ عینی کا قول نقل کیا ہے کہ مجاہد، قاضی شریح، شعبی، نخعی، اوزاعی، ثوری، ابن شبرمہ، ابن ابی لیلیٰ، ابوحنیفہ، ان کے اصحاب، اور ایک جماعت جن کے نام اوجز میں مذکور ہیں۔ اس کے قائل ہیں کہ قارن کیلئے دو طواف اور دو سعیں ضروری ہیں اور یہی قول حضرات عمرؓ، علیؓ، ان کے صاحبزادے حسن، حسین اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم اجمعین سے منقول ہے، یہی امام احمدؒ سے بھی ایک روایت ہے۔ مجاہد نے حضرت ابن عمر سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے حج وعمرہ کو جمع کیا اور ان کے لئے دو طواف اور دو سعیں کیں اور فرمایا میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے جس طرح میں نے کیا۔ اور حضرت علیؓ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ اوجز میں اس سلسلہ کی مرفوع روایات کو ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ امام طحاوی وغیرہ نے حضرت علی اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً اس کو روایت کیا ہے اور مجموعی طور پر ان کی سندیں لا باس بہا ہیں۔ (یعنی لائق قبول ہیں)

اور ہدایہ میں ہے کہ امام شافعیؒ نے فرمایا قارن ایک طواف اور ایک سعی کرے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قیامت تک کیلئے عمرہ حج میں داخل ہوگیا، اور اس وجہ سے بھی کہ قران کا مبنیٰ تداخل پر ہے۔ چنانچہ اس میں حج اور عمرہ دونوں کے لئے ایک ہی تلبیہ، ایک ہی سفر اور ایک ہی حلق

پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ پس اسی طرح ارکان میں بھی تداخل ہوگا۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ جب صُبَیّ بن معبد نے دو طواف اور دو سعییں کیں تو حضرت عمرؓ نے فرمایا: تجھے تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی طرف ہدایت کی گئی۔ نیز اس لئے کہ قران ایک عبادت کو دوسری عبادت سے ملا کر ادا کرنے کا نام ہے اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب کہ ہر ایک عبادت کو کامل طور پر ادا کیا جائے۔ نیز اس لئے کہ عبادت مقصودہ میں تداخل نہیں ہوا کرتا۔ اور سفر بیت اللہ تک پہنچنے کے لئے، اور تلبیہ احرام باندھنے کے لئے اور حلق احرام کھولنے کے لئے ہے لہٰذا یہ چیزیں خود مقصود نہیں۔ بخلاف ارکان کے کہ وہ خود مقصود ہیں۔ دیکھئے نفل کے دوگانے متداخل نہیں ہوتے مگر ایک تحریمہ سے ادا ہو جاتے ہیں۔ اور جو حدیث امام شافعی نے استدلال میں پیش کی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ عمرہ کا وقت حج کے وقت میں داخل ہوگیا۔ علامہ ابن کثیر البدایہ والنہایہ میں لکھتے ہیں کہ قارنین کی ایک جماعت مثلاً ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب اور امام ثوریؒ کا مذہب یہ ہے کہ قارن دو طواف اور دو سعییں کرے گا۔ حضرت علی، ابن مسعود، مجاہد، و شعبی سے بھی یہی مروی ہے۔ یہ حضرات اپنے مسلک پر حضرت جابر کی طویل حدیث سے استدلال کر سکتے ہیں کیونکہ اس میں ہے کہ آپ نے صفا و مروہ کی سعی پا پیادہ کی تھی اور اسی حدیث میں بروایت ابو الزبیر یہ آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صفا و مروہ کی سعی سواری پر کی تھی۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ سعی دو مرتبہ ہوئی۔ ایک مرتبہ پا پیادہ اور ایک مرتبہ سواری پر۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احرام میں چھ قول

(زاد) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احرام کی کیفیت میں پانچ جماعتوں کو وہم ہوا ہے۔ [یہ پانچوں اقوال مع ذکر قائلین کے آگے درج ہیں۔ اور فرق یہ ہے کہ [illegible] کا اختلاف [illegible] فرق ہے کہ پہلا اختلاف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال حج کی کیفیت میں تھا اور یہ صرف احرام کی کیفیت سے متعلق ہے۔] پہلی وہ جماعت جو اس کی قائل ہے کہ آپ نے صرف عمرہ کا تلبیہ پڑھا اور اسی پر قائم رہے۔ دوسری وہ جماعت جو کہتی ہے کہ آپ نے صرف حج کا تلبیہ کہا اور پھر اسی پر مستمر رہے۔ امام مالک اسی کے قائل ہیں جیسا کہ البدایہ والنہایہ میں ہے۔ تیسری وہ جماعت جو کہتی ہے کہ آپ نے پہلے حج کا تلبیہ کہا پھر اس پر عمرہ کو داخل کر لیا۔ اس جماعت کا خیال ہے کہ یہ (عمل یعنی حج پر عمرہ کا احرام باندھنا) آنحضرت کی خصوصیت تھی کسی اور کے لئے جائز نہیں۔ یہ قول توربشتی نے اختیار کیا ہے۔ اور صاحب بحر نے بھی اس کو نقل کیا ہے۔ اور صاحب در مختار نے اس کو

ترجیح دی ہے۔ ابن منذر اور محب طبری نے بھی اسی کو راجح کہا ہے۔ علامہ محقق شافعیہ اور مالکیہ نے اسی
پر جزم کیا ہے۔ اور اسی کو قاضی عیاض نے اختیار کیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ بہت سی روایات میں وارد
ہے کہ آپ مفرد تھے اور تمتع کی روایات سے مراد یہ ہے کہ آپ نے اس کا حکم فرمایا تھا۔ اور روایات قران
میں آپ کی آخری حالت کی خبر دی گئی ہے کیونکہ آپ نے حج کے اوپر عمرہ کا احرام بھی باندھ لیا تھا۔ حافظ
فرماتے ہیں کہ یہی تطبیق قابل اعتماد ہے۔ پوری تفصیل اوجز میں ہے اور اسی میں یہ بھی ذکر ہے کہ ان حضرات
پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ شافعیہ کے نزدیک حج پر عمرہ کا داخل کرنا ممنوع ہے جیسا کہ عینی کے حوالے سے
آگے آتا ہے۔

اور چوتھی جماعت جس نے یہ کہا کہ آپ نے اولاً عمرہ کا احرام باندھا تھا۔ پھر اس پر حج کا احرام بھی باندھ
لیا تھا اور قارن ہو گئے۔ امام طحاوی شرح الآثار میں اسی کی طرف مائل ہیں۔ جیسا کہ حافظ نے فتح الباری
میں ان سے نقل کیا ہے۔ اوجز میں ہے کہ صاحب تنقیح فرماتے ہیں کہ یہ قول بھی ضعیف ہے۔ اگرچہ
دوسرے اقوال کی بنسبت اقرب ہے۔ اور اوجز میں یہ قول خطابی اور ابن حبان سے نقل کیا ہے۔

۵ اور پانچویں جماعت جس نے یہ کہا ہے کہ آپ نے پہلے بلا تعیین مطلق احرام باندھا تھا۔ پھر احرام کے
بعد اس کی تعیین فرمائی۔ امام شافعیؒ نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ جیسا کہ حافظ نے فتح الباری میں لکھا ہے۔
اور علامہ قسطلانی مواہب میں فرماتے ہیں: آپ کے احرام میں علماء کے چھ قول ہیں۔ مذکورہ پانچ اقوال
کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: "چھٹا قول یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حج و عمرہ دونوں کا احرام
بیک وقت باندھا۔" ابن قیمؒ نے اس کو اوہام میں ذکر نہیں کیا۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہی قول مختار ہے۔
الہدیٰ میں اس کو ثابت کیا ہے اور اس کے مخالف اقوال کا جواب دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ صحیح بات
یہ ہے کہ آپ نے جب احرام باندھا تو حج و عمرہ دونوں کا احرام باندھا۔ اور جب احرام کھولا تو دونوں کا ایک
وقت کھولا۔ چنانچہ اس کی دلیل وہ مشہور روایات ہیں جو اس کی صحت میں متواتر ہیں۔ اور اس تواتر کو علماء حدیث
جانتے ہیں۔ ابن حزم بھی اسی کی طرف مائل ہیں۔ اور باقی احادیث میں تاویل کرتے ہیں۔ جیسا کہ اوجز میں
ہے۔ (ش) حافظ عینیؒ فرماتے ہیں کہ اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ عمرہ پر حج کا داخل کرنا جائز ہے اور اس
کے عکس میں اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہ اور قول قدیم میں امام شافعیؒ نے اس کو جائز کہا ہے۔ اور دیگر
علماء نے اس کو ممنوع کہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص تھا۔ مگر

خصوصیت کا دعویٰ محتاج دلیل ہے۔"

حج پر عمرہ کا احرام باندھنے کا حکم

حج پر عمرہ کا اور عمرہ پر حج کا احرام باندھنا۔ دو حجوں کا احرام باندھنا یا دو عمروں کا احرام باندھنا ان چار مسائل میں ائمہ کے اختلاف پر ابن حزم نے مفصل کلام کیا ہے۔ تفصیل کا شوق ہو تو وہاں دیکھو۔ بحث کے آخر میں لکھا ہے: "محققین شافعیہ و مالکیہ مثلاً نوویؒ، قاضی عیاضؒ اور ان کے متبعین پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ حج پر عمرہ کا داخل کرنا جب ان کے نزدیک جائز نہیں تو انہوں نے اس قول کو کیسے راجح قرار دے دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاً حج کا احرام باندھا اور اس کے بعد اس پر عمرہ داخل کر لیا الخ۔"

افراد و تمتع کی روایات کا جواب

شیخ ابن قیمؒ نے روایاتِ افراد کا یہ جواب دیا ہے کہ جن حضرات سے افراد کی روایات مروی ہیں ان سے قران کی روایات بھی مروی ہیں۔ نیز روایاتِ افراد تین معانی کے لئے محتمل ہیں۔ ایک یہ کہ آپ نے حج مفرد کا احرام باندھا۔ دوم یہ کہ صرف حج کے افعال ادا کئے۔ سوم یہ کہ آپ نے صرف ایک حج کیا، اس کے علاوہ کوئی حج نہیں کیا۔ اور عمرے چار کئے، عمرہ حدیبیہ ۶ھ میں، عمرۃ القضا ۷ھ میں، عمرہ جعرانہ ۸ھ میں اور حج کے ساتھ ۱۰ھ میں۔ اس کے بعد قران کی روایات کو دس وجوہ سے بلکہ چند در چند وجوہ سے ترجیح دی ہے۔ میرے نزدیک سب سے عمدہ وجہ یہ ہے کہ افراد کی روایات میں دوسرے معانی کا بھی احتمال ہے۔ مگر قران کی روایات ایسی صریح ہیں کہ ان میں قران کے سوا کوئی دوسری تاویل نہیں ہو سکتی۔ اور اس سے بھی عمدہ وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے قران ہی کا حکم ہوا تھا۔ اس لئے آپ اس سے عدول نہیں کر سکتے تھے۔ علامہ قسطلانیؒ نے مواہب میں تمتع کی روایات کا یہ جواب دیا ہے کہ "اس سے مراد تمتع لغوی ہے یعنی ایام حج میں عمرہ کا نفع حاصل کرنا (اور یہ قران پر بھی صادق آتا ہے) یا آپ کی طرف نسبت مجازی ہے جیسا کہ رجم کی نسبت آپ کی طرف کی گئی۔" الخ مختصراً روایات تمتع کے یہی دو جواب صاحب سفر السعادۃ نے دیئے ہیں۔ اور پہلا جواب نوویؒ نے قاضی عیاضؒ سے نقل کیا ہے۔

(قال) ولبّد رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم رأسه

ترجمہ: (ق) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سر مبارک کی تلبید کی (یعنی بالوں کو چپکا لیا)

(ق) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سر مبارک کی تلبید کی

تلبید کا حکم اور اس کا وقت

(یعنی بالوں کو چپکا لیا) "الہدایہ" اور "مراقی الفلاح" میں بھی اسی طرح ہے۔
ان دونوں کتابوں کے سیاق سے ظاہر ہوتا ہے کہ تلبید احرام کے بعد ہوئی۔ میرے نزدیک ظاہر یہ ہے
کہ تلبید احرام سے پہلے تیل اور خوشبو استعمال کرتے وقت ہوئی۔ حافظ ابن حجر اور حافظ عینی کے اقوال سے بھی یہی معلوم ہوتا
ہے۔ چنانچہ یہ دونوں حضرات امام بخاری کے قول "باب من اہل ملبّدًا" کے تحت لکھتے ہیں "یعنی جس
نے تلبید کی حالت میں احرام باندھا" اور امام بخاری کا میلان بھی اسی جانب ہے۔ چنانچہ انہوں نے
اس باب سے پہلے "باب الطیب عند الاحرام" ذکر کیا ہے۔ اور اس کے بعد "باب الاہلال عند مسجد ذی الحلیفہ"
ذکر کیا ہے۔ اور اس سے زیادہ واضح شیخ نووی کا قول ہے۔ چنانچہ وہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث:
"تلبید کی حالت میں احرام باندھتے تھے" کے ذیل میں لکھتے ہیں: "اس سے معلوم ہوا کہ احرام سے پہلے سر کی تلبید
مستحب ہے اور امام شافعی اور ہمارے اصحاب نے اس کی تصریح کی ہے۔" "بذل المجہود" میں "مجمع البحار"
سے نقل کیا ہے کہ تلبید کے معنی یہ ہیں کہ احرام کے وقت سر کے بالوں میں گوند جیسی کوئی چیز لگائی جائے تاکہ
بال پراگندہ نہ ہوں اور ان میں جوئیں نہ پڑیں۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ وہ بال احرام کی حالت میں رہنے
کے باوجود محفوظ رہیں۔ "اوجز" میں دو جگہ تلبید اور اس کے احکام اور متعلقات پر مفصل کلام کیا ہے۔ ایک
"باب الطیب" میں اور دوسرے "باب التلبید" میں۔ اس میں ہے کہ تلبید شافعیہ کے نزدیک سنت ہے جیسا کہ
تمام شراح حدیث نے نقل کیا ہے۔ اور کتب شافعیہ میں بھی اس کی تصریح ہے بشرطیکہ تلبید کسی ایسی چیز سے
ہو جس سے سر ڈھک جائے۔ اور جمہور نے تلبید کو مطلقاً مستحبات احرام میں شمار نہیں کیا۔ البتہ شیخ ابن ہمام
نے رشید الدین سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے اس کو بہتر کہا ہے۔ اور "غنیہ" میں ہے کہ خطمی وغیرہ کے ساتھ سر
کے بالوں کو چپکا لینا اچھا ہے۔ لیکن تلبید ایسی معمولی ہو کہ اس سے سر نہ ڈھک جائے۔ اور آنحضرت صلی
اللہ علیہ وسلم کی تلبید کو اسی پر محمول کرنا چاہئے۔"

میرے "بذل المجہود" کے حاشیہ میں ہے کہ "میں نے شافعیہ کے سوا کسی کو نہیں پایا کہ اس نے اس مسئلہ میں
اختلاف ائمہ پر مبسوط کلام کیا ہو۔ مالکی و حنبلی کتابیں اس سے خاموش ہیں۔ البتہ صاحب "کمال" نے ذکر کیا ہے کہ

یہ صفت ہے اور امام بخاریؒ نے "التلبید" میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلبید کا ذکر کیا ہے مگر اس کا حکم ذکر نہیں کیا۔ اور ہمارے احناف نے اس کو جنایات میں ذکر کیا ہے جیسا کہ آگے آتا ہے۔ صاحب منہل فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں اس امر کی دلیل ہے کہ محرم کے لئے بالوں کی تلبید مستحب ہے کیونکہ اس میں اس کے لئے آسانی ہے۔ بال پریشان نہیں ہوں گے اور دیگر تکلیفات سے محفوظ رہیں گے خصوصاً جس کے احرام کی مدت لمبی ہو۔ امام شافعیؒ اور ان کے اصحاب اور امام احمدؒ اس کے قائل ہیں۔ اور اسی طرح حنفیہ و مالکیہ بھی اس کے قائل ہیں جب کہ تلبید معمولی ہو جس سے سر نہ ڈھکے لیکن ایسی زیادہ تلبید جس سے چوتھائی سر یا زیادہ ڈھک جائے وہ محرم پر اگر ایسے پورا دن یا اس سے زیادہ مدت رہنے دیا تو دم واجب ہوگا اور ایک دن یا رات سے کم ہو تو اس میں صدقہ فطر کی مقدار صدقہ واجب ہوگا۔ یہی مرد کا حکم ہے اور عورت کے لئے احرام میں سر ڈھانکنا ممنوع نہیں ہے۔ صاحب منہل نے ائمہ اربعہ کا مذہب نقل کیا ہے۔ وہ مجھے ان کے فروع کی کتابوں میں نہیں ملا۔

حدیث تلبید اور حدیث الشعث میں تطبیق

پھر تلبید پر یہ اشکال ہوگا کہ حدیث میں آتا ہے کہ "حاجی تو وہ ہے جس کے بال بکھرے ہوئے اور بدن میلا کچیلا ہو" شیخ بذل میں فرماتے ہیں: "اگر کہا جائے کہ تلبید میں بظاہر اس حدیث کی مخالفت ہے جس میں فرمایا کہ حاجی وہ ہے جس کے بال بکھرے ہوئے ہوں اور بدن میلا کچیلا ہو۔ میں کہتا ہوں قطعاً کوئی مخالفت نہیں کیونکہ بالوں کے بکھرے ہونے سے مراد ترک زینت ہے اور تلبید زینت نہیں بلکہ بالوں کے بکھرنے سے جو اذیت ہو سکتی ہے اس کا دفع کرنا مقصود ہے۔" اور میں کہتا ہوں کہ امام بیہقی نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ حدیث شعث احرام کے بعد کی حالت پر محمول ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں: "اس بات کا بیان کہ حاجی پراگندہ سر اور غبار آلود ہوتا ہے پس احرام کے بعد سر اور داڑھی کو تیل نہ لگائے" اس توجیہ کے مطابق احرام سے پہلے تلبید کرنا اس کے خلاف نہیں جیسا کہ احرام سے پہلے تیل لگانا اس کے خلاف نہیں۔ عارف گنگوہی قدس سرہ نے الکوکب میں اس پر بہت عمدہ کلام کیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اشارہ کیا ہے کہ یہ حدیث جس میں حاجی کے بالوں کے بکھرنے اور بدن کے میلا کچیلا ہونے کا ذکر ہے اس سے مقصود مدت احرام کا لمبا ہونا ہے۔ ظاہر ہے کہ احرام کی مدت جس قدر طویل ہوگی بالوں کے بکھرنے اور بدن کے میل کچیل کی مدت بھی اتنی لمبی رہے گی۔ اور یہ دونوں چیزیں جس قدر زیادہ ہوں گی اسی قدر ثواب میں اضافہ ہوگا۔

بالغسل مع اهل رسول الله صلی الله علیه وسلم بعد ذلک ثم لبی لما رکب علی ناقته

ترجمہ: غسل کے ساتھ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نماز کی جگہ تلبیہ پڑھا پھر جب اپنی اونٹنی پر سوار ہوئے

نہ آپ نے غسل کے ساتھ تلبید کی تھی (تلبید) کسرہ بیں وسکون بیبن خطمی وغیرہ جس سے سر کے بالوں کو چپکا لیا جائے تاکہ کھلنے سے محفوظ رہیں۔ ایک روایت میں "بالغسل" بیبن اور بیبن کے ساتھ بھی مروی ہے۔ جیساکہ ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے۔ نیز حافظ ابن حجر اور حافظ عینی نے بھی اس کو ذکر کیا ہے۔ حافظ عینی نے ابن الصلاح سے نقل کیا ہے کہ روایت بین مہملہ کے ساتھ ضبط نہیں کی گئی۔ سفر السعادہ کی شرح میں ہے کہ یہ تضعیف ہے اور نہایت بعید ہے اور اگر یہ صحیح ہو تو اس کو خوشبو کے گوند پر محمول کیا جائے گا۔ تفصیل بذل میں ہے۔ یہ شیخ قدس سرہ بذل میں فرماتے ہیں کہ سر پر شہد وغیرہ لگانا تلبیسات سے ہے خصوصاً حضرت سید الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم تو نظافت و نفاست میں تمام انسانوں کے امام تھے آپ کے حق میں تو اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ۱۲ انتہی

اوجز میں ہے کہ تلبید میں اگر خوشبو نہ ہو تو اس سے حنفیہ کے نزدیک ایک دم واجب ہوتا ہے۔ اور جب اس میں خوشبو بھی ہو تو دو دم واجب ہوں گے۔ ملا علی قاری نے اس حدیث کا یہ جواب دیا کہ حدیث تلبید لغوی پر محمول ہے یعنی بالوں کا سمیٹنا اور جمع کرنا۔ نیز وہ فرماتے ہیں کہ شاید آپ کو کوئی عذر ہو گا۔ اور یہ حدیث کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل کے ساتھ تلبید کی تھی یہ ان کے قول میں داخل ہے جو کہتے ہیں کہ "اس میں اس امر پر کوئی دلالت نہیں کہ یہ تلبید احرام سے پہلے کی تھی" یعنی حدیث غسل میں احرام یا حج کا ذکر نہیں۔ اور مقدسی نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کو ایسی مناسب تلبید پر محمول کرنا چاہئے جس سے سر نہیں ڈھکتا۔ کذا فی الشامی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس وقت احرام باندھا

(ق) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نماز کی جگہ تلبیہ پڑھا یعنی نماز کے بعد جیسا کہ اس سے پہلے مفصل گذر چکا ہے۔ پھر جب اپنی اونٹنی پر سوار ہوئے اس سے معلوم ہوا کہ بزار کی یہ روایت کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے مدینے سے مکہ تک پیدل حج کیا تھا" منکر اور ضعیف الاسناد

ثم لما استقلت به على البيداء وكان يهل بالحج والعمرة تارة وبالحج تارة

ترجمہ: پھر جب اونٹنی آپ کو لے کر بیداء کی بلندی پر چڑھی اور آپ کبھی تو حج وعمرہ دونوں کا تلبیہ کہتے تھے اور کبھی صرف حج کا۔

ہے۔ جیسا کہ البدایہ والنہایہ میں ہے۔ رہا یہ سوال کہ قصواء، عضباء اور جدعاء ایک ہی اونٹنی ہے یا الگ الگ؟ نووی نے اس پر مفصل بحث کی ہے۔ ان کا میلان اس طرف ہے کہ تینوں ایک ہی ناقہ کے مختلف نام ہیں۔ اور انہوں نے یہ قول محمد بن ابراہیم تیمی تابعی وغیرہ سے نقل کیا ہے۔ اور ابن قتیبہ سے نقل کیا ہے کہ تین اونٹنیاں تھیں۔ امام بخاریؒ کا میلان پہلے قول کی طرف ہے۔ جیسا کہ حاشیہ جامع میں کتاب المغازی میں اس پر بحث ہی تفصیل سے کلام کیا ہے۔ پھر جب اونٹنی آپ کو لے کر بیداء کی بلندی پر چڑھی (یہاں تک تلبیہ پڑھا) الخ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تلبیہ پڑھنے کی جگہ کی تعیین میں جو مختلف روایات مروی ہیں ان میں یہی تطبیق ہے اور یہ تطبیق حضرت ابن عباسؓ کی حدیث میں صراحۃً مذکور ہے جسے امام ابوداؤد، طحاوی، حاکم اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔ اور امام حاکم نے کہا ہے کہ یہ مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔ ائمہ اربعہ بلکہ اکثر ائمہ اور ان کے اصحاب کا یہی قول ہے۔ جیسا کہ حافظ عینیؒ نے نقل کیا ہے۔ لیکن زرقانی نے "الاکمال" میں امام مالکؒ کا قول نقل کیا ہے کہ سوار اس وقت تلبیہ کہے جب اس کی سواری اٹھے اور پیدل اس وقت کہے جب چلنے لگے۔ سوار کے مسئلہ میں امام شافعیؒ ان کے موافق ہیں اور امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ دونوں جب نماز سے فارغ ہو جائیں تو تلبیہ پڑھیں۔ اوجز میں اس پر مفصل بحث کی ہے۔ اور اس میں امام احمدؒ سے نقل کیا ہے کہ تینوں صورتوں کی گنجائش ہے کیونکہ تینوں صحیح روایات سے ثابت ہیں۔ البتہ بہتر یہ ہے کہ تلبیہ نماز کے فوراً بعد ہو۔

اور آپ کبھی تو حج وعمرہ دونوں کا تلبیہ کہتے تھے اور کبھی صرف حج کا۔ "الساعی" میں صرف ان دونوں صورتوں کے ذکر پر اکتفا کیا ہے۔ اور صاحب مرآۃ نے اسی کی پیروی کی ہے۔ بظاہر اس کے بعد یہ بھی کہنا چاہیے تھا اور کبھی صرف عمرہ کا۔ عجیب بات یہ ہے کہ شیخ ابن قیمؒ نے اسی صورت کو ذکر نہیں کیا۔ اور ان کے مراحل میں اس شخص کا مذہب بھی ذکر کیا ہے جس کا قول یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف عمرہ کا تلبیہ کہا اور اسی پر قائم رہے۔ اور اس سے بھی عجیب تر یہ ہے کہ موصوف نے اس صورت کا انکار کیا ہے۔ جیسا کہ آگے آتا ہے۔ کتب میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حج مبارک میں راویوں کا

وكان الاهلال بعد الظهر۔

ترجمہ: اور آپ نے ظہر کے بعد احرام باندھا تھا۔

جو اختلاف ہے کہ آپ نے صرف حج کا احرام باندھا تھا یا حج و عمرہ دونوں کا یا پہلے عمرہ کا احرام تھا پھر اس پر حج کا احرام داخل کر لیا تھا؟ .... اس اختلاف کا سبب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تلبیہ کے الفاظ مختلف تھے۔ کبھی صرف حج کا تلبیہ کہتے تھے کبھی حج و عمرہ دونوں کا اور کبھی صرف عمرہ کا۔ جس نے جیسا سنا ویسا نقل کر دیا۔ مگر ابن ہمام کی عبارت سے اس پر اشکال ہوگا چنانچہ اس میں کہا ہے کہ کسی نے یہ نہیں کہا کہ آپ نے صرف عمرہ کا احرام باندھا یا صرف عمرہ کا تلبیہ پڑھا یا صرف عمرہ ادا کیا" لہٰذا ابن ہمام کی یہ عبارت بہت ہی مشکل ہے۔ جیسا کہ ابھی گذرا۔ نیز اوجز کی جو مختلف قسم میں ان لوگوں کا قول ذکر کیا ہے جو کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے عمرہ کا احرام باندھا تھا۔ پھر اس پر حج کا احرام داخل کر لیا تھا۔ اور اس قول کی تائید میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث جو صحیحین میں مروی ہے ذکر کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ کا احرام باندھا پھر حج کا۔ اور ظاہر ہے کہ جو شخص عمرہ کا احرام باندھے وہ اس کا تلبیہ بھی پڑھے گا۔ شیخ قدس سرہ کے کلام کی تائید ملا علی قاری کے قول سے بھی ہوتی ہے جو موصوف نے مرقاۃ میں حدیث ثمانی اہل بحج و عمرۃ کے تحت ذکر کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں "احتمال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قارن ہوں اور آپ کبھی حج کا تلبیہ کہتے ہوں، کبھی عمرہ کا اور کبھی حج و عمرہ دونوں کا" اور ہر ایک نے جو سنا بیان کر دیا۔ اور آخر میں بحر سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔ صاحب بحر فرماتے ہیں کہ ہمارے ائمہ نے مختلف روایات میں یہی تطبیق ذکر کی ہے اور یہی تطبیق ابن ہمام نے ذکر کی ہے۔ نیز اس کی تائید امام طحاوی کے اس قول سے ہوتی ہے جو موصوف نے ... کر کے ... سے نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "ہو سکتا ہے کہ یہ حج مفرد کا تلبیہ، عمرہ مفردہ کے تلبیہ کے بعد ہوا ہو اور وہ اس طرح کہ آپ نے پہلے صرف عمرہ کا احرام باندھا ہو جیسا کہ قاسم اور محمد بن عبدالرحمن عن عروہ کی حدیث میں ہے بعد ازاں حج کا احرام باندھ لیا ہو۔ یہ تاویل اس بنا پر ضروری ہے اگر یہ تمام روایات متحد و متفق ہو جائیں۔" نیز ان تمام روایتوں میں قوی ترین دلیل ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے جو صحیح مسلم میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ کا احرام باندھا اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حج کا۔ اور آپ نے ظہر سے قبل نہیں بلکہ ظہر کے بعد احرام باندھا۔

وکان حجہ علی رحل۔

اور آپ کا حج پالان پر ہوا

جیسا کہ اس سے پہلے گذر چکا ہے اور ابن حزم کو وہم ہوا چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ آپ نے ظہر سے پہلے احرام باندھا تھا۔ الہدی میں تو اسی طرح ہے اور ہمارے شیخ المشائخ حضرت گنگوہی قدس سرہ کوکب میں حدیث "اہل دبر الصلوٰۃ" کے تحت فرماتے ہیں "یہ نفل نماز ہے اگر صرف فرض پر اکتفاء کیا جائے تب بھی کوئی مضائقہ نہیں لیکن بہتر نہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نفل نماز چاشت کے وقت پڑھی تھی۔ آپ نماز فجر پڑھ کر انتظار میں بیٹھے رہے جب سورج طلوع ہوا تو غسل فرمایا اور احرام باندھا" میں کہتا ہوں اس کی تائید بخاری کی اس حدیث سے ہوتی ہے جو پہلے گذر چکی ہے کہ آپ نے صبح کی نماز ادا کی پھر سوار ہوئے۔

اور آپ کا حج پالان پر ہوا۔ امام بخاری نے اس پر ترجمۃ الباب قائم کیا ہے "باب الحج علی الرحل" حافظ فرماتے ہیں "رحل بفتح راء و سکون حاء کے اونٹ کے کجاوے کو کہتے ہیں جس طرح کہ گھوڑے کیلئے زین ہوتی ہے، مصنف اس ترجمہ سے اس طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ حج میں سواری تنعم سے افضل ہے۔ تنعم ہے محمل میں موٹا کجاوہ ہے، نہ عماریہ میں" میں کہتا ہوں کہ مرقاۃ کے حاشیہ میں ہے کہ محمل بروزن مجلس اونٹ کے کجاوے کی دونوں جانبوں کو کہتے ہیں جن میں دونوں طرف آدمی سوار ہوں اور ہودج: محمل کی سواری جس پر قبہ بنا ہوا ہو اور عماریہ ہودج کو کہتے ہیں"

محرم کا ہودج میں سوار ہونا اور سائے میں بیٹھنا جائز ہے یا نہیں؟

اور کیا محرم کے لئے ہودج وغیرہ میں سوار ہونا جائز ہے؟ اس میں امام احمدؒ سے دو روایتیں ہیں۔ ایک یہ کہ جائز ہے اور یہی امام شافعیؒ اور امام ابو حنیفہؒ کا مذہب ہے، دوم یہ کہ جائز نہیں اور یہی امام مالکؒ کا مذہب ہے۔ تفصیل اعتبار میں ہے۔ نیز غنیہ کے باب المحرم یظلل" میں بھی ہے۔ شیخ ابن قیمؒ اس محرم کے قصہ میں جس کا اونٹ میں انتقال ہو گیا تھا فرماتے ہیں محرم کے لئے سر ڈھانکنا ممنوع ہے اور اس کے تین درجے ہیں، ایک بالاتفاق ممنوع ہے، دوسرا بالاتفاق جائز ہے اور تیسرا مختلف فیہ ہے۔ اول درجہ میں ہر وہ چیز ہے جو سر سے متصل اور ملابس ہو اور جو سر ڈھانکنے کے لئے مقصود ہو جیسے عمامہ وغیرہ۔ دوسرے درجہ میں خیمہ، مکان اور درخت وغیرہ ہیں البتہ امام مالکؒ کے نزدیک محرم کیلئے ممنوع ہے کہ درخت پر کپڑا ڈال کر سایہ حاصل کرے۔ اور اکثر علماء کو ان سے اتفاق نہیں۔ تیسرا درجہ محمل اور ہودج کا ہے۔ اس میں امام احمدؒ کے تین قول ہیں، اول:

(قلت، وقال اللّٰهم اجعله حجًا لا رياء فيه ولا سمعة قال: فخيرهم رسول الله صلی الله علیه وسلم بين الانساك الثلاثة عند الاحرام وولدت اسماء محمد بن ابی بکر (قلت) واتاه جبریل یا مره ان یامر اصحابه برفع الاصوات

ترجمہ۔ (ش) اور آپ نے دعا کی کہ اے اللہ اس کو ایسا حج بنا جس میں ریا و سمعہ ہو۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام باندھنے کے وقت صحابہ کو اختیار دیا کہ وہ حج کی تینوں اقسام میں جس قسم کا چاہیں احرام باندھ لیں۔ اور اسماء کے بطن سے محمد بن ابی بکر پیدا ہوئے۔

(ش) اور حضرت جبریل علیہ السلام آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ آپ اپنے صحابہ کو آوازیں بلند کرنے کا حکم فرمائیں۔

جواب۔ یہ امام شافعی اور امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔ دوم یہ کہ ممنوع ہے۔ اور اگر اس نے اس کا ارتکاب کیا تو فدیہ دے۔ یہ امام مالک کا قول ہے۔ سوم یہ کہ ممنوع ہے لیکن اگر اس کا ارتکاب کیا تو فدیہ واجب نہیں۔ (م)

(ش) اور آپ نے دعا کی کہ اے اللہ اس کو ایسا حج بنا جس میں ریا و سمعہ ہو۔ جیسا کہ شمائل میں ہے۔ اور اسی کی مثل فتح اور البدایہ والنہایہ میں ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو تینوں مناسک کا اختیار دیا

(ق) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام باندھنے کے وقت صحابہ کو اختیار دیا کہ وہ حج کی تینوں اقسام میں جس قسم کا چاہیں احرام باندھ لیں۔ پھر مکہ کے قریب پہنچے تو جن لوگوں کے پاس ہدی کے جانور نہیں تھے آپ نے ان کو ترغیب دی کہ وہ حج کو فسخ کر کے عمرہ بنا لیں، پھر مروہ کے پاس اس کا قطعی حکم فرمایا۔

محمد بن ابی بکر کی ولادت

اور مؤطا و الخلیفہ میں حضرت اسماء بنت عمیس زوجہ ابی بکر رضی اللہ عنہ کے بطن سے محمد بن ابی بکر پیدا ہوتے ہیں۔ انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق کی معرفت مسئلہ دریافت کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم فرمایا کہ غسل کر کے احرام باندھ لیں۔ ان کے اس قصہ میں بہت سے مسائل ہیں۔ ان میں سے شیخ ابن قیم نے تین مسائل ذکر کئے ہیں۔ اول محرم کا غسل کرنا دوم یہ کہ حائضہ بھی احرام کے لئے غسل کرے۔ سوم یہ کہ حائضہ کا احرام صحیح ہے۔

حائضہ کا احرام کیلئے غسل کرنا

حیض و نفاس والی عورت کا احرام کیلئے غسل کرنا تمام علماء کے نزدیک مستحب ہے مگر ابن حزم کے نزدیک فرض ہے کمال العینی۔

باآواز بلند تلبیہ کہنے کا حکم

(ق) اور حضرت جبریل علیہ السلام آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ آپ اپنے صحابہ کو آوازیں بلند کرنے کا حکم فرمائیں۔ یہ بات ابن

رأى حمار وحش عقيرا - ثم مضى حتى اذا كان بالاثاية

ترجمہ: تو ایک حمار وحشی دیکھا جو زخمی تھا، پھر آپ چلے یہاں تک کہ جب اثایہ پہنچے

علیہم اجمعین۔ اس سفر اور موضوع کو اس کتاب میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

تو ایک حمار وحشی دیکھا۔ یہاں طبری کو وہم ہوا ہے کہ یہ حمار وحشی حضرت ابو قتادہؓ نے شکار کیا تھا۔ حالانکہ ابو قتادہؓ کے شکار کا واقعہ عمرۂ حدیبیہ کا ہے۔ کذا فی البذل۔ غالباً وہم کا منشاء بخاری کی روایت ہے جس میں "حاجا" کا لفظ ہے۔ حافظؒ نے اس کو ذکر کرکے یہ جواب دیا ہے کہ یہ مجاز ہے اور عینیؒ نے اس کو غلط قرار دیا ہے۔ شیخ ابن ہمامؒ اسی طرف مائل ہیں کہ یہ سفر حج کا واقعہ ہے۔ صاحب وفاء نے حمار کا قصہ مقام عرج میں ذکر کیا ہے۔ جو زخمی تھا آپ نے فرمایا اسے رہنے دو عنقریب اس کا مالک آ جائے گا۔ چنانچہ تھوڑی دیر بعد قبیلہ بہز کا ایک شخص آیا جس نے اسے زخمی کیا تھا، اس نے عرض کیا یا رسول اللہ! اس حمار کو آپ جو چاہیں کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا اور انہوں نے وہ تقسیم کر دیا۔ بہزی کی یہ حدیث امام مالکؒ نے مؤطا میں انہی الفاظ میں، اور امام مالک کی سند سے نسائیؒ نے بھی روایت کی ہے۔ امام طحاوی نے اس کو کئی سندوں سے روایت کیا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں "بہزی آیا، اس نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ میرا شکار ہے اسے کھاؤ" پس آپ نے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو تقسیم کرنے کا حکم فرمایا الخ۔ [illegible] میں جو ہے کہ "ایک بہز کا آدمی آیا" غالباً یہ تحریف ناقل ہے۔ اس حدیث کے مختلف طرق اور جزئیات مفصل مذکور ہیں۔ اور ایک حمار وحشی کا قصہ صعب بن جثامہؓ کی حدیث میں عنقریب آتا ہے۔ نیز محرم کو شکار کا گوشت کھانا جائز ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ میں ائمہ اربعہ کا اختلاف بھی آگے آتا ہے۔

تیسری منزل اثایہ

پھر آپ چلے یہاں تک کہ جب اثایہ پہنچے۔ "اثایہ" تیسری منزل ہے۔ اور بخاری کی حدیث المساجد سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ تیسری منزل رویثہ ہے۔ صاحب وفاء نے "اثایہ" کو رویثہ کے بعد ذکر کیا ہے۔ اور "البذل" میں ہے کہ "اثایہ" رویثہ اور عرج کے درمیان ہے۔ اور مؤطا کی روایت میں بھی اسی طرح ہے۔ حموی نے اس کا ضبط خوب بسط سے ذکر کیا ہے۔ اور اس میں اختلاف نقل کیا ہے کہ یہ "اثایہ" ثاء کے ساتھ ہے یا [illegible] کے ساتھ اثانہ ہے، نون کو غلط قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ صحیح اول ہے یعنی یا کے ساتھ اثایہ، مراد [illegible] میں ہے

(قلت) واحتجم علی راسه بلحیی جمل۔

ترجمہ: رشن! اور اپنے سر پر لحیی جمل نامی جگہ میں سینگی لگوائی۔

میں ذکر کیا ہے کہ تو اب اللہ تعالیٰ نے تعلیم کی خاطر ذبح کے بجائے قتل کا لفظ ذکر فرمایا ہے۔ ابو بکر جصاص فرماتے ہیں: یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ ہر وہ شکار جس کو محرم قتل کرے وہ حلال نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو قتل کہا ہے اور مقتول کا کھانا جائز نہیں۔ معروف طریق کا کھانا حلال ہے۔ اور جس کو ذبح کیا جائے اسے مقتول نہیں کہتے۔ مزید تفصیل اوجز میں دیکھئے۔

لحیی جمل میں سینگی لگوانا

رشن! اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سر پر اور ابن بحینہ کی حدیث میں ہے: سر کے درمیان سینگی لگانے کی جگہ کا بیان ہے کیونکہ وہ مختلف جگہوں میں مختلف ہوتی ہے اور سر میں سب سے سخت ہوتی ہے۔ لحیی جمل نامی جگہ میں سینگی لگوائی۔ لحیی: بفتح لام وسکون حائے مہملہ و یائے مفتوحہ و یائے ساکنہ بلفظ تثنیہ اور جمل: بفتح جیم و میم۔ مکہ کے راستے میں ایک جگہ کا نام ہے۔ اصیلی کے موطا امام مالک کی روایت میں ہے: موطا امام محمد کے لفظ یہ ہیں کہ مکہ کے راستے میں ایک جگہ میں جس کو لحیی جمل کہا جاتا ہے۔ مبارک فرماتے ہیں: لحیی جمل بعض روایات میں بلفظ تثنیہ ہے اور بعض میں بلفظ مفرد۔ لام مفتوح ہے۔ اور اس کا کسرہ بھی جائز ہے۔ اور حاء ساکن ہے۔ بغوی نے اس کو اپنی معجم میں اسم عقیق کے ذیل میں ذکر کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ وہ بئر جمل ہے جس کا تذکرہ ابو جہیم کی تیمم والی حدیث میں آیا ہے۔ ابن وضاح وغیرہ نے کہا ہے کہ یہ جحفہ کے بعد سقیا سے سات میل کے فاصلہ پر ایک گھاٹی ہے۔ کذا فی الاوجز۔ اور معجم میں ہے کہ لحیی جمل ایک جگہ کا نام ہے۔ پھر اس کی تفصیل ذکر کی ہے۔ یہ جگہ مکہ مدینہ کے درمیان ہے اور مدینہ سے قریب تر ہے۔

کذا فی المعجم والفتح والعینی۔

بعض کا خیال ہے کہ لحیی جمل سے مراد وہ آلہ ہے جس سے سینگی لگائی جاتی ہے۔ یعنی اونٹ کے دونوں جبڑوں کی ہڈی سے احتجام کیا۔ مجمع میں ہے: لحیی جمل ہر جبڑے والے جانور کی دو ہڈیاں جن میں دانت ہوتے ہیں۔ جمع لحی ہے۔ اوجز میں ہے: زیادہ اظہر یہ ہے کہ اس سے پہلے معنی کی جگہ ہیں۔ یعنی یہ جگہ کا نام ہے۔ جیسا کہ موطا مالک، موطا محمد، بخاری شریف اور دیگر کتابوں میں اس کی

(ق) ثم سار حتى نزل بالعرج وكانت زاملته وزاملة ابي بكر واحدة

ترجمہ: (ق) پھر چلے یہاں تک کہ "عرج" میں فروکش ہوئے۔ اور آپ کی اور ابو بکرؓ
کی سامان بردار اونٹنی ایک ہی تھی۔"

تصریح موجود ہے۔ حازمی فرماتے ہیں کہ وسط سر میں احتجام کا واقعہ حجۃ الوداع کا ہے۔ کذا فی الاصابۃ
اور محرم کے سینگی لگوانے کا حکم قریب ہی گذرا ہے جہاں "لحی" میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں
کی پشت پر سینگی لگوانے کا ذکر ہوا۔

چوتھی منزل العرج

(ق) پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چلے یہاں تک کہ "عرج" میں فروکش
ہوئے۔ "عرج" کا ذکر بخاری شریف کے باب المساجد میں ہے۔ بخاری کے
حاشیہ میں عینی سے نقل کیا ہے کہ یہ فتح عین وسکون را ہے اس کے بعد جیم ہے۔ مکہ اور مدینہ کے راستے میں
ایک بڑی بستی ہے۔" انتہی۔ یہ چوتھی منزل ہے۔ اس کے اور رویثہ کے درمیان ۱۴ میل کا فاصلہ ہے۔ یہ
العرج کے علاوہ ہے جو طائف کے پاس ہے۔ کذا فی معجم البلدان۔ پوری بحث تلخیص میں آ رہی ہے۔
یاقوت حموی نے اس نام کی کئی جگہیں ذکر کی ہیں۔ منجملہ ان کے ایک یہی ہے جو حرمین کے درمیان ہے۔
اور ایک طائف کے علاقہ میں ہے۔ نیز ایک یمن کے شہر کا نام ہے۔ اور اس کی وجہ تسمیہ میں متعدد اقوال نقل کئے ہیں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ کا سامان ایک ہی اونٹنی پر تھا

اور آپ کی اور ابو بکرؓ کی سامان بردار اونٹنی
ایک ہی تھی۔ حاشیہ مرقاۃ میں ہے کہ "زاملہ" وہ اونٹ کہلاتا
ہے جس پر غلہ اور سامان لادا جائے۔ یہ زمل سے ماخوذ
ہے جس کے معنی ہیں لادنا۔ اور زمیل وہ شخص کہلاتا ہے جس کا سامان تمہارے سامان کے ساتھ ایک ہی اونٹ

پھر بظاہر اس حدیث پر یہ اشکال ہوگا کہ امام بخاری نے "باب الحج علی الرحل" میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی
روایت ذکر کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹنی پر حج کیا اور وہی آپ کی زاملہ (سامان بردار اونٹنی)
شارحین میں سے کسی نے اس اختلاف سے تعرض نہیں کیا۔ میرے نزدیک اس اشکال کا حل یہ ہے۔ کہ یہ
مختلف اوقات پر محمول ہے۔ چنانچہ ابو داؤد کی روایت جو یہاں متن میں ذکر کی گئی ہے اس میں تصریح ہے
کہ یہ مدینہ سے مکہ جاتے ہوئے راستہ کا واقعہ ہے۔ اور حدیث بخاری سے بظاہر مفہوم ہوتا ہے کہ وہ مکہ سے

فاضلها غلامه فطفق ابوبکر یضربه و قال بعیر واحد تضله؟

<u>ترجمہ</u>: حضرت ابوبکرؓ کے غلام نے اس کو گم کر دیا۔ پس ابوبکرؓ اسے مارنے لگے۔ اور فرمایا: ایک ہی تو اونٹ تھا تو نے وہ بھی گم کر دیا!

واقعہ کی صورت کا تصور یہ ہے کہ پہلا سفر چونکہ طویل تھا۔ اس بنا پر بہت سا سامان اور بہت سی ضروریات توشہ وغیرہ ساتھ ہوں گی لہٰذا وہ ایک مستقل سواری پر ہوں گی۔ اس لئے تمام سامان حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامان والی اونٹنی پر تھا لیکن مکہ سے عرفات کا سفر مختصر تھا۔ اس میں بستر اور سامان وغیرہ کی زیادہ ضرورت نہ تھی۔ اس لئے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری کی اونٹنی پر ہوگا۔ اس کی تائید حضرت جابرؓ کی حدیث طویل سے بھی ہوتی ہے۔ اس میں مقام نمرہ کے بارے میں یہ لفظ ہیں: "پس جب سورج ڈھلا تو آپ نے قصواء کی تیاری کا حکم دیا چنانچہ اس پر کجاوہ رکھا گیا۔" اور ظاہر یہ ہے کہ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سامان بھی ہوگا۔ اور اس پر حدیث ابن ماجہ سے اشکال نہیں ہوتا جو حضرت اسماء سے بایں الفاظ مروی ہے کہ "ہم نکلے اور ابوبکرؓ کے سامان کے لئے ایک ہی اونٹنی تھی۔ جو ابوبکر رضی اللہ عنہ کے غلام کے پاس تھی" کیونکہ ان دونوں باتوں کے درمیان کوئی منافات نہیں کیونکہ آنحضرتؐ کا سامان بھی اسی پر ہو مع سامان اسماء اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا سامان بھی۔ اس کی مزید تائید اس سے ہوتی ہے کہ البدایہ والنہایہ میں مسند احمد سے حدیث ابن ماجہ کی مثل روایت نقل کی ہے جس میں یہ الفاظ ہیں: کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اور حضرت ابوبکرؓ کی سامان بردار اونٹنی ایک ہی تھی۔"

حضرت ابوبکرؓ کا غلام کو مارنا

حضرت ابوبکرؓ کے غلام نے اس اونٹنی کو گم کر دیا۔ ابوداؤد کے لفظ یہ ہیں: "ابوبکرؓ کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سامان بردار اونٹنی حضرت ابوبکرؓ کے غلام کے پاس تھی۔ ابوبکرؓ بیٹھے انتظار کر رہے تھے کہ غلام اونٹنی کو لے کر نکلا۔ سو آیا تو اس کے پاس اونٹنی نہیں تھی۔ فرمایا تمہارا اونٹ کہاں ہے؟ اس نے عرض کیا کہ وہ تو گذشتہ رات سے گم ہو گیا ہے۔ پس ابوبکرؓ اسے مارنے لگے۔" شیخ بذل فرماتے ہیں: "اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غلام کی گوشمالی حق تعالیٰ کے ارشاد "ولا جدال فی الحج" کے ضمن میں نہیں آتی ورنہ ابوبکرؓ کبھی اس کی جرأت نہ کرتے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کو اس سے منع کر دیتے۔ لیکن آپ کا ارشاد کہ "ان محرم صاحب کو دیکھو یہ کیا کر رہے ہیں؟" اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ محرم کے لئے یہ بھی مناسب نہیں۔"

اور فرمایا: ایک ہی تو اونٹ تھا تو نے وہ بھی گم کر دیا! مرقات میں ہے کہ فضالہ اسلمی کی آل کو

ثم مضی حتی اذا کان بالابواء
پھر آپ چلے یہاں تک کہ جب ابواء پہنچے

جب خبر پہنچی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سامان بردار اونٹنی گم گئی ہے تو حلوے کا ایک ڈبہ لائے اور خدمت اقدس میں پیش کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے "آؤ ابوبکرؓ! اللہ تعالیٰ نے عمدہ غذا بھیجا فرمادی ہے" مگر ابوبکر رضی اللہ عنہ غلام پر غیظ و غضب کا اظہار فرما رہے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ابوبکر بس تسلی پکڑو، کیونکہ معاملہ نہ تمہارے اختیار میں ہے نہ ہمارے" اتنے میں حضرت سعدؓ اور ابوقیس ایک سامان بردار اونٹنی، جس پر توشہ تھا، لے کر حاضر ہوئے۔ سعد نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہمیں خبر ملی ہے کہ آپ کی سامان بردار اونٹنی گم گئی ہے لہٰذا اس کے بدلے میں یہ اونٹنی پیش خدمت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے ہماری اونٹنی واپس بھیج دی ہے۔ اب تم اپنی اونٹنی لے جاؤ، اللہ تعالیٰ تمہیں برکت عطا فرمائے۔"

پھر آپ چلے یہاں تک کہ جب ابواء پہنچے ابواء بفتح الف وسکون باء، اسکے

پانچویں منزل ابواء

بعد واؤ والف ممدودہ کتاب فی العلم میں پانچویں منزل ہے۔ سمہودی فرماتے ہیں: اس کے اور جحفہ کے درمیان ۲۳ میل کا فاصلہ ہے۔ مراۃ میں بھی اسی طرح ہے۔ اور اس میں اتنا اور لکھا ہے کہ ان دونوں کے درمیان ابواء ہے ابواء مدینہ کی طرف ہے اور جحفہ مکہ کی طرف۔ اور کہا گیا ہے کہ وہاں ایک بلند پہاڑ ہے۔ اسی جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ کی وفات ہوئی اور ابواء مدینہ کی جانب سے رابغ سے پہلے ہے۔ سمہودی فرماتے ہیں: اس کو ابواء اس وجہ سے کہتے ہیں کہ یہاں سیلاب ٹھکانا پکڑتے ہیں۔ اس وجہ سے نہیں کہ یہاں وبا رہتی ہوتی ہے کیونکہ اس صورت میں اس کا نام أوباء ہونا چاہئے تھا، یا یہ کہا جائے کہ ابواء اوباء سے مقلوب ہے۔ حموی نے اور بھی وجوہ تسمیہ ذکر کی ہیں۔ اور اس بستی کے پاس ہی تفصیل کام آیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ کے یہاں دفن ہونے

ابواء حضور کی والدہ ماجدہ کا مدفن

کی وجہ یہ ذکر کی ہے کہ مدینہ سے مکہ جاتے ہوئے ان کا یہاں انتقال ہو گیا تھا۔ اس لئے یہیں دفن ہوئیں۔ مولانا محمد رابغ لکھتے ہیں: کہ ابواء ایک وادی کا نام ہے جس میں ودان ہے جیسا کہ ابھی آتا ہے۔ ودان: بفتح واؤ و تشدید دال مہملہ جحفہ کے قریب میں ایک جگہ کا نام ہے جو ابواء

اھدی الیہ الصعب بن جثامۃ عجز حمار وحشی فردہ علیہ۔
ترجمہ: حضرت صعب بن جثامہ نے آپ کی خدمت میں حمار وحشی کی ران کا ہدیہ پیش کیا جسے آپ نے واپس فرما دیا۔

کی نسبت جحفہ سے قریب تر ہے، ان دونوں کے درمیان آٹھ میل کا فاصلہ ہے۔ نیز بحث واقعہ ابواء میں پیش
آیا یا ودان میں؟ اس میں راوی کو شک ہے بعض راویوں نے ابواء ذکر کیا ہے اور بعض نے ودان۔ کذا
فی الزرقانی۔ اوجز میں مختلف روایات ذکر کرنے کے بعد حافظ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ظاہر یہ شک راوی کی
جانب سے ہے۔ نیز اوجز میں ایک اور اختلاف بھی ذکر کیا ہے کہ یہ واقعہ قدید میں پیش آیا یا جحفہ میں؟ یہ تمام
مقامات قریب قریب ہیں۔ رسالہ اوجز میں اس پر مفصل کلام کیا ہے۔

یاقوت حموی لکھتے ہیں کہ ودان تین جگہوں کا نام ہے، جن کو انہوں نے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ نیز حموی
لکھتے ہیں کہ صحیح ودان کی طرف صعب بن جثامہ کی نسبت کی جاتی ہے۔ کیونکہ وہ یہاں قیام کیا کرتے تھے اس
لئے اسی کی طرف منسوب ہوئے۔ نیز عبد ابیع لکھتے ہیں کہ ابواء ایک وادی کا نام ہے جس میں ودان ہے۔
نیز اس وادی میں ایک خاص موضع کا نام بھی ابواء ہے۔ شام کے راستہ میں مشرق کی طرف واقع ہے۔ البتہ
وہاں آجکل مستورہ کے نام سے معروف ہے جو مدینہ سے ۱۸۰ کیلومیٹر پر واقع ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ جگہ
ان دنوں بہت بڑی منزل ہے۔ یہاں تلی ہوئی مچھلیوں کی فروخت خوب ہوتی ہے۔ حجاج کرام یہاں سے گزرتے
ہیں تو مچھلی کھائے بغیر آگے نہیں جاتے کہ یہاں کی مچھلیاں بہت عمدہ ہوتی ہیں۔

صعب بن جثامہؓ کو ہدیہ کرنیکا واقعہ

حضرت صعب بن جثامہ رضی اللہ عنہ نے آپ کی خدمت میں حمار وحشی کی ران کا ہدیہ پیش کیا۔ روایات اور کتب تاریخ
میں معروف یہی ہے کہ صعب بن جثامہؓ کا واقعہ حجۃ الوداع میں پیش آیا۔ مگر شیخ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ صعب
بن جثامہ کی حدیث کا واقعہ حجۃ الوداع میں پیش آنا ہمارے نزدیک ثابت نہیں۔ انتہی مختصراً بمعناہ فیہ۔ جسے
آپ نے واپس فرما دیا۔ اس بارے میں روایات مختلف ہیں کہ سالم حمار وحشی کا ہدیہ پیش کیا گیا تھا یا اس کے
ایک ٹکڑے کا؟ اور یہ کہ آپ نے اسے قبول فرما لیا تھا یا رد کر دیا تھا؟ اور یہ کہ یہ واقعہ ابواء کا ہے یا ودان
کا یا جحفہ کا؟ ان مباحث میں وسیع اختلاف ہے۔ جو فتح وغیرہ مطولات میں ذکر کیا گیا ہے۔ اور اوجز میں
ان کے کلام کا خلاصہ دیا ہے اور لامع کے حاشیہ میں اس پر اجمالی کلام کیا ہے۔ امام بیہقیؒ نے ان روایات
کو یوں جمع کیا ہے کہ زندہ حمار کا ہدیہ کیا گیا تو واپس کر دیا گیا، اور اس کے ٹکڑے کو قبول فرما لیا۔ جیسا کہ فتح میں ہے

(قلت) واعتل بعیر لصفیة فامر زینب ان تعطیها بعیرا، فقالت انا! افقر یهودیة! فغضب۔

ترجمہ (وقش) اور حضرت صفیہؓ کا اونٹ بیمار ہو گیا تو آپ نے حضرت زینبؓ کو حکم فرمایا کہ انہیں ایک اونٹ دے دیں، انہوں نے کہا کیا میں آپ کی یہودن کو دے دوں؟ اس پر آپ ناراض ہو گئے۔

اور شرح مواہب میں ہے مگر نسائی کی روایت جس میں بالکلیہ کا دیں تو رانا مذکور ہے اس تطبیق کے خلاف ہے الا یہ کہ اس میں تاویل کی جائے۔ علامہ زرقانیؒ نے حافظؒ کی متابعت میں کہا ہے کہ قبول کرنے کی روایت کو کسی دوسرے واقعے پر محمول کرنا چاہئے۔ اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ یہ قصہ سفر میں پیش آیا۔ امام بیہقی کی ذکر کردہ تطبیق کو حافظ کا رد کرنا قابل اعتماد نہیں کیونکہ یہ ان کے فقہی مسلک کے خلاف ہے۔

محرم کے شکار میں اختلاف

محرم کے شکار کے مسئلہ میں ائمہ کا اختلاف ہے جیسا کہ اوجز میں مفصل ذکر کر چکا ہوں، شیخ قدس سرہ نے الکوکب الدری میں اس پر بہت عمدہ کلام کیا ہے۔ فرماتے ہیں: یہ جاننا چاہئے کہ اس مسئلہ میں ہمارے اور امام شافعیؒ کے درمیان اختلاف ہے۔ اگر محرم نے خود شکار کیا یا شکار کو ذبح کیا تو بالاتفاق حرام ہے اور اگر غیر محرم نے محرم کے حکم سے شکار کیا تب بھی بالاتفاق حرام ہے اور اگر غیر محرم نے شکار کیا، وہ اس کی نیت یہ بھی تھی کہ محرم کو کھلائیگا مگر محرم نے اس کا حکم نہیں کیا تو امام شافعیؒ کے نزدیک ناجائز ہے اور ہمارے نزدیک حرام نہیں ہے۔ انتہیٰ اشرحاً اخذ۔ میں کہتا ہوں کہ اس مسئلہ میں تین مذہب ہیں۔ اول یہ کہ مطلقاً ممنوع ہے یہ قول حافظ عینیؒ نے بعض سلف سے نقل کیا ہے۔ دوم یہ کہ اگر محرم کی خاطر شکار کیا گیا ہو تو ممنوع ہے، ائمہ ثلاثہ اسی کے قائل ہیں۔ سوم یہ کہ اگر محرم نے خود شکار کیا ہے یا اس کی اجازت یا اعانت سے شکار ہوا ہو تو بالاتفاق حرام ہے یہ اجمالی بات ہے ورنہ امام مالکؒ وغیرہ کے مختلف اقوال مروی ہیں جیسا کہ اوجز میں تفصیل بیان کر چکا ہوں۔

حضرت صفیہؓ کے اونٹ کا بیمار ہونا

ایک دفعہ سفر کے دوران میں ام المومنین حضرت صفیہ بنت حیی رضی اللہ عنہا کا اونٹ بیمار ہو گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ام المومنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کو حکم فرمایا کہ انہیں ایک اونٹ دے دیں۔ انہوں نے جواب میں کہا کیا میں آپ کی یہودن کو دے دوں؟ یا اس لئے کہا کہ حضرت صفیہؓ حضرت ہارون علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی اولاد سے تھیں۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہو گئے۔ چنانچہ اثنا سفر اور ایام منیٰ میں بات

سے گفتگو نہیں فرمائی یہاں تک کہ مدینہ واپسی ہوئی۔ مدینہ آکر بھی محرم اور صفر میں نہ ان سے بات کی نہ ان کی باری پر ان کے گھر گئے۔ جب ربیع الاول کا مہینہ آیا تو آپ انکے ہاں تشریف لے گئے جیسا کہ مسند احمد کی روایت سے ابھی آتا ہے۔ مجھے ابھی تک اس کی تحقیق نہیں ہو سکی کہ یہ واقعہ کس جگہ پیش آیا تھا۔ حافظ ابن قیم اور ان کے متبعین صاحب مرآۃ وغیرہ نیز قسطلانی اور ان کے شارح زرقانی پر تعجب ہے کہ کسی نے بھی حجۃ الوداع کے واقعہ میں اس قصہ کا ذکر نہیں کیا۔ ابوداؤد نے یہ قصہ حضرت عائشہؓ سے مختصراً نقل کیا ہے کہ حضرت صفیہؓ بنت حیی کا اونٹ بیمار ہو گیا اور حضرت زینبؓ کے پاس زائد سواری تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ انہیں (صفیہؓ کو) ایک اونٹ دے دو۔ حضرت زینب نے کہا، میں اس یہودن کو دے دوں! اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہو گئے اور ذوالحجہ، محرم اور صفر کے کچھ حصے میں اور مجمع الزوائد میں ہے کہ صفر میں ان سے قطع تعلق کئے رکھا۔ ربیع الاول میں ان کے پاس تشریف لے گئے۔

اس کی تائید مسند احمد کی روایت سے ہوتی ہے جس میں خود حضرت صفیہؓ سے اس قصہ کو مفصل روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات کے ہمراہ حج کیا۔ سفر کے دوران ایک شخص ان کی سواریوں کو تیز ہنکانے لگا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آبگینوں یعنی عورتوں۔ کی سواریوں کو یوں ہنکایا کرتے ہیں! دوران اثنائے سفر جاری تھا صفیہ بنت حیی کا اونٹ بیمار ہو کر راستہ میں بیٹھ گیا۔ حالانکہ ان کی سواری سب سے عمدہ تھی۔ وہ رونے لگیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی۔ تو انکے پاس تشریف لائے اور اپنے دست مبارک سے ان کے آنسو صاف کرنے لگے۔ مگر ان کے گریہ میں اور اضافہ ہو گیا۔ آپ نے ان کو رونے سے منع فرمایا۔ تاہم جب انہوں نے زیادہ رونا شروع کیا تو آپ نے ڈانٹا، اور مجبوراً لوگوں کو اترنے کا حکم فرمایا۔ حالانکہ آپ کا ارادہ وہاں اترنے کا نہیں تھا۔ بہر حال لوگ اتر گئے اور یہ میری باری کا دن تھا۔ جب لوگ اترے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خیمہ نصب کیا گیا۔ اور آپ اس میں فروکش ہوئے۔ مجھے خبر نہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے میرے ساتھ کیا برتاؤ ہوگا۔ اور مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں آپ کے دل میں کوئی ناگواری نہ ہو۔ حضرت عائشہؓ کے پاس گئی اور ان سے کہا۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں کسی بھی چیز کے بدلے اپنی باری کے دن کا سودا بھی نہیں کر سکتی۔ مگر آج میں اپنا دن آپ کو اس شرط پہ ہبہ کرتی ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مجھ سے راضی کر دو۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا بہت اچھا۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ نے ایک سر کا کپڑا لیا اسے زعفران

وایضا علم من حدیث المسند ان قصة انجشة المشهورة وقوله صلى الله عليه وسلم يا انجشة رويدك سوقك بالقوارير ايضا وقع في هذا السفر

ترجمہ: نیز مسند کی حدیث سے معلوم ہوا کہ انجشہ کا مشہور قصہ یعنی جس میں آپ نے فرمایا تھا کہ اے انجشہ آبگینوں کو ذرا آہستہ چلاؤ۔ اسی سفر میں پیش آیا تھا۔

سے ملا، پھر اسپر پانی چھڑکا تاکہ اس کی خوشبو مہک جائے۔ پھر اپنے کپڑے پہنے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئیں۔ خیمے کا کنارہ اٹھایا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عائشہ کیا بات ہے؟ آج تمہاری باری کا دن نہیں، انہوں نے عرض کیا کہ یہ اللہ کا فضل ہے وہ جسے چاہتے ہیں عطا کر دیتے ہیں۔ بہر حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اہلیہ محترمہ کے ساتھ قیلولہ فرمایا۔ جب چلنے کا وقت ہوا تو حضرت زینب سے فرمایا کہ اپنی بہن کو ایک اونٹ دے دو۔ ازواج مطہرات میں انہی کے پاس سب سے زیادہ سواریاں تھیں۔ حضرت زینب نے کہا: میں آپ کی یہودن کو دوں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی یہ بات سن کر ناراض ہوئے۔ ان سے گفتگو ترک کر دی، مکہ مکرمہ جانے تک ایام منیٰ میں، اور مدینہ کی واپسی تک، نیز مدینہ طیبہ میں محرم اور صفر گزرنے تک نہ آپ ان کے پاس تشریف لے گئے، نہ انہیں باری کا حصہ دیا۔ اور وہ آپ سے بالکل ہی مایوس ہو گئیں۔ جب ربیع الاول شروع ہوا تو آنحضرت ان کے پاس تشریف لے گئے۔ جب انہوں نے آپ کا سایہ دیکھا تو دل میں کہنے لگیں کہ یہ کسی آدمی کا سایہ ہے، اور نبی کریم تو میرے پاس تشریف لاتے نہیں۔ پھر یہ شخص کون ہوگا؟ جب انہوں نے آپ کو دیکھا تو کہنے لگیں یا رسول اللہ جب آپ میرے پاس تشریف لائے تو میں حیرت میں ہوں کہ کیا کروں اور کس طرح آپ کی ناراضگی کا ازالہ کروں۔ ان کے پاس ایک باندی تھی جسے وہ آنحضرت سے پردہ میں رکھتی تھیں، اس کے بارے میں عرض کیا کہ فلاں باندی آپ کو ہبہ کرتی ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زینب کی چارپائی کے پاس گئے وہ اٹھا کر رکھی ہوئی تھی، اپنے دست مبارک سے اسے بچھایا، پھر اپنی اہلیہ محترمہ سے ملے اور ان سے راضی ہو گئے۔

انجشہ کیلئے حکم نبوی

نیز مسند کی اسی حدیث سے معلوم ہوا کہ انجشہ کا مشہور قصہ یعنی جس میں آپ نے فرمایا تھا کہ اے انجشہ آبگینوں کو ذرا آہستہ چلاؤ، اسی سفر میں پیش آیا تھا۔ مگر تعجب ہے کہ شیخ ابن قیمؒ نے اس کو بھی قصہ حجۃ الوداع میں ذکر نہیں کیا۔ یہ قصہ معروف ہے۔ بخاری وغیرہ کتب صحاح میں مروی ہے۔ امام بخاری نے چند مواضع میں اس کی تخریج کی ہے۔ مسلمان کے

(قال) فلمّا مرّ بوادی عُسفان

ترجمہ: (ق) پھر جب آپؐ وادی عسفان سے گزرے۔

"بلی ما یجوز من الشعر والرجز" میں اس کو ذکر کیا ہے۔ اور حافظؒ نے اس باب میں احادیث کے الفاظ اور طرق کو خوب بسط سے ذکر کیا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعض بیویوں کے پاس تشریف لے گئے ان کے ساتھ ام سلیم بھی تھیں۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آپ سفر میں تھے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آپؐ اپنی فرودگاہ میں تھے کہ حدی خوان نے حدی پڑھی۔ نسائی کی روایت میں ہے کہ ان کے ساتھ ایک اونٹوں کو ہنکانے والا تھا اور ایک حدی خوان تھا۔ ابو داؤد طیالسی کی روایت میں ہے کہ انجشہ مستورات کے حدی خوان تھے۔ اور براء بن مالک مردوں کے۔ مسلم کی روایت میں ہے کہ کسی سفر میں تھے۔ ان روایات کی پوری تفصیل فتح الباری میں ہے۔ مگر حافظؒ نے کسی روایت سے سفر کی تعیین نہیں کی۔ تعجب ہے کہ انہوں نے مسند احمد کی یہ روایت بالکل ذکر نہیں کی جس میں تصریح ہے کہ یہ قصہ سفر حج کا ہے۔ تاحال مجھے یہ تحقیق نہیں کہ یہ دونوں واقعے کس منزل میں پیش آئے۔ اس کی تفتیش کرلی جائے۔

یہ آٹھ منزلیں جو شیخ ابن قیمؒ نے ذکر کی ہیں۔ بخشتران مساجد کے مطابق ہیں جو حضرت ابن عمرؓ نے بتائی ہیں۔ اور امام بخاری نے "باب المساجد التی علی طرق المدینۃ" میں۔ نیز صاحب البدایہ والنہایہ نے بھی ذکر کیا ہے اور صاحب البدایہ والنہایہ نے تو یہ بھی فرمایا ہے کہ ان میں سے بعض مواضع کے نام بدل چکے ہیں اور بعض اب تو بالکل غیر معروف ہیں۔ پہلی چار منزلوں کے نام تو بخاری کی روایت کے موافق ہیں۔ اور یہ پانچویں منزل اور اسی طرح آئندہ منازل کے نام ان ناموں سے مختلف ہیں۔ جو بخاری شریف میں ذکر کئے گئے ہیں۔

موضع ہرشیٰ

بخاری کی روایت میں "عرج" کے بعد پانچویں منزل موضع "ہرشیٰ" مذکور ہے۔ بفتح اول وسکون ہا۔ اور اس کے بعد شین منقوطہ اور اس کے بعد الف مقصورہ ہے۔ کذا فی الفتح۔ اور معجم میں ہے کہ یہ شام اور مدینہ سے مکہ کے راستوں کے سنگم پر ہے۔ اس سے نیچے مغربی جانب موضع ودّان دو میل کی مسافت پر واقع ہے۔

چھٹی منزل عسفان

(ق) پھر جب آپؐ وادی عسفان سے گزرے۔ عسفان: بروزن عثمان مکہ سے دو مرحلے پر ہے۔ کذا فی القاموس۔ اور مرقاۃ کے حاشیہ میں ہے کہ یہ جگہ

قال یا ابا بکر ای واد ھذا؟ قال وادی عسفان، قال لقد مر بہ ھود وصالح

تو آپ نے فرمایا: اے ابوبکر یہ کونسی وادی ہے؟

جحفہ اور مکہ کے درمیان واقع ہے۔ مکہ سے دو مرحلے یا ۳۶ میل۔ اور جحفہ سے تین مرحلوں پر واقع ہے۔ اور عسفان سے ملل تک کو ساحل کہا جاتا ہے۔ اور ملل مدینہ شریف سے ایک دن کی مسافت پر ہے" اور معجم میں ہے کہ "کہا جاتا ہے کہ عسفان ایک قریہ جامعہ ہے جہاں منبر ہے اور کھجوروں کے باغات اور کھیت ہیں۔ مکہ سے ۳۶ میل کے فاصلہ پر ہے۔ اور یہ تہامہ کی آخری حد ہے" میں کہتا ہوں کہ یہ ان منازل میں سے چھٹی منزل ہے جنہیں حافظ ابن قیمؒ نے ذکر کیا ہے۔ اور بخاری کی حدیث المساجد میں چھٹی منزل عسفان کے بجائے مر الظہران مذکور ہے۔ حافظ فرماتے ہیں: میم کے فتح، راء کی تشدید ظاء کے فتح اور ہاء کے سکون کے ساتھ ہے۔ یہ وہی وادی ہے جس کو عام لوگ بطن مرو، میم، راء کے سکون کے ساتھ اور اس کے بعد واؤ، کہتے ہیں۔ البکری کہتے ہیں کہ اس کے اور مکہ کے مابین ۱۶ میل کا فاصلہ ہے۔ اور معجم میں ہے کہ مر الظہران مکہ مکرمہ سے ایک مرحلہ پر ایک جگہ کا نام ہے۔ عزیز محمد رابع لکھتے ہیں کہ مر الظہران کو آج کل وادی فاطمہ کہا جاتا ہے۔ اور یہ نام کوئی دو سو سال سے پڑا ہے۔ فاطمہ ایک مشہور تہامی خاتون کا نام ہے۔ اس جگہ اس کے باغات اور مستقل چشمے ہیں۔ یہ مکہ سے ۲۰ کلو میٹر پر واقع ہے۔

تو آپ نے فرمایا: اے ابوبکر یہ کونسی وادی ہے۔ عرض کیا: وادی عسفان! دریافت فرمانا، جیسا کہ یہاں دریافت فرمانے سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو معلوم نہیں تھا کہ یہ وادی عسفان ہے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ حضرت ابوبکر سے کہلوانا مقصود ہو۔ اور یہاں یہ سوال نہیں ہوگا کہ ایسے موقعوں پر تو صحابہ کرام کی عادت اللہ و رسولہ اعلم کہنے کی تھی۔ کیونکہ یہ عادت علمی امور میں تھی، اور یہاں ایک محسوس کی خبر ہے۔ رہا یہ سوال کہ جب آپ نے خطبہ منیٰ میں فرمایا تھا "ای بلد ھذا" یہ کونسا شہر ہے اور "ای شھر ھذا" یہ کونسا مہینہ ہے؟ باوجودیکہ یہ دونوں محسوس تھے۔ پھر صحابہ رضی اللہ عنہم نے اللہ و رسولہ اعلم کیوں کہا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس موقع پر صحابہ کرام کا اللہ و رسولہ اعلم کہنا اس بنا پر تھا کہ شاید آپ ایسی خبر دیں جس کا انہیں علم نہ ہو۔ ابی وغیرہ نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

وادی عسفان سے گزر ہوا اور حضرت ہود و حضرت صالح علیہما السلام کا تلبیہ کہتے ہوئے گزرنا

آپ نے فرمایا: اس وادی سے حضرت ہود اور حضرت صالح علیٰ نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام گزرے ہیں۔ در منثور میں ہے کہ عسفان میں حضرت

علی بکرین احمرین خطامہما اللیف یلبّون یحجّون۔

دونوں سرخ جوان اونٹوں پر سوار تھے جن کی مہاریں کھجور کی چھال کی تھیں لبیک کہتے ہوئے بیت اللہ کو جا رہے تھے

ہود اور حضرت صالح علی نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام کی خبر ہے۔ وہ دونوں دو جوان اور سرخ اونٹوں پر سوار تھے یعنی ہر ایک اپنے اپنے زمانے میں سرخ اور جوان اونٹ پر سوار تھے کیونکہ حضرت ہود کا زمانہ حضرت صالح علی نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام سے پہلے کا ہے۔ جس کی مہار خطام: بکسر خائے معجمہ و فتح طائے مہملہ، وہ رسی جو اونٹ کے منہ اور ناک میں ڈالی جاتی ہے۔ کھجور کی چھال کی تھی، یہ ان حضرات کی تواضع ہے اور یہ تواضع اور سادگی انبیاء کرام علیہم السلام کی فطری جبلت ہے۔ کذا فی المرقاۃ۔ تلبیہ کہتے ہوئے حج بیت اللہ کو جا رہے تھے۔ یہ حدیث امام احمد نے مسند میں ذکر فرمائی ہے، اور وہاں سے قسطلانی نے مواہب میں لی ہے۔

میں کہتا ہوں اس پر مذکورہ کی روایت سے اشکال ہوتا ہے جس میں ہے کہ ہر نبی نے حج کیا بجز ہود اور صالح علیہما السلام کے کیونکہ یہ دونوں اپنی قوم کی مشغولی کی وجہ سے حج نہیں کر سکے۔ جواب یہ ہو سکتا ہے کہ مذکورہ کی روایت مسند احمد کی روایت کے مقابل نہیں ہو سکتی کیونکہ سیوطی نے اس کو دو طریقوں سے ذکر کیا ہے۔ اول بیہقی نے دلائل اور ازرقی اور ابن اسحاق کے حوالے سے عروہ کا قول نقل کیا ہے۔ دوم مجاہد سے ازرقی کی روایت مرسلاً نقل کی ہے اور ہم نے کتاب حج کے آخر میں اس پر مفصل کلام کیا ہے۔ اس میں یہ ہے کہ عروہ بن زبیر کے قول پر بڑا اعتراض ہے کہ بہت سی احادیث میں آیا ہے کہ حضرت ہود اور حضرت صالح علیہما السلام نے حج کیا ہے۔ نیز ایک جماعت کا قول ہے کہ تمام انبیاء نے حج کیا۔ نیز اس میں روضۃ المحتاجین کے حاشیہ سے نقل کیا ہے کہ آپ کا یہ ارشاد کہ ہر نبی نے حج کیا، اس میں قول معتمد کے مطابق ہود اور صالح علیہما السلام بھی داخل ہیں۔ نیز اس میں ہے کہ ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ صحیح روایت سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب عسفان پہنچے تو آپ نے فرمایا: یہاں سے ہود اور صالح علیہما السلام گذرے ہیں۔ پھر یہاں انہوں نے مسند احمد کی حدیث ذکر کی ہے۔

رحلت، وههناك سأل سراقة بياناً واضحاً في الحج، وقال فلما كان بسرف

ترجمہ: (ش) اسی جگہ حضرت سراقہؓ نے آپ سے حج کے مسائل میں واضح بیان کی درخواست کی۔

(ف) پس جب کہ آپ موضع سرف پہنچے

سراقہ کی جانب سے واضح بیان کی درخواست (ش): اسی جگہ حضرت سراقہ بن مالک بن جعشم رضی اللہ عنہ نے حج کے ساتھ ان دونوں کے ادا کا
مدلجی۔ یہ مشہور صحابی ہیں۔ فتح مکہ میں اسلام لائے۔ یہ وہی صاحب ہیں جنہوں نے ہجرت مدینہ کے
راستے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا تعاقب کیا تھا۔ اس کا قصہ مشہور
ہے۔ کذا فی البذل۔ میں کہتا ہوں اس واقعہ کو امام بخاریؒ نے باب الہجرت میں ذکر کیا ہے۔ اس میں
ہے کہ سراقہ فرماتے ہیں کہ ہمارے پاس کفار قریش کے قاصد آئے۔ ان لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ
وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی گرفتاری پر سو سو اونٹ کا انعام رکھا تھا۔ یہ حدیث طویل ہے اور
اس میں سراقہ کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تعاقب کرنے ان کے گھوڑے کے دھنس جانے اور آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے امان طلب کرنے کے واقعات مذکور ہیں۔ (ت) نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے
حج کے مسائل میں واضح بیان کی درخواست کی۔ چنانچہ امام ابوداؤدؒ نے باب الاقران میں یہ الفاظ نقل
کئے ہیں کہ جب ہم عسفان پہنچے تو سراقہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہمارے لئے مسائل حج کو ایسا
بیان کر دیجئے جیسا کہ ان لوگوں کے سامنے کیا جاتا ہے جو گویا آج پیدا ہوئے۔

(ف) پس جب کہ آپ موضع سرف پہنچے۔ سرف: سین کے فتحہ اور راء کے کسرہ کے

منزل سرف: ساتھ منصرف اور غیر منصرف دونوں طرح پڑھا جاتا ہے۔ مکہ سے چھ میل یا
سترہ میل یا دس میل پر ایک جگہ کا نام ہے۔ آخری دو قول صحیح نہیں۔ کذا فی المرقاۃ۔ صاحب مجمع نے
۹ میل بھی ذکر کیا ہے۔ یہ ایک معروف جگہ ہے۔ اس مقام کے عجائب میں سے یہ ہے کہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرۃ القضاء میں اسی جگہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا۔ واپسی پر اسی
جگہ ان کی رخصتی ہوئی۔ اور جس درخت کے نیچے رخصتی ہوئی وہیں حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی تدفین
ہوئی۔ ان کی وفات صحیح قول کے مطابق تمام ازواج مطہرات کے بعد ۵۱ھ میں ہوئی۔ جیسا کہ میرے
رسالہ حکایات صحابہؓ میں ہے۔ وہاں ان کی قبر مشہور زیارت گاہ ہے۔

حائضت عائشۃ رضی اللہ عنہا

تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ماہواری شروع ہوگئی۔

تو حضرت عائشہؓ کو ماہواری شروع ہوگئی۔ طبقات سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہاں پہنچے تھے یہ واضح طور پر غلط ہے کیونکہ اس پر اجماع ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں اتوار کے روز داخل ہوئے۔ نووی نے ابن حزم سے نقل کیا ہے کہ حیض کا آغاز [illegible] بروز ہفتہ ہوا تھا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے واقعۂ حج و احرام میں علماء

حضرت عائشہؓ کے حج میں اختلاف

کا نزاع ہے کہ آیا ان کا احرام حج مفرد کا تھا یا قران کا؟ اس کی تفصیل اوجز میں ہے۔ اور اس کا خلاصہ لامع کے حاشیہ میں ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: "تو یہ جاننا چاہیے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے احرام اور کیفیتِ حج میں روایات مختلف ہیں۔ اسی بنا پر اس میں ائمہ کا اختلاف ہے جس کی تفصیل اوجز میں ہے۔ اور اس میں ہے کہ شیخ ابن قیمؒ "الہدیٰ" میں فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ کے قصہ میں علماء کا نزاع ہے کہ ان کا احرام تمتع کا تھا یا صرف حج مفرد کا؟ اور اگر تمتع کا تھا تو کیا انہوں نے عمرہ فسخ کر دیا تھا اور حج مفرد کا احرام باندھ لیا تھا یا عمرہ پر حج کا احرام باندھ کر قران کر لیا تھا؟ اور جو عمرہ انہوں نے تنعیم سے کیا وہ ان پر واجب تھا یا نہیں؟ اور حضرت عائشہؓ کے قصہ پر جو مسئلہ مبنی ہے۔ اس میں بھی علماء کا اختلاف ہوا۔ اور وہ یہ ہے کہ جب عورت نے عمرہ کا احرام باندھا ہو اور اسے حیض آجائے اور عرفات میں جانے سے پہلے طواف نہ کر سکتی ہو تو کیا اسے عمرہ کا احرام فسخ کر کے حج مفرد کا احرام باندھنا چاہیے۔ یا عمرہ پر حج کا احرام باندھ کر قران کر لے؟ چنانچہ فقہاء کوفہ جن میں امام ابو حنیفہؒ اور ان کے اصحاب بھی شامل ہیں رحمہم اللہ پہلے قول کے قائل ہیں۔ اور فقہاء حجاز جن میں امام شافعیؒ اور امام مالک رحمہم اللہ دوسرے قول کے قائل ہیں اور یہی مذہب اہل حدیث مثلاً امام احمد اور ان کے متبعین کا ہے۔"

اوجز میں حضرت عائشہؓ کے احرام کی روایات پر تفصیل سے بحث کی ہے اور اس میں ہے کہ "شیخ ابن قیمؒ فرماتے ہیں: صحیح بات جس سے عدول نہیں کیا جا سکتا یہ ہے کہ ابتداءً ان کا عمرہ کا احرام تھا۔ جیسا کہ جمہور اس کے قائل ہیں اگرچہ ان میں اختلاف ہے کہ انہوں نے عمرہ کو فسخ کر دیا تھا یا اس پر حج کا احرام باندھ کر قران کر لیا تھا۔ اوجز میں کتابوں کے حوالہ سے ہے کہ پہلا قول حنفیہ کا ہے اور دوسرا ائمہ ثلاثہ کا جیسا کہ ابھی گزر چکا۔

اور یہ اختلاف ایک دوسرے اختلاف پر مبنی ہے، وہ یہ کہ حنفیہ کے نزدیک قارن عمرہ اور حج ---

دونوں کے افعال الگ الگ اور مستقل ادا کرتا ہے۔ چونکہ حضرت عائشہؓ کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ وقت حج سے پہلے عمرہ کے افعال ادا کر سکیں لامحالہ انہیں عمرہ فسخ کر کے حج کا احرام باندھنا پڑا۔ اور ائمہ ثلاثہ فرماتے ہیں کہ عمرہ کے افعال حج کے افعال میں داخل ہو جائیں گے۔ چونکہ حج سے پہلے وہ عمرہ کے افعال ادا نہیں کر سکتی تھیں اس بنا پر ان کے لئے گنجائش تھی کہ عمرہ کے احرام پر حج کا احرام باندھ لیں۔ اور عمرہ کے افعال حج کے افعال میں داخل ہو جائیں۔

حضرت عائشہؓ نے عمرہ فسخ کر دیا تھا اس پر حنفیہ کے دلائل

حنفیہ نے اپنے اس دعویٰ پر کہ حضرت عائشہؓ نے عمرہ فسخ کر دیا تھا کئی وجہ سے استدلال کیا ہے۔ ایک یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا "اپنے عمرہ کو چھوڑ دو"۔ دوم یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا تھا "اپنا سر کھول کر کنگھی کرو" ظاہر ہے کہ احرام میں کنگھی کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ بالوں کے جھڑنے کا اندیشہ ہے۔ سوم یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا "یہ تیرا عمرہ ہے۔ اس عمرہ کی جگہ"۔ چہارم یہ کہ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا تھا "تم لوگوں نے عمرہ کر لیا میں نے نہیں کیا"۔ پنجم یہ کہ حضرت عائشہؓ فرماتی تھیں "تم تو حج و عمرہ کر کے واپس جاؤ اور میں صرف حج سے کر جاؤں"۔ اور مستخرج کے لفظ جیسا کہ فتح الباری میں ہے یہ ہیں: "اور میں صرف حج سے کر جاؤں جس کے ساتھ عمرہ نہ ہو"۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں نہ فرمایا کہ "عائشہ تم بھی میری شامل ہو" کیونکہ آپ بھی قارن تھے۔ اور بقول ائمہ ثلاثہ کے حضرت عائشہؓ نے بھی آپ کی طرح قران کیا تھا پھر حضرت عائشہؓ نے کیوں فرمایا کہ تم حج و عمرہ لے کر جاؤ اور میں صرف حج سے کر جاؤں؟ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں نہ فرمایا کہ جس طرح میرا قران ہے اسی طرح تیرا بھی قران ہے۔ علاوہ ازیں بہت سی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے عمرہ فسخ کر دیا تھا۔ ان روایات کی تفصیل اوجز میں ہے۔ لامع الدراری میں ائمہ ثلاثہ کے دلائل کے جوابات پر مختصر مگر بہت عمدہ کلام کیا ہے۔

حضرت عائشہؓ کے عمرہ تنعیم میں چار مسالک

پھر شیخ ابن قیمؒ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے تنعیم سے جو عمرہ کیا تھا اس میں چار مسالک ہیں۔ اول یہ کہ محض ان کی دلجوئی کے لئے تھا۔ یہ امام شافعی اور امام احمد کا قول ہے۔ دوم یہ کہ یہ فسخ شدہ عمرہ کی قضا تھی۔ یہ حنفیہ کا مسلک ہے۔ سوم یہ کہ جب انہوں نے قران کر لیا تو ایک مستقل عمرہ کا ادا کرنا ضروری تھا کیونکہ

(قال) اما موضع حيضها فهو بسرف بلا ريب۔ واختلف في موضع طهرها

ترجمہ: (ق) ان کے حیض کی جگہ تو بلاشبہ موضع سرف تھی۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ کب پاک ہوئیں۔

قران کا عمرہ، عمرۃ الاسلام کی جگہ کافی نہیں ہوتا۔ یہ امام احمدؒ سے ایک روایت ہے۔ چہارم یہ کہ حضرت
عائشہ رضی اللہ عنہا نے شروع ہی سے حج مفرد کا احرام باندھا تھا۔ اور وہ اسی احرام پر قائم رہیں،
اس لئے یہ عمرہ، عمرۃ الاسلام تھا۔ یہ قاضی اسماعیل وغیرہ مالکیہ کی رائے ہے۔ اور یہ سب ضعیف قول ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احرام کی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے احرام کی
تعیین بھی خاصہ مشکل مسئلہ ہے۔ زرقانی نے شرح موطا میں ان کی پیروی کرتے ہوئے نیز حافظ نے
فتح میں اور قاضی عیاضؒ، نوویؒ اور ابن قیمؒ نے اس پر بحث کی ہے۔ امام محمدؒ موطا میں فرماتے ہیں اگر
عائشہؓ نے عمرہ کا احرام باندھ رکھا ہو اور فوت حج کا اندیشہ ہو تو اسے چاہئے کہ عمرہ فسخ کردے، حج کا احرام
باندھ کر وقوف عرفہ کرے اور اس عمرہ کی قضا کرے جس طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کیا الخ۔"

ف: ان کے طہر کی جگہ میں اختلاف

(ق) ان کے حیض کے آغاز کی جگہ تو بلاشبہ موضع سرف ہی تھی۔ میں
کہتا ہوں کہ حضرت عائشہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے باوجودیکہ شکایت
موضع سرف میں کی تھی، جیسا کہ شیخ ابن قیمؒ نے اس پر جزم کیا ہے۔ یا یوم النحر میں؛ جیسا کہ حضرت جابر
رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث کا مقتضیٰ ہے اور اسی طرف زرقانی کا میلان ہے۔ یا کسی اور دن؛ جیسا کہ
اوجز میں مفصل ذکر کیا ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ وہ کہاں اور کب پاک ہوئیں؟ چنانچہ بعض کا قول
ہے کہ عرفہ کے دن، اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ان کو اسی حالت میں عرفہ لایا گیا تھا۔
اور قاسم نے ذکر کیا ہے کہ یوم النحر تھا؛ جیسا کہ الہدی میں ہے۔ اسی طرح نووی نے ابن حزم سے
نقل کیا ہے کہ ان کا طہر یوم النحر کو بروز ہفتہ ہوا تھا۔ حافظؒ نے مختلف روایتوں میں تطبیق اس طرح دی
ہے کہ عرفہ میں انہوں نے طہر دیکھا لیکن منیٰ آنے سے پہلے غسل کا موقع نہ ہوا۔ یا یہ کہ خون عرفہ میں منقطع
ہو چکا تھا، مگر طہر منیٰ میں آکر دیکھا۔ اور یہ توجیہ زیادہ مناسب ہے۔ اور شیخ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ ابوداؤدؒ
کی ایک روایت میں ہے کہ وہ بطحاء کی رات پاک ہوئیں۔ اور اس کی سند صحیح ہے۔ لیکن ابن حزمؒ
نے کہا ہے کہ یہ منکر ہے۔ میرے نزدیک ظاہر یہ ہے کہ اس میں ناقل سے تصحیف ہوئی ہے۔ یہ صحیح

وقال لاصحابه من لم يكن معه هدي فاحب ان يجعلها عمرة فليفعل و
من كان معه هدي فلا

ترجمہ: اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہؓ سے فرمایا: جس کے ساتھ ہدی کے جانور نہیں ہیں وہ اس کو عمرہ بنانا چاہتا ہے تو بنا لے اور جس کے ساتھ ہدی ہے وہ نہیں۔

ذو الحجہ کے آغاز کے ساتھ ہے یعنی پہلی رات کی بات تھی ان دنوں حضرت عائشہؓ ایک موقع پر تھیں۔ چنانچہ بیہقی کی ایک روایت میں یہ لفظ ہیں: فلما کنا بسرف حاضت و حضرت عائشہ قالت یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

موضع سرف میں صحابہ کرام کو فسخ حج کا اختیار دینا

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے موضع سرف میں اپنے صحابہؓ سے فرمایا: جس کے ساتھ ہدی کے جانور نہیں ہیں وہ اگر اس کو عمرہ بنانا چاہتا ہے تو بنا لے اور جس کے ساتھ ہدی ہے وہ نہیں۔ کذا فی مسلم اور صحیحین کی روایت میں بھی اسی طرح ہے۔ اور سیرت ابن ہشام کے الفاظ ہیں: آپ جب موضع سرف پہنچے تو لوگوں کو حکم فرمایا کہ وہ عمرہ کر کے احرام کھول دیں سوائے ان لوگوں کے جن کے ساتھ ہدی کے جانور ہیں۔ یہ تخییر جو یہاں اس مقام پر تھی اس تخییر سے جو میقات میں دی گئی کیونکہ میقات کی تخییر میں تو احرام کی تینوں صورتوں میں کسی ایک صورت اختیار کی جا سکتی ہے۔ مگر یہاں فسخ حج کر کے عمرہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ بعد ازاں مکہ پہنچ کر فسخ حج کا قطعی حکم فرمایا جیسا کہ آگے آتا ہے۔

حج کا احرام فسخ کرکے عمرہ بنالینے کا حکم

یہاں شیخ ابن قیم نے اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی ہے کہ حج کو فسخ کر کے عمرہ بنا لینا قیامت تک کیلئے جائز ہے اور اس کے منسوخ نہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے اس کے دلائل دیئے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس مسئلہ کے ذکر کا یہ موقع نہیں تھا۔ اس کا موقع تو وہ تھا جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ پہنچ کر فسخ حج کا حکم فرمایا تھا۔ اور حضرت سراقہؓ نے آپ سے اس کے بارے میں سوال کیا تھا۔ مگر مصنف شیخ ابن قیم نے یہ مسئلہ چونکہ یہاں چھیڑا ہے اس لئے ان کی متابعت میں میں بھی اس کو یہیں ذکر کرتا ہوں۔ لامع کے حاشیہ میں باب من اہل فی زمن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذیل میں اوجز سے نقل کیا ہے کہ امام نووی فرماتے ہیں کہ اس فسخ میں علماء کا اختلاف ہے کہ آیا یہ صحابہ کرامؓ کے ساتھ اسی سال کیلئے مخصوص تھا یا ان کے لئے

اور دوسروں کے لئے قیامت تک باقی ہے؟ امام احمد اور اہل ظاہر کے ایک گروہ نے دوسرے قول کو لیا ہے۔ اور امام مالکؒ۔ امام شافعیؒ، امام ابوحنیفہؒ اور جمہور سلف و خلف نے پہلا قول اختیار کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ صحابہؓ کے ساتھ اسی سال کے لئے مخصوص تھا۔ جاہلیت میں خیال کیا جاتا تھا کہ حج کے مہینوں میں عمرہ حرام ہے۔ جاہلیت کے اس خیال باطل کی تردید کے لئے صحابہ کرام کو فسخ حج کا حکم فرمایا۔ جمہور کی دلیل مسلم شریف میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ متعہ فی الحج صرف اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص تھا یعنی حج کو فسخ کرکے عمرہ بنا لینا۔ اور نسائی میں ہے کہ حارث بن بلال اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ۔ فسخ حج صرف ہمارے لئے خاص ہے یا سب لوگوں کیلئے عام ہے؟ آپ نے فرمایا: نہیں بلکہ ہمارے لئے خاص ہے۔ اور حدیث سراقہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک ابدِ ابد کا مطلب یہ ہے کہ اشہر حج میں عمرہ جائز ہے۔

ابن رشد فرماتے ہیں کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ ہمارے بعد کسی کے لئے جائز نہیں کہ وہ حج کا احرام باندھ کر اسے فسخ کر دے اور اسے عمرہ میں تبدیل کر دے۔ انتہی مختصراً۔ حضرت سراقہ کی اس حدیث پر مزید تنقیح میں کچھ مفصل بحث ہوگی۔ نیز حاشیہ صحیح میں باب عمرۃ التنعیم کے ذیل میں بھی حدیث سراقہ کا جواب دیا گیا ہے۔ اور زرقانی نے بھی شرح مواہب میں اس پر خوب مفصل کلام کیا ہے۔ میں کہتا ہوں۔ حنفیہ پر خصوصیت سے یہ اشکال ہوتا ہے کہ حج کے احرام کو فسخ کرکے عمرہ میں تبدیل کرنے سے جو مقصود تھا وہ ان کے مذہب کے مطابق یوں بھی حاصل ہو سکتا ہے کہ حج پر عمرہ کے احرام کا اضافہ کرکے قران کر لیا جائے۔ دوسرے ائمہ پر یہ اشکال نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ان کے نزدیک حج کے احرام پر عمرہ کا اضافہ صحیح نہیں۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احرام کے ذیل میں یہ بحث گذر چکی ہے۔ حنفیہ کی طرف سے یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ فسخ الی العمرہ سے مقصود جاہلیت کو باطل کرنا اور اس پر شدید رد و نکیر کرنا تھا۔ ورنہ نفس جواز تو یوں ہی سے ثابت تھا کہ بعض صحابہ کرامؓ نے میقات سے صرف عمرہ کا احرام باندھا اور اس سے بھی واضح تر یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سے پہلے تینوں عمرے زمانہ حج ہی میں ہوئے تھے۔ مگر اس کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فسخ حج کا حکم فرمایا تا کہ جاہلیت کے رواج کا پوری طرح قلع قمع ہو جائے۔

(وقال ثم نهض الى ان نزل بذی طوی - فبات بها الليلة الاحد لاربع خلون من
ذی الحجة وصلی بها الصبح ثم اغتسل من يومه -

ترجمہ - (ور) پھر آپ چلے یہاں تک کہ ذی طوی میں نزول فرمایا پس وہاں رات کو قیام فرمایا۔ یہ چار ذی الحجہ
اتوار کی رات تھی۔ اور وہاں نماز صبح ادا کی۔ پھر اسی دن غسل فرمایا۔

ذی طوی میں آپ کا غسل کرنا اور مکہ مکرمہ میں داخلہ کی تفصیل

(ق) پھر آپ چلے یہاں تک کہ ذی طوی میں نزول فرمایا۔
یہ منزل بخاری شریف کی حدیث مساجد میں بھی مذکور ہے۔ اور
اب "آبار زاہر" کے نام سے معروف ہے۔ کذا فی المہدی۔ اس
کے ضبط میں چند اقوال ہیں جو فتح میں مفصل مذکور ہیں۔ لامع کے حاشیہ میں ہے کہ اس امر میں بھی
اختلاف ہے کہ ذی طوی محصب، ابطح، بطحاء اور خیف بنی کنانہ یہ سب ایک ہی جگہ کے
نام ہیں یا متعدد مقامات کے؟ نیز اس میں ہے کہ ذی طوی اسفل مکہ میں عمرہ کے مقابل دو ستر
کی جانب ایک جگہ ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ یہ مکہ اور تنعیم کے مابین ہے اھ۔ امام بخاری رحمۃ اللہ
علیہ نے الجامع الصحیح میں "النزول بذی طوی" کا باب باندھا ہے۔ اور حاشیہ بخاری میں ہے کہ "طوی"
طا کی تینوں حرکتوں کے ساتھ ایک جگہ ہے جو باب مکہ کے پاس ہے۔ منصرف بھی ہے اور غیر منصرف
بھی۔ کذا فی المجمع۔ ملا علی قاری شرح مؤطا میں فرماتے ہیں: یہ تنعیم کے راستہ میں ایک وادی ہے جہاں
امیر الحج کا قیام ہوتا ہے۔ اور المؤطا کے حاشیہ میں ہے کہ اسفل جانب ایک جگہ ہے۔ نیز یہاں دونوں
گھاٹیوں کے درمیان رات کو قیام فرمایا۔ کما فی المواہب۔ اور بخاری کی حدیث المساجد کے الفاظ یہ ہیں:
"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ذی طوی میں نزول فرماتے تھے اور وہاں صبح تک قیام کرتے تھے۔ اور
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز گاہ ایک بڑے ٹیلے پر ہے۔ وہاں جو مسجد بنی ہے اس میں نہیں۔ بلکہ اس
سے نیچے ہے۔" یہ چار ذو الحجہ اتوار کی رات تھی۔ اور یہ ترجیح بلا ریب ہے۔ اور وہاں نماز صبح ادا کی۔ پھر اسی دن غسل
فرمایا۔ اور اوجز میں بروایت بخاری ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے کہ یہاں تک کہ جب وہ ابن عمر
ذی طوی آتے تو صبح تک وہاں رات بسر کرتے۔ پھر جب صبح کی نماز پڑھ لیتے تو غسل کرتے اور فرماتے تھے
کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ یہ غسل مالکیہ کے نزدیک طواف کیلئے ہے۔ اسی لئے حائضہ
نہیں کرے گی۔ اور شافعیہ کے نزدیک دخول مکہ کیلئے ہے۔ جیسا کہ اوجز میں ان کی فقہی کتابوں سے

ونهض الى مكة زقلت، ماءٌ على وادي الازرق فقال كاني انظر الى موسى

ترجمہ: اور مکہ کی طرف چلے (رش) وادی ازرق سے گزرتے ہوئے اور فرمایا: گویا میں موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ رہا ہوں۔

بالتفصیل نقل کیا ہے۔ اسی طرح حاشیہ کوکب میں ہے۔ اور یہ غسل دخول مکہ کیلئے مستحب ہے۔ ابن منذر فرماتے ہیں کہ دخول مکہ کے وقت غسل کرنا تمام علماء کرام کے نزدیک مستحب ہے۔ اور ان کے نزدیک اس کے ترک سے فدیہ نہیں۔ اور اکثر علماء نے کہا ہے کہ اس کی بجائے وضو بھی کافی ہے۔ کذا فی الفتح۔

ارشاد نبوی: گویا میں موسیٰ کو دیکھ رہا ہوں

اور مکہ کی طرف چلے رش وادی ازرق سے گزرتے ہوئے۔ جو مکہ سے ایک میل ہے۔ حافظ فرماتے ہیں: یہ امج سے پیچھے ہے۔ اور امج: ہمزہ اور میم کے فتحہ اور جیم کے ساتھ۔ وہاں ایک کھیتوں والی بستی ہے۔ آپ نے فرمایا گویا میں موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ رہا ہوں۔ کما فی المواہب۔ یہ مسلم شریف کے الفاظ ہیں۔ اور بخاری میں بھی تقریباً یہی مضمون ہے (یعنی: اما موسیٰ فکانی انظر الیہ اذا انحدر فی الوادی یلبی) حافظ فرماتے ہیں کہ مہلب نے کہا ہے کہ اس روایت میں موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کسی راوی کا وہم ہے۔ کیونکہ کسی روایت میں یہ نہیں آیا کہ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام زندہ ہیں اور یہ کہ وہ حج کریں گے البتہ یہ مضمون عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں وارد ہوا ہے اس لئے راوی کو اشتباہ ہو گیا۔ حافظ فرماتے ہیں: یہ ثقہ راویوں کی روایت کو محض وہم کی بنا پر غلط ٹھہرانا ہے۔ اسی مذکورہ سند سے یہ روایت کتاب اللباس میں آ رہی ہے جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام کا اضافہ ہے۔ کیا یہاں بھی یہی کہا جائیگا کہ راوی نے غلطی سے اس نام کا اضافہ کر دیا؟ اور امام مسلم نے یہ حدیث بطریق ابوالعالیہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے جس میں موسیٰ علیہ السلام کے علاوہ حضرت یونس علیہ السلام کا بھی ذکر ہے۔ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ دوسرے راوی نے غلطی سے یونس علیہ السلام کے نام کا اضافہ کر دیا؟ اور اہل تحقیق نے ارشاد نبوی "گویا میں موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ رہا ہوں" کی مختلف توجیہات کی ہیں۔ اول یہ کہ یہ ارشاد حقیقت پر محمول ہے۔ انبیاء علیہم السلام اپنے رب کے پاس زندہ ہیں اور انہیں رزق دیا جاتا ہے۔ لہٰذا کوئی مانع نہیں کہ وہ اس حالت میں حج بھی کرتے ہوں۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے موسیٰ کو دیکھا کہ وہ اپنی قبر میں کھڑے نماز پڑھ رہے ہیں۔ مگر اس توجیہ کا تقاضہ یہ ہے کہ کہا جائے کہ آپ

قولہ جؤار الی اللہ بالتلبیۃ و قال: فدخل نہارًا

ترجمہ: دراںحالیکہ وہ تلبیہ کہتے ہوئے بلند آواز سے اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑا رہے ہیں۔

(دق) پس آپ مکہ میں دن کو داخل ہوئے

کہ انبیاء علیہم السلام کی اس طرح کا مشاہدہ ہوا۔ غالبًا وہ دنیا میں آپ کے سامنے اسی طرح متمثل ہوئی ہوں گی جس طرح شب معراج میں ہوئی تھیں۔ مگر ان کے اجسام قبروں میں تھے۔ دوم یہ کہ ان حضرات کے دنیوی حالات آپ کے سامنے متمثل ہوئے یعنی دنیا میں جس طرح انہوں نے عبادت کی تھی حج کیا تھا، تلبیہ پڑھا تھا۔ اس کا کشف آپ کو ہوا اسی وجہ سے آپ نے فرمایا: "گویا میں دیکھ رہا ہوں"۔ سوم یہ کہ بذریعہ وحی آپ کو ان امور کی اطلاع دی گئی اور وحی کی قطعیت کی بنا پر فرمایا: "گویا میں دیکھ رہا ہوں"۔ چہارم یہ کہ یہ رؤیت منامیہ آپ کو کسی گزشتہ خواب میں ہوئی ہوگی۔ پھر جب آپ نے حج کیا تو وہ خواب کا قصہ یاد آیا اور اس کا تذکرہ آپ نے فرمایا۔ ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا خواب بھی وحی ہوتا ہے۔ میرے نزدیک یہی توجیہ معتمد ہے۔ حافظ کا کلام مختصرًا ختم ہوا۔ یہ توجیہات نووی نے شرح مسلم میں قاضی عیاض سے بھی نقل کی ہیں۔

دراںحالیکہ وہ تلبیہ کہتے ہوئے بلند آواز سے اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑا رہے ہیں۔ زرقانی کہتے ہیں: "جؤار" بضم جیم اور ہمزہ مفتوحہ ممدودہ اور ... کے ساتھ یعنی بلند آواز سے۔ ابو نعیم کہتے ہیں جؤار ایسی آواز کو کہتے ہیں جس میں فریاد طلبی اور گڑگڑانا پایا جائے۔ اور بخاری کی حدیث مساجد میں ذی طویٰ میں رات کے قیام کے بعد مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پہاڑ کے دو کونوں کی طرف رخ کیا جو آپ کے اور طویل پہاڑ کے درمیان کعبہ کی جانب تھا پس اس مسجد کو جو وہاں بنائی گئی ہے اس مسجد کے جو ٹیلے کے کنارے پر ہے بائیں جانب کیا۔

مکہ میں دن کو داخل ہونا بہتر ہے یا رات کو؟

پس آپ مکہ میں دن کو داخل ہوئے۔ جمہور کے نزدیک اولیٰ یہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں دن کے وقت داخل ہو۔ اور اس میں چار مذاہب جو اوجز میں دو جگہ یعنی باب غسل المحرم اور باب الطواف میں ذکر کئے ہیں۔ اس میں یہ ہے کہ امام مالکؒ اور حنفیہ کے نزدیک مکہ میں دن کو داخل ہونا مستحب ہے۔ شافعیہ سے بھی یہی صحیح روایت ہے۔ اور دوسری روایت یہ ہے کہ دن رات برابر ہیں۔ علامہ موفق اسی طرف مائل ہیں۔

(قلت: وهل رفع يديه الكريمتين لما)

ترجمہ: اور جب بیت اللہ شریف پر آنحضرت صلی اللہ

یہ جس میں یہ ہے کہ آپ کداء یعنی اعلیٰ مکہ سے داخل ہوئے تھے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس
سے معلوم ہوا کہ مکہ میں ثنیہ علیا راستے سے داخل ہونا مستحب ہے۔ اور خروج بائیں جانب سے بہتر ہے۔ حج
وغیرہ کرنے والے اس میں یکساں ہیں۔ تمام تفصیل ذیل میں ہے۔

آپ کس رات مکہ میں داخل ہوئے

شیخ ابن قیم فرماتے ہیں جن لوگوں نے کہا کہ آپ رات کو مکہ میں
داخل ہوئے یہ ان کا وہم ہے۔ طبری نے یہ قول نقل کیا ہے۔ اور
میں کہتا ہوں کہ ابن سعد کی جو روایت ابھی گذری کہ حضرت عائشہؓ مقام سرف میں ہفتہ کے دن حائضہ
ہوئیں اس کا مقتضیٰ بھی یہی ہے لہٰذا یہ بھی صریح غلط ہے جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے کیونکہ تمام روایات
اس پر متفق ہیں کہ آپ مکہ میں ذی الحجہ کی چوتھی تاریخ داخل ہوئے۔ منجملہ ان کے بخاری کی وہ
حدیث ہے جو بروایت کریب عن ابن عباسؓ مروی ہے۔ اس میں تصریح ہے کہ پس آپ مکہ میں تشریف
لائے جب کہ ذی الحجہ کی چار راتیں گذر چکی تھیں۔ نیز بخاری میں ابن طاؤس عن ابیہ کی سند سے ابن
عباسؓ کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں: آپ صبح ذی الحجہ کی چوتھی صبح کو حج کا تلبیہ پڑھتے ہوئے تشریف لائے۔
یہ روایت امام مسلم نے بھی ذکر کی ہے۔ اور نسائی میں بطریق ابی العالیہ ابن عباسؓ کی روایت کے
الفاظ یہ ہیں: جب کہ ذی الحجہ کی چار راتیں گذر چکی تھیں۔ نیز اسی میں حضرت جابرؓ کی حدیث میں ہے:
آپ مکہ میں ذی الحجہ کی چوتھی رات کی صبح کو تشریف لائے۔ حضرت جابرؓ کی یہ حدیث ابو داؤد نے بھی
دو طریقوں سے روایت کی ہے اور صاحب مشکوٰۃ نے بروایت مسلم اس کو ذکر کیا ہے۔ اور امام
بخاری نے بھی احکام میں اس کو روایت کیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسفل مکہ سے نکلنے
کے بیان میں آئے گا کہ آپ کس سے داخل ہوتے اور نکلنے کے راستے کس مقصد کے لئے تبدیل فرماتے۔
نیز اس کا کچھ حصہ اس بحث میں آئے گا کہ آپ عرفات کو ضب کے راستے سے تشریف لے گئے۔ اور
مأزمین کے راستے سے مراجعت فرمائی۔

بیت اللہ کو دیکھنے کے وقت ہاتھ اٹھانا

متن: اور جب بیت اللہ شریف پر [illegible]

وقع بصره على البيت باختلف فيه الروايات، قال ثم سار حتى دخل المسجد

ترجمہ: سلم کی نظر پڑی تو آپ نے ہاتھ مبارک (اٹھائے یا نہیں؟ اس میں) روایات مختلف ہیں) پھر آپ چلے یہاں تک کہ مسجد میں داخل ہوئے

بیت اللہ کی نظر پڑی تو آپ نے ہاتھ مبارک اٹھائے یا نہیں؟ اس مسئلہ میں روایات مختلف ہیں، جن کی تفصیل بذل المجہود اور اوجز المسالک میں ہے۔ یہ رفع یدین ائمہ ثلاثہ کے نزدیک مستحب ہے، امام مالک کے نزدیک مکروہ ہے۔ عجیب بات ہے کہ ملا علی قاری نے شرح مشکوٰۃ میں رفع کو اور شرح لباب میں عدم رفع کو ترجیح دی ہے۔ مختلف روایات میں تطبیق شیخ نے بذل میں ملا علی قاری سے اس طرح نقل کی ہے کہ اثبات کو اول روئیت پر اور نفی کو ہر مرتبہ کی روئیت پر محمول کیا جائے۔ شیخ قدس سرہ فرماتے ہیں: یہ تطبیق بھی ممکن ہے کہ اثبات کی روایت سے مراد یہ ہے کہ دعا کے لئے دونوں ہاتھ پھیلا کر اوپر سینے تک اٹھایا، اور نفی کی روایت سے مراد یہ ہے کہ جس طرح تحریمہ میں کانوں تک ہاتھ اٹھائے جاتے ہیں اس طرح تعظیم بیت اللہ کی خاطر نہیں اٹھائے۔

(ثم) پھر آپ چلے یہاں تک کہ مسجد میں (باب السلام سے) داخل ہوئے۔ مشکوٰۃ میں بحوالہ صحیحین حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ آپ جب مکہ میں تشریف لائے تو آپ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ وضو فرمایا۔ ملا علی قاری فرماتے ہیں: یعنی وضو کی تجدید کی، کیونکہ پہلے تو ذی طویٰ میں آپ دخول مکہ کے لئے غسل فرما چکے تھے۔ یا معنی لغوی مراد ہیں۔ امام بخاریؒ نے اس پر الطواف علی وضوء کا باب باندھا ہے۔ گویا امام بخاریؒ کے نزدیک حدیث کا محمل یہ ہے کہ آپ نے طواف کی خاطر وضو فرمایا تھا۔

طواف کے لئے طہارت کا حکم

طواف کے لئے طہارت ضروری ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ موفق کہتے ہیں: امام احمد کی مشہور روایت یہ ہے کہ طواف کے لئے حدث اور نجاست سے پاک ہونا شرط ہے۔ یہی امام مالکؒ اور شافعیؒ کا قول ہے۔ اور امام احمدؒ کی ایک روایت میں طہارت شرط نہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے کہ طہارت شرط نہیں۔ ان کے اصحاب میں اختلاف ہے، بعض کے نزدیک واجب ہے اور بعض کے نزدیک سنت۔ موفقؒ اور صاحب لباب نے حدث سے پاک ہونے کو مطلق طواف کے واجبات میں شمار کیا ہے۔

وذالک ضحی واستقبل ودعا۔ فلما دخل عمد الی البیت ولم یرکع تحیۃ المسجد فلما حاذی الحجر الاسود استلمہ۔

ترجمہ: اور یہ چاشت کا وقت تھا اور آپ نے بیت اللہ کا استقبال کیا اور دعا فرمائی پس داخل ہوتے ہی بیت اللہ کا قصد کیا اور تحیۃ المسجد نہیں پڑھی اور جب حجر اسود کے سامنے آئے تو اس کا استلام کیا۔

باب السلام کی جانب سے مسجد میں داخل ہوا ملا علی قاری نے ذکر کیا ہے اور البحر العمیق میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باب بنی شیبہ سے داخل ہوئے۔ شیخ فرماتے ہیں کہ یہ دونوں ایک ہیں۔ اور مراقی میں ہے کہ طبرانی نے ذکر کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنی عبد مناف کے دروازے سے داخل ہوئے۔ جسے آجکل باب بنی شیبہ یا باب السلام کہا جاتا ہے۔ اور یہ چاشت کا وقت تھا۔ اور آپ نے بیت اللہ کا استقبال کیا۔ اور دعا فرمائی۔ اور طبرانی نے ذکر کیا ہے کہ آنحضرت صلعم جب بیت اللہ کو دیکھتے تو یہ دعا پڑھتے تھے۔

اللھم زد بیتک ھذا تشریفا وتعظیما وتکریما ومھابۃ۔ — اے اللہ! تیرے اس گھر کی شرافت وعظمت اور تکریم وہیبت میں اضافہ فرما۔

بیت اللہ کو دیکھ کر پڑھنے کی مختلف دعائیں روایات میں آئی ہیں جیسا کہ البدایہ والنہایہ وغیرہ میں مذکور ہیں۔

مسجد حرام میں تحیۃ المسجد کا حکم

پس داخل ہوتے ہی بیت اللہ کا قصد کیا اور تحیۃ المسجد نہیں پڑھی کیونکہ کعبہ کا سلام طواف ہے۔ جیسا کہ العینی اور بدائع میں ہے۔ موفق فرماتے ہیں۔ جو شخص مسجد حرام میں داخل ہو اس کے لئے مستحب ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا کرتے ہوئے طواف سے ابتدا کرے جیسا کہ حضرت جابرؓ اور حضرت عائشہؓ کی روایت میں ہے۔ اور یہی حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ وغیرہ سے بھی منقول ہے۔ اور اس لئے کہ طواف مسجد حرام کا سلام ہے۔ پس جس طرح دوسری مساجد میں داخل ہو کر سب سے پہلے تحیۃ المسجد پڑھنا مستحب ہے اسی طرح یہاں طواف مستحب ہے۔

اور جب حجر اسود کے سامنے آئے تو اس کا استلام کیا

حجر اسود کا استلام اور اس کے آداب

اور اسے بوسہ دیا۔ استلام کے معنی ہیں ہاتھ سے چھونا اور حجر اسود کو بوسہ دینے کی روایات البدایہ والنہایہ میں مذکور ہیں اور ایک روایت میں سجدے کا بھی ذکر ہے اوجز میں اس پر بڑی مفصل بحث کرتے ہوئے آخر میں لکھا ہے کہ اس تمام بحث سے معلوم ہوا کہ یہاں چند مسائل میں اختلاف ہوا ہے۔ اول یہ کہ جمہور علماء کے نزدیک استلام ہی طواف واجب یا نفل کے ابتدا

فرض نہیں کرتے۔ مالکیہ کی ایک جماعت بھی اسی کی قائل ہے۔ مگر المدونہ میں اسے طواف واجب کے
ساتھ مخصوص کیا ہے۔ دوم تقبیل بالصوت یعنی اس طرح بوسہ لینا کہ اس کی آواز آئے اس کے جواز
وعدم جواز میں اختلاف ہے۔ بہت سے مالکیہ کے نزدیک یہ مباح ہے اور جمہور علماء کے نزدیک
نہیں۔ سوم حجر اسود پر سجدہ کرنا امام مالکؒ کے نزدیک مکروہ اور امام شافعیؒ کے نزدیک مستحب ہے
حنفیہ کے اقوال اس میں مختلف ہیں۔ راجح یہ ہے کہ مندوب ہے۔ چہارم ہاتھ وغیرہ سے حجر اسود کا استلام
کرنے کے بعد اس کا چومنا ائمہ ثلاثہ کے نزدیک مندوب ہے۔ اور امام مالک کے نزدیک مندوب
نہیں بلکہ بغیر تقبیل کے ہاتھ چھوڑ دے۔ پنجم: اگر استلام ممکن نہ ہو تو امام مالکؒ کے نزدیک بغیر
اشارے کے تکبیر کہے اور امام احمدؒ کے نزدیک صرف اشارہ کرے مگر جس چیز سے اشارہ کیا ہے
اسے چومے نہیں۔ اور امام شافعیؒ اور حنفیہ کے نزدیک اس چیز کو چومے۔ اھ

شیخ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: استلام کے وقت ہاتھ نہ اٹھائے نہ اسے تکبیر کے ساتھ شروع کرے
جیسا کہ نماز کیلئے تکبیر کہی جاتی ہے۔ بلکہ ایسا کرنا بدعت ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بدعت نہیں بلکہ تکبیر
جمہور علماء کے نزدیک ثابت ہے۔ بلکہ بالاجماع ثابت ہے۔ اور تقبیل کے وقت ہاتھ اٹھانا حنفیہ
اور بعض شافعیہ کے نزدیک ثابت ہے۔ چنانچہ ہدایہ میں ہے: پھر حجر اسود سے ابتداء کرے پس اس کا
استقبال کرے اور تکبیر و تہلیل کہے۔ کیونکہ روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں داخل
ہوئے تو حجر اسود سے ابتداء کی پس اس کا استقبال کیا اور تکبیر و تہلیل کہی۔ اور اپنے ہاتھوں کو اٹھائے
کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ صرف سات موقعوں پر ہاتھ اٹھائے جاتے ہیں۔ من
جملہ ان کے استلام کو ذکر فرمایا۔ اور منحۃ الخالق (مطبوعہ طبع ۱۳۱۲ھ) میں ہے کہ استلام کے وقت
ہاتھ اٹھانا ائمہ ثلاثہ کے نزدیک سنت ہے۔ البتہ امام مالکؒ کے نزدیک مستحب نہیں۔ اھ اور المدونہ سے بھی
یہی ظاہر ہوتا ہے۔ علامہ زرقانی شرح مواہب میں لکھتے ہیں: امام شافعیؒ، حنابلہ اور ابن حبیب
مالکی کے نزدیک یہ مستحب ہے کہ ابتدائے طواف اور استلام حجر کے وقت یہ دعا پڑھے: بسم اللہ واللہ
اکبر الخ۔ دمیاطی مجددی وغیرہ نے نقل کی ہے۔ اور وہ تردید فرماتے ہیں کہ تقبیل کے ساتھ تکبیر کہنا معتمد ہے۔ مگر
وہ ہدایہ شارح اقناع نے دعا بیہ کا ذکر نہیں کیا۔ اور نووی اپنے مناسک میں فرماتے ہیں: استلام
حجر سے پہلے نیز طواف شروع کرتے وقت بسم اللہ واللہ اکبر کہنا مستحب ہے۔ اھ ابن حجر اس کے حاشیہ

ورمل فی طوافہ ھذا۔

ترجمہ: اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طواف میں رَمَل کیا۔

میں لکھتے ہیں: "محب طبری نے کہا ہے کہ طواف کو تکبیر سے شروع کرنا واجب ہے۔ بعض لوگوں نے اس کی پیروی کی ہے۔ مگر یہ قول ضعیف ہے۔ غالباً انہوں نے یہ قول دلیل کی وجہ سے اختیار کیا ہے۔ اور شیخ ابو حامد کا یہ قول بھی کہ ابتدائے طواف میں نماز کی طرح کندھوں تک ہاتھ اٹھانا مستحب ہے ضعیف ہے۔ مگر یہ قول نقل کے اعتبار سے ضعیف ہے دلیل کے اعتبار سے ضعیف نہیں۔ اگرچہ ابن جماعہ نے اسے بدعات کہا ہے۔ کیونکہ مذاہب اربعہ اس پر متفق ہیں کہ استقبال حجر کے وقت ہاتھ اٹھانا احناف کے نزدیک اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ سلف کی ایک جماعت سے یہ عمل ثابت ہے۔ اور ابو داؤد الطیالسی نے اس سلسلہ میں ایک حدیث بھی نقل کی ہے اور ان کا طواف کو نماز پر قیاس کرنا اس کے شروط اور اکثر سنن میں اس کا مؤید ہے۔" اھ

رَمَل کا حکم

اور آپ نے اس طواف کے پہلے تین چکروں میں رمل کیا۔ الھدیہ والنہایہ نے اس مسئلہ کی روایات کی تفصیل سے ذکر کی ہیں۔ اور رمل کے مسئلہ پر اور جزئیات ہیں جو میرے حاشیہ ذیل میں صاف تفصیل ذکر کی گئی ہیں۔

اوّل: اس کے ضبط اور معنی میں پس رَمَل ، راء اور میم کے فتحہ کے ساتھ اور بقول بعض میم کے سکون کے ساتھ ہے کے معنی یہ ہیں کہ چھوٹے چھوٹے قدم رکھ کر کندھے ہلاتے ہوئے تیز تیز چلنا مگر دوڑے نہیں۔ اس کی تفسیر میں علماء کا اختلاف البحر العمیق میں تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔

دوم: اس کی مشروعیت میں جمہور کے نزدیک مشروع ہے۔ البتہ ابن عباسؓ سے اس کے خلاف منقول ہے۔ علامہ سندھی فرماتے ہیں کہ ابن عباسؓ کا مذہب یہ ہے کہ یہ سنت نہیں۔ مگر دیگر علماء اسے سنت قرار دیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ امام ابو داؤد نے ابو الطفیل سے روایت کیا ہے کہ میں نے ابن عباسؓ سے عرض کیا کہ آپ کی قوم کا خیال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت اللہ کے طواف میں رمل کیا تھا اور یہ سنت ہے۔ فرمایا: انہوں نے ایک بات صحیح کہی اور ایک غلط۔ میں نے کہا: صحیح کیا اور غلط کیا؟ فرمایا: یہ تو صحیح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رمل کیا تھا مگر یہ غلط ہے کہ یہ سنت ہے الخ ایک روایت میں ان سے ابتداءِ رمل کا یہ سبب منقول ہے کہ قریش مسلمانوں کے بارے

واضطبع بردائه،

ترجمہ: اور اپنی چادر کا اضطباع کیا۔

چھڑی کے ساتھ اس کی طرف اشارہ کرتے اور استلام کرتے اور اسے چوم لیتے۔

میں یہ کہتے تھے کہ یہ تو جبروں کی طرح لاغر ہیں۔ ابن عباسؓ نے فرمایا اس بنا پر رمل مسنون ہوا۔

سوم: اس کے حکم میں: جمہور کے نزدیک یہ سنت ہے مگر اس کے ترک سے کوئی چیز واجب نہیں ہوگی۔ البتہ امام مالکؒ سے ایک روایت ہے کہ جب تک مکہ میں رہے اس کا اعادہ کرے۔ بعد میں انہوں نے اس روایت سے رجوع کر لیا تھا۔ ابن الماجشون سے روایت ہے کہ اس کے تارک پر دم واجب ہے۔ اور ابن حزمؒ اس کے وجوب کی طرف مائل ہیں۔

چہارم: رمل جمہور کے نزدیک چاروں طرف ہوگا۔ ائمہ اربعہ کا مسلک بھی یہی ہے البتہ تابعین کی ایک جماعت اس کی قائل ہے کہ رکنین کے درمیان رمل نہیں۔ یہی امام شافعیؒ کی ایک ضعیف روایت ہے۔

پنجم: آیا یہ صرف آفاقی کے ساتھ مخصوص ہے یا مکی بھی رمل کرے؟ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک مکی اور غیر مکی کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ مگر امام احمد فرماتے ہیں کہ اہل مکہ کے ذمہ رمل نہیں۔

ششم: حنابلہ کے نزدیک رمل صرف طواف قدوم میں ہو سکتا ہے۔ امام شافعیؒ کا بھی ایک قول یہی ہے، مگر ان کا صحیح قول یہ ہے اور ہمارا قول بھی یہی ہے کہ رمل ہر اس طواف میں ہو سکتا ہے جس کے بعد سعی ہو۔ اور امام مالک فرماتے ہیں کہ طواف قدوم میں کرے اگر اس میں نہیں کیا تو طواف زیارت میں کرے۔

ہفتم: جس طرح پہلے تین چکروں کا وظیفہ رمل ہے۔ اسی طرح بقیہ چار چکروں کا وظیفہ سکون و وقار ہے۔

اسی بنا پر حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ رمل کا تدارک مشروع نہیں پس اگر پہلے تین چکروں میں رمل نہیں کیا تو باقی چار میں اس کی قضا نہ کرے کیونکہ ان کی حیثیت سکون ہے۔ اس کی تبدیل نہ کی جائے گی۔ اور

اضطباع کا حکم

اور اپنی چادر کا اضطباع کیا: نہایہ میں مجمع سے نقل کیا ہے کہ اضطباع کے معنی یہ ہیں کہ چادر کا درمیانی حصہ داہنی بغل کے نیچے سے نکال کر اس کے دونوں کنارے بائیں کندھے پر آگے پیچھے لٹکائے جائیں۔ اس کو اضطباع اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں [illegible]

وکلما حاذی الحجر الاسود اشار الیہ واستلمہ بالمحجن وقبلہ

ترجمہ: اور جب (طواف کرتے ہوئے) حجر اسود کے برابر آتے تو

پہلو ظاہر ہو جاتے ہیں: اور حاشیۂ اوجز میں ہے کہ موفق لکھتے ہیں: اضطباع طواف قدوم میں مستحب ہے۔ امام شافعی کا بھی یہی قول ہے۔ اور امام مالک فرماتے ہیں کہ یہ سنت نہیں۔ حنفیہ بھی اس کی سنیت کے قائل ہیں۔ جیسا کہ ہدایہ میں ہے۔ اور جب (طواف کرتے ہوئے) حجر اسود کے برابر آتے تو چھڑی کے ساتھ اس کی طرف اشارہ کرکے اس کا استلام کرتے اور اسے چوم لیتے۔ اس مسئلہ میں ائمہ کا اختلاف گذر چکا ہے اور انہی لوگوں کو وہم ہوا ہے جنہوں نے یہ کہا کہ آنحضرت صلی اللہ

رکن یمانی کی تقبیل ثابت نہیں

علیہ وسلم طواف میں رکن یمانی کی تقبیل فرماتے تھے۔ تقبیل تو حجر اسود ہی کی ہے۔ چونکہ حجر اسود کو اور اس کے پاس والے رکن کو ملا کر یمانیین کہا جاتا ہے۔ اس لئے بعض نے تنہا حجر اسود کو بھی یمانی سے تعبیر کیا۔ البتہ یہ ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رکن یمانی کا استلام کیا، مگر یہ ثابت نہیں کہ اس کو بوسہ بھی دیا۔

(ف) بعض روایتوں میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ

طواف پیدل کیا جائے یا سواری پر

وسلم نے اونٹنی پر طواف کیا۔ جیسا کہ ہدایہ میں ہے۔ شیخ ابن ہمامؒ نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ آپ نے اس حج میں متعدد طواف کئے تھے۔ صاحب البدایہ والنہایہ نے بھی یہ توجیہ امام شافعیؒ سے نقل کی ہے۔ تفصیل آگے آتی ہے۔

رہا یہ کہ طواف پیدل کرنا واجب ہے یا مستحب؟ ابن قیمؒ کہتے ہیں کہ پیدل چلنا مستحب ہے اور ملا علی قاری کے مناسک میں ہے کہ واجب ہے۔ اوجز میں اس پر مفصل کلام کیا ہے۔ اور اس میں ہے کہ موفق فرماتے ہیں: اس میں اہل علم کے درمیان کوئی اختلاف نہیں کہ عذر کی حالت میں سواری پر طواف کرنا صحیح ہے۔ باقی رہا بغیر عذر کے سواری پر یا کسی کے کندھے پر سوار ہو کر طواف کرنا، سو خرقی کے کلام کا مفہوم یہ ہے کہ یہ صحیح نہیں، یہ امام احمد کی ایک روایت ہے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ صحیح ہے۔ اور یہی امام مالکؒ کا قول ہے۔ امام ابوحنیفہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ مگر وہ فرماتے ہیں کہ جب تک مکہ میں ہے اس کا اعادہ کرلے اور اگر اعادہ کئے بغیر واپس آگیا تو دم دے کر اس کی تلافی کرے۔ امام احمد کی تیسری روایت یہ ہے کہ یہ صحیح ہے اور اس کے ذمہ کچھ لازم نہیں۔ یہی امام شافعیؒ کا مسلک ہے۔ اس میں اختلاف نہیں کہ پیدل طواف کرنا افضل ہے: اور میں کہتا ہوں کہ موفق نے

فلما فرغ من طوافه۔

ترجمہ: پس جب طواف سے فارغ ہوئے۔

امام ابوحنیفہؒ کا جو مذہب نقل کیا ہے امام مالکؒ کے مذہب میں بھی یہی راجح ہے کہ جب تک مکہ میں ہو اعادہ کرے اور اگر گھر لوٹ آیا تو دم واجب ہوگا۔ جیسا کہ دسوقی نے لکھا ہے۔ تفصیل اوجز میں ہے۔ شیخ قدس سرہ نے کوکب میں اس پر نہایت عمدہ کلام کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سواری پر طواف کیا یہ ہمارے نزدیک عذر کی بنا پر جائز ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عذر یہ تھا کہ ہجوم کی وجہ سے لوگ آپ کے پیدل طواف کرنے میں تنگی محسوس کرتے تھے۔ نیز اس کی ضرورت بھی تھی تاکہ لوگ آپ کے افعال کو دیکھیں اور آپ ان کے سوالات کا جواب دیں۔ اور یہ ساری چیزیں سوار ہوئے بغیر ممکن نہیں تھیں۔ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہی سمجھا تھا۔ چنانچہ آپ کے بعد انہوں نے بلا عذر سواری پر طواف نہیں کیا۔

حضرت شیخ قدس سرہ کے کلام کی تائید مندرجہ ذیل روایات سے ہوتی ہے۔ امام مسلم اور ابوداؤد نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں اونٹنی پر طواف کیا۔ آپ چھڑی کے ساتھ حجر اسود کا استلام کرتے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ لوگ آپ کو دیکھ سکیں اور آپ اونچے رہیں اور لوگ آپ سے مسائل دریافت کرسکیں کیونکہ آپ کے گرد انسانوں کا ہجوم تھا۔ اور ابوداؤد میں حضرت عائشہؓ کی روایت میں ہے کہ آپ کو یہ گوارا نہیں تھا کہ لوگوں کو مار کر آپ سے ہٹایا جائے۔ اور ابوداؤد میں حضرت ابن عباسؓ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ تشریف لائے وہ اس حال میں کہ آپ علیل تھے۔ پس آپ نے اپنی اونٹنی پر طواف کیا الخ۔ اس حدیث کو بیہقیؒ نے ضعیف اور زیلعیؒ نے قوی کہا ہے۔ اسی علت کی طرف امام بخاریؒ نے باب المریض یطوف راکبًا میں اشارہ کیا ہے جیسا کہ قاضی عیاض نے کہا ہے۔ اور نوویؒ نے ان کی پیروی کرتے ہوئے مزید کہا: احتمال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سواری پر طواف کرنا ان تمام اسباب کی وجہ سے ہوا ہو۔

طواف قدوم کا حکم

پس جب آپ طواف سے فارغ ہوئے۔ ہمارے نزدیک یہ طواف عمرہ تھا۔ اس کی تائید اس سے ہوتی ہے جو فتح میں داؤدی سے نقل کیا ہے کہ یہ طواف فرائض حج میں سے تھا۔ اور دیگر حضرات کے نزدیک یہ طواف قدوم تھا۔ طواف قدوم کے حکم

جاء الی خلف المقام

ترجمہ: تو مقام ابراہیم کے پیچھے آئے

میں اختلاف ہے جیسا کہ اوجز اور میرے حاشیہ بذل میں اس پر مختصر کلام کیا گیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ امام احمدؒ کے نزدیک سنت ہے۔ جیسا کہ المغنی میں ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک واجب ہے۔ امام شافعیؒ سے موثق نے وجوب نقل کیا ہے۔ مگر شافعیہ کے نزدیک راجح یہ ہے کہ یہ سنت ہے جیسا کہ شرح مہذب اور مناسک نووی میں ہے۔ اور ہمارے حنفیہ کے نزدیک سنت ہے جیسا کہ تمام معتبر کتابوں میں ہے۔ البتہ خزانۃ المفتین میں اس کا وجوب نقل کیا ہے۔ جیسا کہ شرح لباب میں ہے۔ رہی یہ بحث کہ آیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف قدوم کیا تھا؟ طحاویؒ کا جواب بظاہر نفی میں ہے، اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے۔ جیسا کہ آگے آتا ہے کہ اس طواف مذکور کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کے قریب نہیں گئے ان کے قول کا مفہوم بھی یہی نفی ہے۔ مگر حنفیہ کے مسلک کے مطابق یہ محل اشکال ہے کیونکہ ان کے نزدیک قارن کے لئے آتے ہیں دو طواف ضروری ہیں۔ طواف عمرہ اور طواف قدوم۔ جیسا کہ فقہ حنفی کی کتابوں میں مذکور ہے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ان چار دنوں میں کئی طواف کئے ہوں گے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اقامت منیٰ کے دوران بھی طواف ترک نہیں کیا۔ جیسا کہ آگے آتا ہے۔ لہذا بعید از قیاس ہے کہ اقامت مکہ کے دوران چھوڑ دیا ہو۔ تو مقام ابراہیم کے پیچھے آئے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ صحیح قول کے مطابق مقام ابراہیم آج بھی اسی جگہ ہے۔ جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ کے زمانہ میں تھا۔ اور مالکؒ کی وہ روایت غریب ہے جس میں آتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو پیچھے ہٹا کر موجودہ جگہ رکھا تھا۔ اور حافظ فرماتے ہیں کہ ازرقیؒ نے اخبار مکہ میں صحیح سندوں سے روایت کیا ہے کہ مقام ابراہیم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں اسی جگہ تھا جہاں آج ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں سیلاب آیا تھا جو اس کو بہا کر لے گیا یہاں تک کہ اسفل مکہ سے۔ سیلاب ہوا اور اسے لاکر کعبہ شریف کے غلاف سے باندھ دیا تھا۔ یہاں تک کہ حضرت عمرؓ تشریف لائے پس اس کے معاملہ میں تفتیش فرمائی۔ جب اس کی پہلی جگہ کی تحقیق ہو گئی تو اسے دوبارہ اسی جگہ رکھا اور اس کے گرد تعمیر فرمائی۔ پس جب سے اب تک اسی جگہ قائم ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ آج ۱۳۹۰ھ تک وہ اپنی جگہ موجود ہے۔

فقرأها واتخذوا من مقام ابراهيم مصلی، وصلی رکعتين فلما فرغ من صلوته استلم الحجر الاسود۔

ترجمہ: پس یہ آیت پڑھی اور بناؤ مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ، پھر دو رکعتیں ادا کیں پس جب اپنی نماز سے فارغ ہوئے تو حجر اسود کا استلام کیا۔

پس یہ آیت پڑھی: "اور بناؤ مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ" اور دو رکعتیں بایں کیفیت ادا کیں کہ مقام ابراہیم آپ کے اور بیت اللہ شریف کے درمیان تھا۔ اور ان دو رکعتوں میں سورۃ الکافرون اور سورۃ الاخلاص پڑھی جیسا کہ مسلم اور ابو داؤد وغیرہ میں حضرت جابرؓ کی طویل حدیث میں ہے۔

دوگانۂ طواف کا حکم: دوگانۂ طواف کے حکم میں اختلاف ہے۔ جس کی تفصیل اوجز میں ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ حنفیہ کے نزدیک واجب اور امام احمدؒ کے نزدیک سنت ہے۔ شافعیہ کے دو قول تو یہی ہیں اور تیسرا قول یہ ہے کہ طواف واجب ہو تو یہ بھی واجب ورنہ سنت۔ مالکیہ کے تین قول تو یہی ہیں۔ اور ان کا چوتھا قول یہ ہے طواف واجب کے بعد ہو تو واجب ہے ورنہ تردد ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک فرض نماز دوگانۂ طواف کے قائم مقام ہو سکتی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اور مالکؒ کے نزدیک نہیں ہو سکتی۔ اور امام احمدؒ سے دونوں روایتیں ہیں۔

طواف سے فارغ ہو کر حجر اسود کا استلام کرنا اور زمزم پینا: پس جب اپنی نماز سے فارغ ہوئے تو حجر اسود کا استلام کیا۔ یہ استلام ائمہ اربعہ سب کے نزدیک مستحب ہے۔ موفق فرماتے ہیں کہ ہمیں اس میں کسی کا اختلاف معلوم نہیں جیسا کہ اوجز میں ہے۔ اور اوجز میں مجاہد سے نقل کیا ہے کہ "جس طواف کے بعد سعی ہو اس میں استلام مستحب ہے کیونکہ جس طرح طواف استلام سے شروع ہوتا ہے اسی طرح سعی بھی" اھ۔ ملا علی قاریؒ استلام کے ذکر کے بعد فرماتے ہیں: "بلکہ یہ بھی صحیح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حجر اسود کی طرف اٹھنے سے قبل زمزم پر گئے اور پانی پیا اور اپنے سر مبارک پر بھی ڈالا۔ پھر لوٹ کر حجر اسود کا استلام کیا" اھ۔ میں کہتا ہوں کہ اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمزم پینے کی روایت مناسک حج کی کتابوں میں تو ابھی تک مجھے نہیں ملی۔ البتہ الدر دیہ نے سنن میں دوگانۂ طواف کے بعد تقبیل حجر کا ذکر کرنے کے بعد کہا ہے: "اور مستحب ہے کہ زمزم پر جائے اور وہاں سے پانی پیئے، پھر سعی کے لئے نکلے"

ثم خرج الی الصفا۔ فلما دنا منه قرأ: ان الصفا والمروة من شعائر الله، ابدأ بما بدأ الله به۔ متفق علیہ

ترجمہ: پھر صفا کی طرف نکلے، پس جب اس کے قریب پہنچے تو یہ آیت پڑھی: ان الصفا والمروة من شعائر الله۔ اور فرمایا: میں اسی سے ابتدا کروں گا جس کو اللہ تعالیٰ نے پہلے ذکر کیا ہے، پس صفا پر چڑھے

پس سطور زیر قلم تھیں کہ مسند احمد میں حضرت جابرؓ کی حدیث دیکھی جس میں طواف کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمزم شریف پینے کا ذکر ہے جس سے ملا علی قاریؒ کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے طواف افاضہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمزم شریف پینا معروف ہے، اس کا ذکر آگے آتا ہے۔ اور وہیں یہ بات بھی آئے گی کہ زمزم شریف کو لے جانا افضل ہے اور زمزم شریف ساتھ لانے کا بیان آخر رسالہ میں آئیگا۔

باب صفا سے صفا کی طرف نکلنا

پھر صفا کی طرف باب صفا سے نکلے، چنانچہ طبرانی کی معجم صغیر میں حدیث جابرؓ کے لفظ یہ ہیں: پھر نکلے باب صفا سے۔ اور نسائی میں ابن عمرؓ سے مروی ہے: پھر نکلے صفا کی طرف اس دروازے سے جس سے صفا کی طرف نکلا جاتا ہے۔ نوویؒ اپنے مناسک میں فرماتے ہیں کہ اس دروازے سے نکلنا سنت ہے۔ مگر صاحب جامعہ نے اس سے انکار کرتے ہوئے کہا ہے کہ: "اور جس دروازے سے چاہے نکلے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باب صفا سے اس لئے نکلے تھے کہ صفا کو جانے کا قریب ترین راستہ یہی تھا، نہ اس لئے کہ یہ سنت ہے"۔ اور صاحب لباب نے بدائع وغیرہ سے نقل کیا ہے کہ یہ مستحب ہے، اسی طرح موفق نے بھی المغنی میں اس کا استحباب ذکر کیا ہے۔

صفا سے سعی کی ابتدا کرنا

پس جب اس کے قریب پہنچے تو یہ آیت پڑھی: ان الصفا والمروة من شعائر الله، اور فرمایا: میں اسی سے ابتدا کروں گا جس کو اللہ تعالیٰ نے پہلے ذکر کیا ہے۔ صفا سے سعی کی ابتدا کرنا جمہور کے نزدیک واجب ہے، ائمہ اربعہ بھی اس پر متفق ہیں، بلکہ اس پر اجماع نقل کیا گیا ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ اگر کسی نے مروہ سے ابتدا کی تو اس پھیرے کا اعتبار نہیں ہوگا، بلکہ صفا سے مروہ تک پہلا پھیرا شمار ہوگا، اس میں بعض تابعین اور بعض عراقیوں کا اختلاف ہے، جیسا کہ اوجز میں مفصل مذکور ہے۔ پس صفا پر چڑھے۔ صفا پر اتنا چڑھے

ودعا، ثم نزل الى المروة يمشي فلما انصبت قدماه في بطن الوادي سعى۔

اور دعائیں کیں۔ پھر مروہ کی طرف ترک معتاد رفتار سے چلے۔ اور جب قدم مبارک وادی کے اندر پہنچے تو تیز رفتاری سے چلے۔

چڑھنا کہ بیت اللہ شریف نظر آئے ائمہ اربعہ کے نزدیک سنت ہے۔ البتہ بعض شوافع کا اس میں اختلاف ہے جس کی تفصیل اوجز میں ہے۔ اور ہدایہ میں ہے کہ بس اتنا چڑھے کہ بیت اللہ نظر آنے لگے کیونکہ چڑھنے سے مقصود صرف بیت اللہ کا استقبال ہے۔" اھ اور مختلف دعائیں کریں۔ جو احادیث میں وارد ہیں۔ بیہقی کی روایت کیا ہے کہ صفا میں جو شگاف ہے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اس پر کھڑے ہوئے اور فرمایا "اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جن پر سورۃ بقرہ نازل ہوئی اسی جگہ کھڑے تھے۔ پھر آپ مروہ کی طرف معتاد رفتار سے چلے اور جب قدم مبارک وادی کے اندر پہنچے تو تیز رفتاری سے چلے جیسا کہ حضرت جابرؓ کی طویل حدیث میں ہے۔ وادی کی ڈھلان سے مراد اس زمانہ میں میلین اخضرین کا درمیانی حصہ ہے۔ کیونکہ یہ ڈھلان ایک زمانے سے باقی نہیں رہی۔ اس حصہ کے اندر دوڑ کے تیز رفتار سے دوڑنا سنت ہے۔

میلین اخضرین کے درمیان دوڑنا

اور اس سے پہلے صفا کی جانب اور اس کے بعد مروہ کی طرف معتاد رفتار سے چلنا جمہور کے نزدیک سنت ہے۔ جیسا کہ اوجز میں تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے، اور اس میں اقوال مختلف ہیں، ان کی تفصیل بھی اوجز میں ہے۔ اوجز میں باجی سے نقل کیا ہے کہ اگر کسی نے بطن وادی میں سعی نہیں کی تو اس کے بارے میں امام مالکؒ کے قول مختلف ہیں۔ ان سے ایک روایت یہ ہے کہ اس کے ذمہ دم واجب ہوگا، پھر اس قول سے رجوع کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کے ذمہ کچھ نہیں۔ ابن عبد البرؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص سعی کے دوران دوڑا نہیں اس کے بارے میں امام مالکؒ کے قول مختلف ہیں، کبھی فرمایا کہ اعادہ کرے، کبھی فرمایا اعادہ کی ضرورت نہیں، کبھی فرمایا کہ اس کے ذمہ دم ہے، کبھی فرمایا کہ اس کے ذمہ کچھ نہیں۔ فقہ مالکی کی کتابوں میں تیز چلنے کو سنت لکھا ہے۔ اور نوویؒ فرماتے ہیں کہ اس مقام میں تیز چلنا ساتوں چکروں میں مستحب ہے اور اس کے ماقبل و مابعد میں معتاد رفتار سے چلنا مستحب ہے تاہم اگر تمام سعی آہستہ چل کر کی یا تمام دوڑ کر کی تب بھی کفایت کرے گی، مگر اس سے فضیلت فوت ہوگئی۔ یہ امام شافعیؒ اور ان کے موافقین کا مذہب ہے۔" اور موفقؒ فرماتے ہیں: "بطن وادی

کے اندر دوڑ کر چلنا سنت مستحبہ ہے اور اس کے تارک پر کچھ نہیں کیونکہ اگر بیت اللہ کے طواف میں رمل نہ کرے تو کچھ لازم نہیں آتا، پس صفا مروہ کے درمیان اگر رمل نہ کرے تو بدرجہ اولیٰ کوئی چیز واجب نہیں ہونی چاہیئے۔ میں کہتا ہوں کہ یہی حکم حنفیہ کے نزدیک ہے۔ جیسا کہ ان کی فقہی کتابوں میں موجود ہے۔ انتہی ملخصاً من الاوجز۔

آنحضرتؐ کی سعی پیدل تھی یا سواری پر؟

اس حدیث کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طواف اور سعی دونوں پیدل تھے۔ اور مسلم شریف میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے کہ آپ نے طواف اور سعی سواری پر کی تھی۔ اور شیخ ابن عربی نے محاضرۃ الابرار میں اسی پر جزم کیا ہے۔ ابن حجرؒ نے ان دونوں کے درمیان یوں تطبیق دی ہے کہ جب اونٹ سوار کو لے کر وادی میں اترا تو گویا سوار خود اتر گیا۔ راقم کہتا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ آپ کے قدم بطن وادی میں اترے۔ اور حافظ ابن قیمؒ نے اس طرح تطبیق دی ہے کہ آپ نے پہلے پیدل سعی شروع کی ہوگی، بعد میں سوار ہو گئے ہوں گے۔ صاحب البدایہ والنہایہ نے اسی پر جزم کیا ہے۔ اور اس کی تائید مسلم شریف کی اس روایت سے ہوتی ہے جو ابوالطفیل سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ مجھے یہ بتائیے کہ صفا مروہ کی سعی سوار ہو کر سنت ہے یا کہ نہیں کیونکہ آپ کی قوم کا خیال ہے کہ سنت ہے؟ آپ نے فرمایا کہ انہوں نے کچھ صحیح کہا اور کچھ غلط۔ میں نے کہا کچھ صحیح اور کچھ غلط کا کیا مطلب؟ فرمایا: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد لوگ زیادہ جمع ہو گئے تھے۔ جب لوگ زیادہ ہوئے تو آپؐ سوار ہو گئے الخ۔ میں کہتا ہوں کہ ابوالطفیل کی روایت کے الفاظ جو ابوداؤد میں مروی ہیں وہ اس تاویل کے منافی ہیں۔ اور وہ الفاظ یہ ہیں "میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ اپنی سواری پر بیت اللہ کا طواف کر رہے تھے اور چھڑی کے ساتھ حجر اسود کا استلام کر کے اسے چوم لیتے تھے" محمد بن رافع کی روایت میں یہ اضافہ ہے "پھر آپ صفا مروہ کی طرف نکلے پس اپنی سواری پر صفا مروہ کے سات پھیرے کئے"۔ اور ملا علی قاری نے اس طرح تطبیق دی ہے کہ سوار ہونے کی حدیث کو عمرۃ القضاء پر محمول کیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ مسلم و ابوداؤد کی حدیث جو حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس کے الفاظ اس تاویل کی تصدیق نہیں کرتے۔ اور وہ یہ ہیں "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں سواری پر بیت اللہ کا طواف کیا اور صفا مروہ کی سعی کی تاکہ لوگ

و فلما وصل الى المروة استقبل البيت وكبر فلما اكمل سعيه عند المروة

ترجمہ: اور جب مروہ پر پہنچے تو بیت اللہ کا استقبال کیا اور تکبیر کہی پس جب مروہ پر سعی پوری ہوئی

کہ حنفیہ کے مطابق جواب کی حاجت نہیں کیونکہ ان کا یہ قول کہ آپ نے دو طواف اور دو مرتبہ سعی کی - ان
کا احادیث سے بے نیاز کر دیتا ہے اور روایات میں قارن کیلئے دو مرتبہ سعی کی تصریح موجود ہے جس کی
تفصیل اپنی جگہ میں ہے۔ اور اس رسالہ کے شروع میں جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کے بارے
میں چھ قول گذرے ہیں وہاں اس کو اجمالاً ذکر کیا جا چکا ہے۔

ابن حزم کا وہم

(ق) اور یہاں ابن حزم کو کھلا وہم ہوا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے
سعی کے تین چکروں میں رمل کیا تھا اور چار چکروں میں معتاد رفتار سے چلے تھے۔ اور
اس پر طرہ یہ کہ وہ اس قول پر جس کا کوئی ایک بھی قائل نہیں، علماء کا اتفاق نقل کرتے ہیں۔

آنحضرتؐ کا طواف پیدل تھا یا سواری پر

(ق) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف قدوم
پیدل کیا تھا یا سواری پر؟ اس میں اختلاف ہے۔
ظاہر یہ ہے کہ سواری والا طواف افاضہ میں تھا نہ طواف قدوم میں جیسا کہ مختصر الشیخ قدس سرہ نے رمل میں حدیث
ابن عباسؓ کی شرح میں تحریر فرمایا ہے کہ اس حدیث میں جس طواف کے سواری پر کرنے کا ذکر ہے کونسا
طواف تھا؟ طواف عمرہ یا طواف قدوم یا طواف زیارۃ؟ اس سلسلہ میں کسی کی تصریح میری نظر سے
نہیں گذری، بظاہر طواف جو سواری پر کیا گیا تھا زیارت تھا۔ امام نوویؒ نے بھی اپنے مناسک میں اسی
کو اختیار کیا ہے، میں کہتا ہوں کہ اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جو ابوداؤد نے حضرت ابن عباسؓ
سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف افاضہ میں رمل نہیں کیا۔

سعی کے متعلق تین بحثیں

اور جب مروہ پر پہنچے تو بیت اللہ کا استقبال کیا اور تکبیر کہی،
اور وہی عمل کیا جو صفا پر کیا تھا پس جب مروہ پر آ کر سعی پوری
ہوئی یہاں تین بحثیں ہیں۔ اول یہ کہ صفا سے سعی شروع کرنا اور مروہ پر ختم کرنا جمہور کا مذہب ہے،
وہ صفا سے مروہ تک کو ایک پھیرا اور مروہ سے صفا تک واپسی کو دوسرا پھیرا شمار کرتے ہیں۔ اس
میں بعض شافعیہ کا اختلاف ہے۔ اور حنفیہ میں سے امام طحاویؒ کا میلان بھی اسی طرف ہے کہ صفا
سے مروہ تک جانے اور مروہ سے صفا تک واپس آنے سے ایک پھیرا شمار ہوگا۔ موفق فرماتے ہیں:

صفا سے مروہ تک جانا ایک پھیرا ہے اور مروہ سے صفا تک آنا دوسرا پھیرا ہے۔ ابن جریر اور بعض شافعیہ سے منقول ہے کہ جانے آنے سے ایک پھیرا مکمل ہوگا۔ مگر یہ غلط ہے، تو پوری تفصیل اوجز میں ہے۔

سعی کے بعد دوگانہ کا حکم

دوسری بحث یہ کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سعی کے بعد دو رکعتیں پڑھی تھیں؟ مطلب بن ابی وداعہ کی روایت میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سعی سے فارغ ہوئے تو مطاف کے کنارے پر دو رکعتیں پڑھیں۔ یہ حدیث امام احمد اور ابن حبان نے روایت کی ہے اور شیخ ابن ہمام نے اس سے استدلال کیا ہے کہ سعی کے بعد دوگانہ مستحب ہے۔ صاحب لباب، صاحب بحر اور ابن عابدین نے بھی انہی کی پیروی کی ہے لیکن ابن حجر مکی نے شرح مناسک نووی میں اس پر تعقب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حنفیہ سے حدیث کے لفظ میں غلطی یا تصحیف ہوئی۔ یہاں "سعیہ" کا لفظ نہیں بلکہ "سبعہ" ہے۔ جس سے مراد طواف کے سات پھیرے ہیں۔ احقر کہتا ہوں کہ ابن حجر مکی کے قول کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ ابن ماجہ نے اس حدیث پر یہ عنوان قائم کیا ہے "طواف کے بعد دو رکعتوں کا بیان" اور حدیث میں "سبعہ" کا لفظ بائے کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اور اس سے زیادہ واضح دلیل یہ ہے کہ امام نسائی نے یہی حدیث اس طرح روایت کی ہے۔ "طاف بالبیت سبعاً ثم صلی رکعتین" بیت اللہ کے گرد سات پھیرے کئے پھر دو رکعتیں پڑھیں۔ مگر یہ تصحیف صرف حنفیہ کی کتابوں میں نہیں بلکہ یہ حدیث صاحب عون المعبود اور صاحب اسد الغابہ نے بھی مسند ابویعلی سے اسی لفظ سعیہ یائے تحتانیہ کے ساتھ نقل کی ہے۔ تفصیل میرے حاشیۂ بذل اور "التعلیق" بذل میں ہے۔ یہاں اس کا خلاصہ درج کیا گیا ہے۔

سعی کا حکم

تیسری بحث یہ ہے کہ سعی کا حکم کیا ہے؟ اوجز میں دلائل کے ساتھ اس پر مفصل بحث ہوئی ہے اور اس کا اجمال حاشیۂ لامع میں یہ ہے کہ اس میں اہل علم کے تین قول ہیں۔ اول یہ رکن ہے اس کے بغیر حج صحیح نہیں ہوگا۔ امام شافعی اسی کے قائل ہیں۔ امام مالک کا مشہور قول اور امام احمد کی دو روایتوں میں سے صحیح روایت بھی یہی ہے۔ دوم: یہ واجب ہے اور دم کے ساتھ اس کی تلافی ہوسکتی ہے۔ یہ امام ابوحنیفہؒ کا اور عتبیہ میں امام مالک کا قول ہے۔ سوم یہ سنت مستحب ہے۔ یہ ابن عباسؓ کا قول ہے۔ اور امام احمد کی ایک روایت ہے۔ اھ

امر كل من لا هدي معه ان يحل حتما وهذا قال لو استقبلت من امري
ما استدبرت لما سقت الهدي .

ترجمہ: تو قطعی حکم فرمایا کہ جن لوگوں کے ساتھ ہدی کے جانور نہیں وہ احرام کھول دیں۔ اسی موقعہ پر فرمایا کہ جو بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی وہ اگر پہلے معلوم ہو جاتی تو ہدی ساتھ نہ لاتا۔

فسخ احرام کا قطعی حکم

تو قطعی حکم فرمایا کہ جن لوگوں کے پاس ہدی کے جانور نہیں وہ احرام کھول دیں۔ خواہ وہ مفرد ہوں یا قارن — قران والوں نے باوجودیکہ حج وعمرہ دونوں کا احرام باندھ رکھا تھا۔ مگر ان کو بھی فسخ احرام کا حکم فرمایا۔ اس کی وجہ تو سب ہی گزر چکی ہے۔ اس طرح مطہرات رضی اللہ عنہن کے ساتھ ہدی کے جانور نہیں تھے اس لئے انہوں نے بھی احرام کھول دیئے جیسا کہ بخاری، مسلم اور نسائی کی روایت میں ہے اور عنقریب آگے آرہا ہے۔ اور جن کے ساتھ ہدی کے جانور تھے وہ بدستور احرام میں رہے۔ ان کے نام بھی آگے آرہے ہیں۔ موقع "سرف" میں احرام حج کو عمرہ میں تبدیل کرنے کا جو حکم فرمایا وہ اس سے ادنیٰ مرتبہ کا حکم تھا۔ اور اسی موقعہ پر فرمایا کہ جو بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی وہ اگر پہلے معلوم ہو جاتی تو میں ہدی ساتھ نہ لاتا۔ چنانچہ شیخین نے حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ۴ ذی الحجہ کی صبح کو مکہ تشریف لائے پس جب ہم مکہ پہنچے تو ہمیں حکم دیا کہ ہم احرام کھول دیں۔ اور فرمایا کہ بیویوں کے پاس جاؤ۔ عطاؒ فرماتے ہیں کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر یہ حکم لازم نہیں کیا تھا بلکہ عورتوں کو ان کے لئے حلال قرار دیا تھا۔ پس آپ کو یہ خبر پہنچی کہ ہم (صحابہ) یہ کہتے ہیں کہ اب جبکہ ہمارے اور عرفہ کے درمیان صرف پانچ راتیں باقی ہیں تو آپ نے یہ حکم فرمایا کہ ہم احرام کھول کر عورتوں کے پاس جائیں؟ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم عرفات میں ایسی حالت میں جائیں گے کہ ہماری شرمگاہوں سے منی ٹپک رہی ہوگی۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا جس میں فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ میں تم سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا، تم سب سے زیادہ سچا اور تم سب سے زیادہ نیکوکار ہوں۔ اگر ہدی کے جانور نہ ہوتے تو میں بھی تمہاری طرح احرام کھول دیتا۔ پس اگر یہ بات مجھے پہلے معلوم ہو جاتی جو بعد میں معلوم ہوئی تو میں ہدی کے جانور ساتھ نہ لاتا۔ پس ہم نے احرام کھول دیئے اور سمع وطاعت بجا لائے۔ تو عطاؒ فرماتے ہیں کہ حضرت جابرؓ کا یہ ارشاد کہ ان پر یہ حکم لازم نہیں کیا تھا۔ اس کا مطلب

یہ ہے کہ عورتوں سے مقاربت کو ضروری قرار نہیں دیا تھا۔ بلکہ اس کی اجازت دی تھی۔ اس کو واجب نہیں کیا تھا۔ باقی احرام کھول دینا ان لوگوں کے لئے واجب اور قطعی تھا جنکے پاس ہدی نہیں تھی۔

ارشادِ نبوی: لو استقبلت من امری

اس میں اختلاف ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد اس ارشاد سے کیا تھا۔ شیخ نسائی میں فرماتے ہیں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو رائے مجھ پر بعد میں ظاہر ہوئی ہے اگر پہلے سے ظاہر ہو گئی ہوتی تو میں ہدی ساتھ نہ لاتا۔ اور کہا گیا ہے کہ صحابہ کرام کے لئے آپ کی اقتداء کا ترک کرنا گراں تھا۔ اس لئے صحابہ کرام کی دلجوئی کے لئے فرمایا تاکہ انہیں اطمینان ہو جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس چیز کی ان کو دعوت دے رہے ہیں وہی ان کے لئے افضل ہے۔ یہی بات ان سے پہلے نووی نے لکھی ہے۔ اور شیخ المشائخ گنگوہی فرماتے ہیں کہ یہ بات اس لئے ارشاد فرمائی تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ گمان نہ کیا جائے کہ جس طرح صحابہ نے احرام کھول دیا ہے تو آپ خود بھی کھول دیں گے۔ اور تاکہ حضرت علی حضرت فاطمہ کے احرام کھولنے پر نکیر نہ کریں۔ اور تاکہ حضرت علی کو معلوم ہو جائے کہ جس کے ساتھ ہدی کے جانور ہوں اس کو احرام کھولنے کا حکم نہیں۔ اور جن کے ساتھ ہدی نہیں وہ احرام کھول دیں گے۔ علاوہ ازیں اس قسم کے اور بھی فوائد ہیں تاہم ہماری بحث جمہور کی رائے کے مطابق ہے۔ اور یہ حدیث اس مسئلہ میں حنابلہ کی دلیل ہے کہ تمتع افضل ہے۔ چنانچہ موفق لکھتے ہیں: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو حکم دیا کہ وہ افراد اور قران کو چھوڑ کر تمتع کریں۔ ظاہر ہے کہ آپ نے انہیں افضل ہی کی طرف منتقل ہونے کا حکم دیا۔ یہ ناممکن ہے کہ آپ انہیں اعلیٰ کو چھوڑ کر ادنیٰ کی طرف منتقل ہونے کا حکم دیں۔ جب کہ آپ خیر کی طرف دعوت دینے والے اور اعلیٰ و افضل کی طرف راہنمائی کرنے والے تھے۔ پھر ان صحابہ کو آپ نے یوں مؤکد فرمایا کہ خود اپنی ذات کے بارے میں اس کے فوت ہو جانے پر افسوس کا اظہار فرمایا کہ ہدی کی وجہ سے آپ احرام کھولنے اور قران سے تمتع کی طرف منتقل ہونے پر قادر نہیں۔ موفق کے کلام پر یہ اشکال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قران آپ کی اپنی ذاتی رائے کی وجہ سے نہیں تھا۔ کہ آپ کو اس پر افسوس کرنے کی ضرورت ہوتی۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی وجہ سے تھا۔ جیسا کہ وادی عقیق کی بحث میں گزر چکا ہے کہ آپ کے پاس ایک آنے والا فرشتہ آیا اور اس نے کہا: کہئے عمرہ حج میں۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تو ماضی و مستقبل کی خبر ہے۔

ومنها انه دعا للمحلقين ثلاثًا وقد روي انه صلى الله عليه وسلم احل هو ولم يكن مقصرًا قطعًا -

ترجمہ: اور اسی جگہ حلق کرانے والوں کیلئے تین بار دعا فرمائی۔ اور روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام کھولا تھا قطعاً غلط ہے۔

حلق کرانیوالوں کیلئے تین بار دعا فرمانا

اور اسی جگہ حلق کرانے والوں کیلئے تین بار اور قصر کرانے والوں کے لئے ایک بار حضرت کی دعا فرمائی۔ اوجز میں اس سلسلہ میں روایات کا اختلاف بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ یہ دعا عمرۂ حدیبیہ میں فرمائی تھی یا حجۃ الوداع میں؟ ابن عبد البر فرماتے ہیں کہ حدیبیہ میں دعا فرمانا ہی محفوظ ہے۔ نووی فرماتے ہیں کہ صحیح اور اشہر یہ ہے کہ یہ دعا حجۃ الوداع میں فرمائی تھی۔ قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ بعید نہیں کہ دونوں جگہ یہ دعا کی ہو۔ بعض فرماتے ہیں کہ یہی صحیح اور صواب ہے۔ حافظؒ نے فتح میں اسی کو اختیار کیا ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ یہی متعین ہے کیونکہ دونوں جگہ دعا کرنے کی روایات بکثرت ہیں۔ البتہ سبب دونوں جگہ مختلف ہیں جیسا کہ اوجز میں تفصیل سے وہ روایات ذکر کی گئی ہیں۔ اور یہی ظاہر ہے۔ پھر اس میں بھی اختلاف ہے کہ حجۃ الوداع میں آپ نے یہ دعا کس موقعہ پر فرمائی۔ مروہ پر یا منیٰ میں؟ صاحب الہدیٰ نے اسی پر جزم کیا ہے کہ مروہ پر یہ دعا فرمائی تھی، چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ اسی جگہ حلق کرانے والوں کے لئے دعا کی۔ ابن معقل وغیرہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ منیٰ میں دعا فرمائی کیونکہ ان حضرات نے یہ دعا منیٰ کے حلق کے بعد ذکر کی ہے۔ میرے نزدیک اس دعا کا مروہ پر ہونا اوجہ ہے۔ کیونکہ وہاں احرام کھولنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کا کمال اتباع تھا۔

حضرت معاویہؓ کی روایت کہ انہوں نے مروہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قصر کیا تھا

(ق) اور مروی ہے کہ آپ نے بھی احرام کھول دیا تھا مگر یہ قطعاً غلط ہے یہ وہم حضرت معاویہؓ کی اس روایت سے پیدا ہوا جو ابوداؤد میں ہے کہ حجۃ الوداع میں مروہ پر انہوں نے قینچی کے پھالے کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قصر کیا تھا۔

قسطلانی مواہب میں کہتے ہیں کہ علماء نے حضرت معاویہؓ کی اس روایت کی صحت کو تسلیم نہیں کیا۔ پوری بحث بذل اور اوجز میں ہے۔ البتہ مشکوٰۃ کے حاشیہ میں لمعات سے نقل کیا ہے کہ اس حدیث میں یہ اشکال ہے کہ اس کو حج پر محمول کرنا صحیح نہیں کیونکہ قارن کا حلق یا قصر مروہ پر نہیں، بلکہ منیٰ میں ہوتا ہے۔ نیز یہ طے شدہ بات ہے کہ حجۃ الوداع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قصر نہیں بلکہ حلق ہوا تھا لہٰذا یہ حدیث عمرہ پر محمول

حج کو فسخ کر کے عمرہ بنا لینے کی بحث اور حضرت سراقہؓ کی اس حدیث کا جواب منزل سرف کے بیان میں گزر چکا ہے۔ آنحضرتؐ نے سراقہؓ کے مندرجہ بالا سوال کے جواب میں فرمایا: "ہمیشہ کے لئے" البدایہ میں اسی طرح ہے۔ اس کے برعکس بخاری کی روایت میں ہے کہ سراقہؓ نے یہ سوال رمی جمرہ عقبہ کے وقت کیا تھا۔ اس کے لفظ باب عمرۃ التنعیم میں بروایت جابرؓ یہ ہیں: سراقہ بن مالک بن جعشم جمرۂ عقبہ کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے جب کہ آپ اس کی رمی کر رہے تھے پس عرض کیا: رسول اللہ! کیا یہ آپ لوگوں ہی سے مخصوص ہے؟ فرمایا: نہیں، بلکہ ہمیشہ کے لئے۔ حافظ فرماتے ہیں کہ کتاب التمنی میں یہ لفظ ہیں: وہ آئے جب کہ آپ جمرۂ عقبہ کی رمی کر رہے تھے۔ اس حدیث میں اس جگہ کی تصریح ہے جہاں حضرت سراقہؓ نے یہ سوال کیا تھا اور امام مسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی جو حدیث جعفر بن محمد عن ابیہ کے طریق سے ذکر کی ہے اس کے سیاق کا مقتضیٰ یہ ہے کہ یہ سوال اس وقت کیا گیا جب کہ آپ نے صحابہ کرامؓ کو حج کا احرام کھول کر عمرہ بنانے کا حکم فرمایا۔ اسی سے ان حضرات نے استدلال کیا ہے جو اس کے قائل ہیں کہ سراقہؓ کا سوال فسخ حج الی العمرۃ سے متعلق تھا۔ ممکن ہے کہ سوال دونوں چیزوں کے متعلق ہوا ہو کیونکہ سوال متعدد جگہ ہوا تھا۔

ارشاد نبوی "عمرہ حج میں داخل ہو گیا" کا مطلب

مسلم شریف میں جعفر بن محمد کی روایت میں ہے کہ حضرت سراقہؓ کھڑے ہوئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا یہ صرف اسی سال کے لئے ہے یا ہمیشہ کیلئے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر دو مرتبہ فرمایا: کہ عمرہ حج میں داخل ہو گیا، صرف اسی سال کے لئے نہیں بلکہ ہمیشہ کے لئے۔ نووی فرماتے ہیں کہ جمہور کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ جاہلی دستور کے برعکس حج کے مہینوں میں عمرہ کرنا جائز ہے اور بعض نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قران جائز ہے یعنی عمرہ کے افعال حج کے افعال میں داخل ہو گئے اور بعض نے کہا کہ یہ مفہوم یہ ہے کہ عمرہ کا وجوب ساقط ہو گیا اور یہ قول ضعیف ہے کیونکہ صحیح دلیل کا مقتضی ہے اور بعض نے اس کا مطلب بیان کیا ہے کہ

کہ حج کے احرام کو فسخ کر کے اسے عمرہ بنا لینا جائز ہے۔ مگر یہ بھی ضعیف ہے۔ نوویؒ کے قول پر تعقب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ سوال کا انداز و سیاق اس تیسری تاویل کے حق میں ہے۔ بلکہ ظاہر یہ ہے کہ سوال تو فسخ حج ہی کے بارے میں تھا مگر جواب اس سے عام ہے جو باستثنا تیسری تاویل کے مذکورہ بالا تمام تاویلات کو شامل ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ انتہیٰ کلام الی آخرہ۔

ان صحابہؓ کے نام جنہوں نے احرام نہیں کھولا

حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ

(قالت) وقدم علیّ من الیمن ببُدنٍ لہ۔

ترجمہ: (کہتی ہیں) اور حضرت علی رضی اللہ عنہ یمن سے تشریف لائے آپ کی ہدی کے اونٹ لے کر۔

اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم نے احرام نہیں کھولا کیونکہ ان کے ساتھ ہدی کے جانور تھے کما فی ابی داؤد امام طحاوی نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور دیگر اہل ثروت کا اضافہ کیا ہے اور اہل ثروت کے احرام نہ کھولنے کا ذکر امام مسلم نے بھی کیا ہے شیخ ابن عربی نے المحاضرۃ میں لکھا ہے کہ: ان حضرات نے احرام نہیں کھولا تھا ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نے بھی جن کا قران تھا احرام کھول دیا تھا البتہ حضرت عائشہؓ نے عذر کی بناء پر احرام نہیں کھولا میں کہتا ہوں کہ حضرت عائشہؓ کے بارے میں شیخ ابن القیم کا یہ قول ان روایات کے ملنے پر مبنی ہے حنفیہ کے نزدیک حضرت عائشہؓ نے عمرہ کا احرام کھول کر حج کا احرام باندھ لیا تھا تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

یمن سے حضرت علیؓ کی آمد

(کہتی ہیں) اور حضرت علی رضی اللہ عنہ یمن سے تشریف لائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تحصیل صدقات کیلئے یمن بھیجا تھا۔ جیسا کہ بخاری شریف کی کتاب المغازی "باب بعث علی ابن ابی طالب وخالد بن الولید الی الیمن قبل حجۃ الوداع" میں اس کی تفصیل ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ مال صدقات لے کر آئے اور مکہ مکرمہ میں آپ سے آکر ملے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت کیا کہ تم نے کیسا احرام باندھا؟ انہوں نے عرض کیا کہ میں نے یہ نیت کی تھی کہ جو احرام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے وہی میرا ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ ہدی تیار رکھو اور بدستور احرام کی حالت میں رہو۔ الی آخر الحدیث۔ اسی طرح حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے بھی اپنا احرام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احرام پر معلق رکھا تھا۔ مگر ان کے پاس چونکہ ہدی کا جانور نہیں تھا اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم فرمایا کہ حج کا احرام فسخ کرکے عمرہ بنالیں اور احرام کھولدیں۔

احرام مبہم و معلق

حاشیہ لامع میں "باب من اہل فی زمن النبی صلی اللہ علیہ وسلم" کے تحت ان دونوں حضرات کے احرام نیز احرام مبہم اور معلق پر خوب بحث کی گئی ہے۔

احرام مبہم اور معلق کے مسئلہ میں جو مذاہب ہیں ان کے بیان میں شراح حدیث کے اقوال مختلف ہیں جن کی تفصیل حاشیہ لامع میں ہے۔ خلاصہ یہ کہ احرام مبہم تو یہ ہے کہ حج یا عمرہ کی تعیین کئے بغیر احرام باندھے۔ اور معلق یہ ہے کہ یوں نیت کرے کہ جیسا احرام فلاں نے باندھا ہے ویسا ہی میرا ہوگا۔ ائمہ اربعہ کے صحیح قول میں احرام کی یہ دونوں صورتیں صحیح ہیں۔ اگرچہ بعض سے مختلف روایات بھی مروی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدی کے اونٹ لے کر۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قربانی کے جانور جو آپ کے ساتھ تھے اور جو یمن

وقال: فاقام بظاهر مكة اربعة ايام يقصر الصلوة

ترجمہ: اور فرمایا پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر مکہ میں چار دن ٹھہرے، درآنحالیکہ آپ قصر کی نماز پڑھتے تھے

یمن سے آئے تھے اور سب کی مجموعی تعداد ایک سو تھی۔ جیسا کہ الخمیس میں ہے اور صحیح مسلم اور ابوداؤد میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث میں بھی اس کی تصریح ہے۔ زرقانی نے قاضی عیاض سے نقل کیا ہے کہ جو اونٹ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ سے لائے تھے ان کی تعداد تریسٹھ تھی بظاہر ان ہی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے نحر فرمایا جیسا کہ امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور جو اونٹ یمن سے آئے تھے وہ آپ نے حضرت علیؓ کو عطا فرما دیئے تھے۔

حضرت علیؓ کا حضرت فاطمہؓ سے ناراض ہونا

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہؓ کو بغیر احرام کے دیکھا تو ناراض ہوئے۔ زرقانی فرماتے ہیں کہ ترمذی، نسائی اور ابوداؤد میں حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت فاطمہؓ کے پاس گئے تو دیکھا کہ انہوں نے نضوح (ایک خاص قسم کی خوشبو) لگا رکھی ہے جس کی خوشبو مہک رہی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ناراض ہوئے تو حضرت فاطمہؓ نے فرمایا: آپ ناراض کیوں ہوتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہؓ کو حکم فرمایا ہے اس لئے وہ احرام کھول چکے ہیں۔

حضرت علیؓ کی آمد اس وقت ہوئی جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابطح میں فروکش تھے، اس سے اس روایت کی تردید ہوجاتی ہے جو طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کی ہے کہ حضرت علیؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے وادئ عرفہ میں آکر ملے تھے۔ کذا فی البدایہ والنہایہ۔

آنحضرتؐ کا مکہ سے باہر قیام کرنا

پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر مکہ یعنی ابطح میں جو مکہ سے مشرقی جانب ہے چار دن ٹھہرے، درآنحالیکہ آپ اسی جگہ قصر کی نماز پڑھتے تھے۔ اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی وہ اذان اسی جگہ ہوئی تھی جس پر امام بخاری نے یہ عنوان قائم کیا ہے: باب المؤذن یتتبع فاہ ہٰہنا وہٰہنا، اور اس کے تحت حضرت ابوجحیفہؓ کی روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے حضرت بلالؓ کو دیکھا کہ وہ اذان دے رہے تھے، پس اذان میں منہ ادھر ادھر کر رہے تھے۔ اور البدایہ والنہایہ میں بروایت احمد ابوجحیفہؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت بلالؓ کو دیکھا کہ اذان کہہ رہے تھے اور گھوم رہے تھے، اور منہ ادھر ادھر کر رہے تھے، اور ان کی انگلیاں کانوں میں تھیں، اور رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم مسجد خیف میں فروکش تھے جو میرا خیال ہے کہ خیمے کا تھا۔ پس حضرت بلالؓ آپ کے آگے آگے
برچھی یا عصا لے کر عنزہ لے کر نکلے اور اسی کو زمین میں گاڑ دیا۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی۔
عبد الرزاق کہتے ہیں کہ میں نے ان سے یعنی اپنے شیخ سے اکثر یہی سنا فرماتے تھے کہ یہ قصہ بطحا کا ہے۔
صاحب ہدایہ نے اس مضمون کی متعدد روایات ذکر کی ہیں۔ ایک روایت میں حضرت ابو جحیفہؓ سے مروی
ہے کہ ظہر کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بطحا کی طرف نکلے پس وضو کیا الخ اور اسی روایت میں ہے
کہ پھر لوگ کھڑے ہوئے پس انہوں نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے چہروں پر ملنا شروع کیا۔ اھ یہ حدیث امام
بخاری نے بھی ذکر کی ہے۔

حضرت سعدؓ کی عیادت اور ان کے سارے مال کی وصیت کے بارے میں دریافت کرنے کا قصہ

ثانیاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام بطحاء کے دوران ہی حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی عیادت کرنے اور ان کے اپنے سارے مال کی وصیت کے بارے میں دریافت کرنے کا واقعہ پیش آیا جو حدیث میں معروف ہے۔ اور یہ تو عجب ہے جب کہ یہ واقعہ حجۃ الوداع کا ہو جیسا کہ زیلعیؒ میں ہے۔ البتہ بعض روایات میں ہے کہ یہ قصہ فتح مکہ کا ہے۔ مگر اول ہی راجح ہے کیونکہ وہ صحیحین کی روایت ہے اور فتح مکہ والی روایت ترمذی کی ہے۔ اگرچہ حافظؒ نے ایک اور حدیث بھی اس کی مؤید نقل کی ہے اور ان دونوں کے مابین تطبیق بھی دی ہے۔ جیسا کہ زیلعی کے حاشیہ میں کتاب الوصایا میں اس کی تفصیل ذکر کی گئی ہے۔

حدیث طبطبیہ کا قصہ

ثالثاً اسی مقام میں حدیث طبطبیہ کا واقعہ بھی پیش آیا جو امام ابو داؤدؒ نے باب تزویج من لم یولد میں نقل کیا ہے کیونکہ اس میں تصریح ہے کہ کردم کی آمد آپ کے حج میں ہوئی تھی اور مسند احمد کی روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کہیں
قصے یہ حدیث امام ابو داؤدؒ نے باب ما یؤمر بہ من وفاء النذر میں مختصراً ذکر کی ہے جس میں بوانہ میں
اونٹ ذبح کرنے کا قصہ مذکور ہے۔ امام احمدؒ نے یہ دونوں قصے ایک ہی حدیث میں ذکر کیے ہیں۔

کیا ان چار دنوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طواف کعبہ کے لئے گئے تھے؟

پھر میرے نزدیک ظاہر یہ ہے ان ایام میں جب کہ آپ بطحاء میں فروکش تھے۔ طواف کعبہ کے لئے آتے رہے بخلاف ان حضرات کے جو اس کے قائل

ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان ایام میں بیت اللہ کے قریب نہیں گئے۔ جیسا کہ پیچھے گزرا۔

باب کعبہ کے پاس آپ کا خطبہ

اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو ابن عربی نے الحافظ میں حضرت ابن عباسؓ سے نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حج میں باب کعبہ کا حلقہ پکڑا، پھر لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: اے مسلمانوں کی جماعت! من جملہ علامات قیامت کے یہ چیزیں ہیں۔ نماز کو غارت کرنا، نفسانی خواہشات کی پیروی کرنا، خیانت پیشہ حاکموں اور بدکار وزیروں کا ہونا" الخ اس طویل حدیث میں علامات قیامت اور ان گناہوں کا ذکر ہے جن میں یہ امت مبتلا ہوگی۔ اور یہ تو معلوم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب پہلے پہل بیت اللہ میں تشریف لائے تو بیت اللہ کا طواف کرنے کے بعد فوراً صفا کی طرف نکل گئے۔ اسی طرح یوم النحر کو منیٰ سے سواری پر تشریف لائے، اونٹ پر طواف کیا اور اس کے بعد بعض کے نزدیک سعی کی اور راجح قول کے مطابق ظہر سے قبل ہی منیٰ کو واپس تشریف لے گئے۔ جیسا کہ ابن عمرؓ کی حدیث سے ثابت ہے اور طواف وداع آپ نے رات کے وقت نماز صبح سے پہلے کیا تھا جیسا کہ اپنی جگہ آتا ہے۔ اس لئے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم [illegible] طواف کے لئے تشریف فرما ہوئے۔

اور یہ طویل حدیث جو ابن عربی نے ایک ورق میں نقل کی ہے، ارشاد فرمائی ہوگی۔ جس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ایام میں بھی طواف کیا۔ نیز اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ کی راتوں میں طواف کیلئے تشریف لاتے تھے جیسا کہ عنقریب آتا ہے اور میرے نزدیک یہ بعید ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ سے تین میل کے فاصلے سے تو طواف کے لئے تشریف لائیں اور خود مکہ میں قیام کے دوران طواف نہ کرتے ہوں۔ امام بخاریؒ کے ترجمۃ الباب "باب من لم یقرب الکعبۃ" پر لامع کے حاشیہ میں مفصل گفتگو کی گئی ہے۔ نیز اس کی مزید تائید اس سے ہوتی ہے کہ ۷ ذی الحجہ کا خطبہ حنفیہ، مالکیہ اور شافعیہ کے نزدیک سنت ہے۔

اور بظاہر وہ مسجد حرام ہی میں ہونا چاہئے۔ چنانچہ اوجز میں ہے کہ ابن المنذر فرماتے ہیں کہ حج کے تین خطبے ہیں پہلا ۷ ذی الحجہ کو نماز ظہر کے بعد مسجد حرام میں۔ اور اب اگر یہ خطبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابطح میں دیا ہوتا تو جو لوگ مکہ میں مقیم تھے وہ اس سے محروم رہ جاتے۔ نیز طبقات ابن سعد کی روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ آپ کے لئے ابطح میں خیمہ نصب کیا گیا تھا۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہیں

فلما کان یوم الخمیس ضحیٰ توجه الی منیٰ احرم بالحج من کان احل منهم

ترجمہ- پس جب جمعرات کو چاشت کا وقت آیا تو منی کا قصد کیا اور جو حضرات احرام کھول چکے تھے انھوں نے بھی احرام باندھ لیا۔

قرودگاہ کی طرف لوٹ گئے اور جب یوم الترویہ سے پہلا دن آیا یعنی ۷ ذی الحجہ تو آپ نے نماز ظہر کے بعد مکہ معظمہ میں خطبہ دیا۔

خطبات حج میں اختلاف

علماء اس کے قائل ہیں کہ یہاں ۷ ذوالحجہ کا خطبہ مسنون ہے۔ البتہ اس میں امام زفرؒ کا اختلاف ہے وہ اسے سنت نہیں کہتے بلکہ ان کے نزدیک تینوں خطبے پے در پے ہوں گے اور پہلا خطبہ ۸ ذی الحجہ کو ہوگا۔ حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک بھی تین ہی خطبے ہیں مگر پے در پے نہیں بلکہ پہلا خطبہ ۷ ذوالحجہ کو نماز ظہر کے بعد ہوگا جیسا کہ ذکر ہوا۔ اور دوسرا ۹ ذوالحجہ کو عرفات میں نماز ظہر سے قبل ہوگا۔ اور تیسرا ۱۱ ذوالحجہ کو منی میں نماز ظہر کے بعد ہوگا۔ اور شافعیہ کے نزدیک چار خطبے ہیں پہلے دو تو وہی ہیں جن کے حنفیہ اور مالکیہ قائل ہیں۔ اور تیسرا یوم النحر ۱۰ ذوالحجہ کو اور چوتھا ۱۲ ذوالحجہ کو۔ حنابلہ کی کتابوں میں مجھے ۷ ذوالحجہ کے خطبے کی تصریح نہیں ملی۔ البتہ شارحین نے ذکر کیا ہے کہ وہ چار خطبوں میں شافعیہ سے متفق ہیں۔

منی کو روانگی

پس جب جمعرات کو چاشت کا وقت ہوا۔ البحر میں اسی طرح ہے اور ابن حزمؒ نے بھی اسی کو ذکر کیا ہے جیسا کہ شرح مناسک نووی میں ہے اور اسی طرح المامفرو میں ہے۔ اور یہی معروف ہے۔ اس کے خلاف ایک قول آگے آتا ہے۔ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کے بعد منی کی طرف متوجہ ہوئے۔ تو اپنے رفقاء سمیت منی کا قصد کیا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ایک لکڑی پر کپڑا لٹکا ہوا تھا جس سے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سایہ کر رہے تھے۔ جیسا کہ البدایہ والنہایہ میں ہے۔ محرم کے سایہ میں بیٹھنے میں جو ائمہ کا اختلاف ہے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بالوں پر [illegible] کرنے کے بیان میں گزر چکا ہے۔

ابطح سے احرام باندھنا

اور جو حضرات احرام کھول چکے تھے انھوں نے بھی ابطح ہی سے احرام باندھ لیا۔ امام بخاریؒ نے ترجمۃ الباب قائم کیا ہے: باب الاھلال من البطحاء وغیرها للمکی۔ اور منی پہنچ کر وہاں قیام فرمایا اور نماز ظہر ادا کی جیسا کہ البدایہ میں ہے۔

وبات بہا حتیٰ طلعت الشمس

ترجمہ: اور رات کو وہاں قیام رہا یہاں تک کہ آفتاب طلوع ہوا۔

نیز زرقانی نے بھی یہی ذکر کیا ہے۔ اور جیسا کہ پہلے گزرا یہی معروف ہے۔ اور اوجز میں ابو عبیدہ قرطبی کی شرح موطا سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم روز جمعہ کی شام کو منیٰ کی طرف نکلے۔"

نووی اپنے مناسک میں فرماتے ہیں: "اور سنت کا رجحان منیٰ کی طرف مکہ سے نکلنا نماز صبح کے بعد ایسے وقت ہوگا کہ ظہر کی نماز منیٰ میں پڑھ سکیں۔ شافعیہ کا صحیح اور مشہور مذہب بھی ہے جو ان کی تصریحات سے ثابت ہے اور ایک قول یہ ہے کہ ظہر مکہ میں پڑھ کر نکلیں۔" اھ

سورۂ والمرسلات کا نزول

اور رات کو وہاں قیام رہا۔ اسی رات سورۂ والمرسلات نازل ہوئی جیسا کہ امام بخاری نے باب ما یقتل المحرم من الدواب کے ذیل میں حضرت ابن مسعودؓ سے روایت کیا ہے کہ "ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ منیٰ کی ایک غار میں تھے کہ آپ پر والمرسلات نازل ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تلاوت فرما رہے تھے اور میں آپ کی زبان مبارک سے اس کو حاصل کر رہا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ساتھ رطب اللسان تھے۔" حافظ فرماتے ہیں کہ اسماعیلی کی روایت میں ہے کہ یہ عرفہ کی شب تھی۔ انتہیٰ۔ بخاری وغیرہ کی روایات میں ہے کہ وہاں ایک سانپ نکلا تھا۔ صحابہ کرامؓ نے اس کو قتل کرنا چاہا مگر وہ اپنی بل میں داخل ہوگیا۔ یہاں تک کہ جمعہ کے دن کا آفتاب طلوع ہوا۔ اس میں اختلاف نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حج مبارک جمعہ کو ہوا۔

جمعہ کے حج کی فضیلت

مگر یہ بحث کہ آیا جمعہ کے حج کو کچھ مزید خصوصیت بھی حاصل ہے؟ اوجز میں اس پر مفصل کلام کیا ہے اور اس میں عبداللہ بن کریز کی حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "افضل دعا یوم عرفہ کی دعا ہے" الحدیث۔ زرقانی فرماتے ہیں کہ "تجرید الصحاح" میں اس حدیث کی شرح میں یہ الفاظ زیادہ ہیں "سب سے افضل دن عرفہ کا دن ہے جو جمعہ کے دن آئے اور ایسے دن کا حج دوسرے دنوں کے ستر حجوں سے افضل ہے"۔ حافظ اس حدیث پر گفتگو کرتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں کہ اگر اس حدیث کی کچھ اصل ہو تو احتمال ہے کہ ستر کے لفظ سے خاص عدد ہی مراد ہو یا محض کثرت میں مبالغہ مقصود ہو بہر صورت اس کی مزید خصوصیت ثابت ہوتی ہے۔ ابن قیم کی الہدیٰ میں ہے کہ "یہ جو عوام کی زبانوں پر مشہور ہے کہ جمعہ کا وقوف عرفات بہتر حج کے برابر ہے

فسار منها الی عرفة بطریق ضب

ترجمہ: پس وہاں سے عرفات کی طرف روانہ ہوئے، ضب کے راستہ سے۔

یہ غلط باطل ہے اس کی کوئی اصل نہیں، نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ کسی صحابی یا تابعی سے۔ زرقانی نے جو حدیث تجرید سے نقل کی ہے وہ صحیح النوادر میں بھی مذکور ہے۔ اور ملا علی قاری شرح لباب میں فرماتے ہیں کہ جمعہ کا وقوف دیگر ایام کے وقوف سے ستر درجے افضل ہے۔ نیز وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جس کا نام الحظ الاوفر فی الحج الاکبر ہے۔ اور رزین کی مذکورہ بالا حدیث کے بارے میں علامہ سخاوی فرماتے ہیں: اس کے ذکر کرنے میں رزین منفرد ہے، اس نے اس کے راوی صحابی کا بھی ذکر نہیں کیا نہ اس کے مخرج کا ———— اس کے بعد انہوں نے وہی بات ذکر کی ہے جو حافظ کے کلام میں گزر چکی ہے کہ اگر اس کی کچھ اصل ہو تو احتمال ہے الخ۔ پوری تفصیل اوجز میں ہے۔

منیٰ سے عرفات کو روانگی

پس وہاں سے عرفات کی طرف روانہ ہوئے کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثم افیضوا من حیث افاض الناس "پھر تم سب کو ضروری ہے کہ اسی جگہ ہو کر واپس آؤ جہاں اور لوگ جا کر وہاں سے واپس آتے ہیں" (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

حمس کا عرفات میں نہ جانا

امام بخاریؒ کتاب التفسیر میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ قریش اور ان کے ہم مشرب لوگ صرف مزدلفہ جا کر واپس آجاتے تھے اور حمس کہلاتے تھے، اور ان کے علاوہ باقی عرب عرفات میں وقوف کرتے تھے۔ پس جب اسلام آیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمایا کہ عرفات جائیں اور وہاں وقوف کرکے واپس آئیں۔ یہی مطلب ہے حق تعالیٰ کے ارشاد "ثم افیضوا من حیث افاض الناس" کا۔ البدایہ والنہایہ میں منیٰ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچ نمازوں کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے: پھر آپ تھوڑی دیر ٹھہرے یہاں تک کہ آفتاب طلوع ہوا، اور آپ کے حکم سے نمرہ میں بالوں کا خیمہ نصب کیا گیا، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روانہ ہوئے اور قریش کو یقین تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مشعر حرام کے پاس مزدلفہ میں ہی ٹھہریں گے جیسا کہ جاہلیت میں قریش کا دستور تھا۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مزدلفہ سے گزر کر عرفات پہنچ گئے۔ زرقانی نے شرح مواہب میں بھی اسی طرح ذکر کیا ہے اور یہ حضرت جابر کی طویل حدیث کے الفاظ ہیں۔

ضب کا راستہ

ضب کے راستے سے یعنی راستہ کی دائیں جانب سے جو آج کل لوگوں میں معروف ہے۔ اور المرقاۃ کے حاشیے میں ہے کہ ضب اس پہاڑ کا نام ہے جس کی جڑ میں مسجد

حتی اذا زالت الشمس سار حتی اتی بطن الوادی فخطب خطبۃ عظیمۃ۔

ترجمہ: یہاں تک کہ جب زوالِ آفتاب ہوا تو روانہ ہوئے یہاں تک کہ بطن وادی میں پہنچے۔ یہیں ایک عظیم الشان خطبہ دیا۔

"یہ عرفات میں ایک پہاڑ ہے جس پر حرم کے بت رکھے جاتے تھے" اور قاموس میں ہے "نمرہ عرفات میں ایک جگہ ہے یا وہ پہاڑ ہے جس پر حرم کے بت رہتے تھے۔ اس میں سے نکلو تو تمہاری دائیں جانب آئیگا" اور یہی حضرت ابن عمر کی حدیث سے ظاہر ہے جو ابوداؤد باب الخروج الی عرفۃ میں ان الفاظ سے مروی ہے "یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عرفہ پہنچے یہیں نمرہ میں فروکش ہوئے" اور یہی نمرہ فرودگاہ ہے امام کی جو اس جگہ عرفہ میں فروکش ہو"

اور اوجز میں ہے باب وقوف بعرفہ میں ہے کہ ان ظاہر کتب

بطن عرنہ عرفات میں داخل ہے یا نہیں؟

حدیث کے لئے تین چیزوں کی تحقیق کی ضرورت ہے کہ آیا عرفہ میں داخل ہیں یا نہیں۔ ایک بطن عرنہ، دوسری نمرہ جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خیمہ نصب کیا گیا، تیسری عرفات کی مسجد۔ اوجز میں بہت ہی تفصیل کے ساتھ ان پر بحث کی ہے اگر تفصیل و تحقیق کا شوق ہو تو وہاں کی مراجعت کرو۔ یہاں تک کہ جب زوال آفتاب ہوا تو اپنی ناقہ قصواء کو تیار کرنے کا حکم فرمایا وہ تیار کی گئی تو اس پر سوار ہو کر روانہ ہوئے یہاں تک کہ بطن وادی میں پہنچے۔ جو سرزمین عرنہ کا حصہ ہے۔ البدایۃ والنہایۃ اور مرقاۃ میں اسی طرح ہے اور بذل میں حضرت جابرؓ کی حدیث طویل کے الفاظ حتی اتی بطن الوادی کے تحت لکھا ہے کہ عرنہ عرفات میں ایک جگہ ہے جو عرنہ کہلاتی ہے۔ اور یہ عرفات کا حصہ نہیں بخلاف امام مالک کے کہ ان کے نزدیک یہ عرفات میں شامل ہے۔ اھ

اوجز میں بڑی تفصیل سے بحث کی گئی ہے کہ عرنہ عرفات میں داخل ہے یا اس سے خارج؟ خلاصہ اس میں ہے کہ ائمہ اربعہ متفق ہیں کہ وقوف عرنہ وقوف عرفہ کی جگہ کافی نہیں البتہ امام مالک کا ایک مرجوح قول ہے کہ یہی کافی ہے مگر ایسا کرنے والا گنہگار ہوگا۔ پس آپ نے سواری پر سے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے ایک عظیم الشان خطبہ دیا۔ یہ ایک خطبہ تھا یا دو تھے؟ اس میں اختلاف ہے جو آگے آتا ہے۔

اوجز میں اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث کی ہے کہ آیا وقوف

وقوف عرفات پیدل ہو یا سواری پر

عرفہ سواری پر افضل ہے یا پیدل؟ یا دونوں برابر ہیں؟ جمہور کا مذہب یہ ہے کہ سواری پر افضل ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سواری پر وقوف کیا تھا نیز اس

مقام میں دعا اور گریہ وزاری میں مبالغہ مطلوب ہے اور سواری سے اس پر خوب مدد مل سکتی ہے۔ اور شافعیہ و حنابلہ کا ایک قول یہ ہے کہ پیدل افضل ہے۔ اور امام شافعیؒ سے ایک قول یہ بھی منقول ہے کہ دونوں مساوی ہیں۔ تفصیل اوجز میں دیکھئے۔

آنحضرتؐ کا خطبہ عرفات

(ق) اس خطبے کا بیشتر حصہ سیرت ابن ہشام، ابن عربی کی "الحاضرہ" البدایہ والنہایہ اور زرقانی شرح مواہب میں مذکور ہے اس خطبے میں آپ نے ابن ربیعہ کے خون کے ساقط کرنے کا اعلان فرمایا جیسا کہ مسلم اور ابوداؤد میں ہے۔ ربیعہ کے اس بیٹے کا نام ایاس تھا۔ مسلم اور ابوداؤد کی بعض روایات میں "ربیعہ کے خون" کا لفظ ہے جسے ایک جماعت نے غلط قرار دیا ہے مگر غلط کہنے کی ضرورت نہیں۔ ربیعہ ولی دم تھا۔ اس لئے اس کی طرف نسبت کرنا مستبعد نہیں۔ اس خطبہ میں جاہلی سود کے موقوف ہونے کا اعلان کیا۔ اور ارشاد فرمایا کہ سب سے پہلے عباس بن عبدالمطلب کا سود ساقط کیا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ سب کا سب ساقط ہے۔ اس خطبہ میں یہ بھی ارشاد فرمایا "خوب یاد رکھو کہ جاہلیت کی ایک ایک چیز میرے قدموں کے نیچے پامال ہے"۔ اسی خطبہ میں یہ بھی ارشاد فرمایا "اے لوگو میرا خیال ہے کہ ہم اور تم اس مجلس میں پھر کبھی جمع نہیں ہوں گے"۔ حضرت ابوامامہؓ کی حدیث کے الفاظ اس سے زیادہ واضح ہیں۔ مگر اس میں عرفہ کی تصریح نہیں جیسا کہ کنز العمال میں ہے۔

میدان عرفات میں سواری پر آپ کا دودھ نوش فرمانا

(ق) ام الفضل بنت حارث رضی اللہ عنہا نے دودھ کا ایک پیالہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا جو آپ نے سب لوگوں کے سامنے اونٹ پر نوش فرمایا "التلخیص" نے ذیل میں یہاں بعیر (اونٹ) کے بجائے ناقہ کے لفظ کی تصویب کی ہے جس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ اول تو عام میں آپ کا ناقہ قصواء پر سوار ہونا مذکور ہے۔ لیکن اوجز میں مؤطا اور بخاری سے متعدد روایتیں نقل کی ہیں جن میں بعیر کا لفظ ہے۔ اور یکا تاویل یہ ہے کہ لفظ بعیر نر اور مادہ دونوں پر اطلاق کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ امام راغب اور صاحب قاموس وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ اور نسائی کی روایت میں جمل کا لفظ بھی منقول ہے اوجز میں یہ بھی ہے کہ متعدد وجوہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فعل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے منافی نہیں کہ جانوروں کی پشتوں کو منبر بنانے سے احتراز کرو (ابوداؤد) ایک وجہ یہ کہ نہی اس صورت پر محمول ہے جب کہ جانور کو مشقت لاحق ہو یا یہ کہ عرفہ میں سواری کا مندوب ہونا اس ممانعت سے مستثنیٰ ہے۔ میرے نزدیک آنحضر

جواب یہ ہے کہ یہ متنبی کے ذیل کے شعر کے قبیل سے ہے۔

لبست انا اذا ارتعشت الخیل   وانا اذا نزلت الخصام

جب تو گھوڑوں پر سوار ہو کر کانپتی ہوں تو ان کی جگہ میں ہوتا ۔ اور جب تو جھگڑوں میں مشغول ہو تو میں اپنی جگہ میں ہوں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سب کے سامنے ناقہ پر دودھ نوش فرمانا

حاجی کیلئے عرفہ کے روزے کا حکم | اس امر کے اظہار کے لئے تھا کہ آپ کا روزہ نہیں۔ متعدد روایات میں جو البدایہ والطالب ہیں ذکر کی گئی ہیں۔ یوم عرفہ میں روزے کی ممانعت آئی ہے۔ اور اس مسئلہ میں ائمہ کا اختلاف ہے جس کی تفصیل اوجز میں ہے۔ امام شافعیؒ اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ روزہ حاجی کے لئے سنت نہیں۔ امام اسحاقؒ فرماتے ہیں کہ اس کے لئے نفل سنت ہے۔ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ اس کے لئے سنت ہے بشرطیکہ ضعف نہ ہو۔ یہی حکم حنفیہ کے نزدیک ہے۔ اگر دعاؤں سے ضعف کا اندیشہ ہو تو ترک مستحب ہے اور ایک قول یہ ہے کہ مکروہ تحریمی ہے انتہی مختصراً۔ (ق) جب خطبہ سے فارغ ہوئے تو بلالؓ کو حکم فرمایا پس انہوں نے نماز کی اقامت کہی۔ یہ ابن حزم کا قول ہے جو وہم پر مبنی ہے اور صحیح یہ ہے کہ خطبہ کا اختتام وقوف عرفہ پر موقوف نہیں۔ اور درود حدیث کا قصہ عرفہ کا ہے جو موقف ہے۔

عرفات کا خطبہ ایک ہے یا دو؟ (ق) اس موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی خطبہ دیا تھا۔ دو خطبے نہیں تھے کہ ان کے درمیان میں بیٹھے ہوں (ق) ہدایہ میں ہے کہ امام دو خطبے پڑھے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی کیا تھا۔ جمہور کے نزدیک جن میں حنفیہ، شافعیہ اور مالکیہ بھی شامل ہیں یہ دو خطبے ہیں جیسا کہ اوجز میں ان کی فقہی کتابوں سے تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے۔ البتہ ابن تیمیہ کی گزشتہ بالا عبارت کے علاوہ حنابلہ کی کتابوں میں مجھے اس کی تصریح نہیں ملی۔ اور موفق کا یہ قول بھی اس کا مؤید ہے کہ امام ایک خطبہ پڑھے پھر اذان کا حکم کرے، جیسا کہ اوجز میں ہے۔ تعجب ہے کہ علامہ [illegible] نے مالکیہ کا یہ قول کیسے نقل کر دیا کہ ان کے نزدیک ایک خطبہ ہے۔ حالانکہ ان کی فقہی کتابیں اس کے خلاف ہیں جیسا کہ اوجز میں ہے اور خطبہ عرفات کے علاوہ حج کے جو دو خطبے اور ہیں ان میں ہمارے نزدیک بھی ایک ہی خطبہ ہے جیسا کہ فتح القدیر میں ہے۔ پوری بحث تحقیق بذل میں ہے۔ اسی میں یہ بھی ہے کہ اس میں اختلاف ہے کہ یوم عرفہ کا خطبہ نماز کے بعد تھا جیسا کہ امام مالکؒ سے منقول ہے یا نماز سے پہلے تھا جیسا کہ جمہور کے نزدیک ہے اور امام مالکؒ سے جو نماز کے بعد ہونا منقول ہے ان کی فقہی کتابوں

(قال) فلما اتمها امر بلالا فاذن فصلی الظهر رکعتین والعصر رکعتین ۔

ترجمہ: (ق) پس جب خطبہ سے فارغ ہوئے تو بلال کو حکم دیا پس انہوں نے اذان دی۔
پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی دو رکعتیں پڑھیں اور عصر کی دو رکعتیں ۔

کے خلاف ہے چنانچہ ان میں نماز سے قبل ہونے کی تصریح ہے اس مسئلہ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ
اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں جو اختلاف ہے کہ خطبہ نماز سے پہلے ہوا تھا یا بعد میں اس
کا جواب دیا گیا ہے کہ علماء کا عمل حدیث جابر پر ہے جس میں قبل نماز کی تصریح ہے اور حدیث ابن عمر معلول ہے۔
جیسا کہ نیل میں اس کی تفصیل موجود ہے۔

(ق) پس جب خطبہ سے فارغ ہوئے تو بلال کو حکم دیا پس انہوں نے اذان دی۔ حافظ ابن قیم
نے ابی ثور کی اس کو وہم قرار دیا ہے جو اس کے قائل ہیں کہ اذان خطبہ سے پہلے یا خطبہ کے دوران ہوئی۔
ابن تیمیہ کے نزدیک مختار یہ ہے کہ اذان تمام خطبے کے بعد ہوئی۔ اوجز میں ہے کہ موفق فرماتے ہیں: امام
خطبہ دے پھر اذان کا حکم کرے پھر اتر کر نماز پڑھے۔ اور امام نووی اپنے مناسک میں لکھتے ہیں جب
سورج ڈھل جائے تو امام ظہر سے پہلے دو خطبے پڑھے پس جب خطبہ ثانیہ کے لئے اٹھے تو مؤذن اذان
شروع کرے۔ اور امام دوسرا خطبہ اتنا مختصر پڑھے کہ ادھر مؤذن اذان سے فارغ ہو جائے ادھر امام
خطبے سے۔ اس میں ائمہ کا اختلاف ہے جس کی تفصیل اوجز میں ہے۔ چنانچہ بعض کا قول ہے کہ اذان خطبے
کے بعد ہو بعض کہتے ہیں کہ دونوں خطبوں کے درمیان ہو اور بعض کے قول کے مطابق اس وقت کہی جائے
جب کہ امام خطبہ میں مشغول ہو۔ اور حنفیہ کے نزدیک جب امام خطبہ کے لئے بیٹھے اس وقت اذان کہی
جائے اور امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ امام کے نکلنے سے پہلے اذان کہی جائے۔ اور ان سے ایک
روایت یہ ہے کہ خطبہ کے بعد ہو۔ کذا فی الہدایہ۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی دو رکعتیں پڑھیں یہاں
ابن حزم کو وہم ہوا ہے وہ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ پڑھا۔ اکثر ان کا [?] اس پر متفق ہیں
کہ امام ظہر کی نماز پڑھے خواہ جمعہ کا دن ہو جیسا کہ اوجز میں مفصل ذکر کیا گیا ہے۔

اور اسی طرح ہی عصر کی دو رکعتیں پڑھیں [?]

عرفات میں اذان و اقامت کی تعداد میں اختلاف | نمازیں ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ ہوں گی۔
موفق فرماتے ہیں: امام خرقی کے اس قول سے کہ اگر اذان دے تو مضائقہ نہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلی

نماز کے لئے اذان کہنے یا نہ کہنے کا اختیار ہے۔ امام احمد کا یہی قول ہے۔ مگر اذان کہنا بہتر ہے۔ امام شافعی اور اصحاب رائے کا یہی قول ہے۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ ہر نماز کیلئے اذان کہی جائے۔" اور دوسرے مسئلہ اقامت میں ناقلین مذہب کا اختلاف ہے۔ اس مسئلہ میں بعض ناقل سے تحریف ہوئی ہے، اور مذاہب کی تفصیل حاشیہ ہدایہ میں نہایہ سے نقل کی گئی ہے۔ اور اس میں علماء کے چند مذہب ذکر کئے گئے ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ حنفیہ کا مسلک ایک اذان اور دو اقامتوں کا ہے۔ امام احمد کا راجح قول بھی یہی ہے جیسا کہ المغنی میں ہے اور یہی امام شافعی کا مسلک ہے، نووی نے شرح مسلم میں اسکی تصریح کی ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں: "پہلی نماز کے لئے اذان کہے اور ہر ایک کے لئے اقامت کہے، اور ان دونوں کے درمیان تفریق نہ کرے۔ یہ تمام مسائل ہمارے ہاں متفق علیہ ہیں" اور دوسرے بعض مالکی بھی دو اذانوں اور دو اقامتوں کی تصریح کی۔ چنانچہ فرماتے ہیں: "پھر خطبہ سے فارغ ہو تو ظہر کے لئے اذان و اقامت کہے۔ درانحالیکہ امام منبر پر ہو۔ جب اقامت سے فارغ ہو تو امام منبر سے اترے اور ظہر و عصر کو جمع کرے بایں طور کہ عصر کے لئے الگ اذان و اقامت ہو" خلاصہ یہ کہ جمع عرفات میں اکثر علماء کے نزدیک ایک اذان اور دو اقامتیں ہوں گی۔ اور مالکیہ کے نزدیک دو اذانیں اور دو اقامتیں۔

اس نماز میں اہل مکہ نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء کی تھی، جو لوگ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے بعد فرمایا تھا کہ "اپنی نماز پوری کر لو" یہ وہم ہے کیونکہ یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ میں فرمائی تھی نہ یہ بات الہدی میں شیخ ابن قیم نے کہی ہے اور ان سے پہلے یہی بات ان کے شیخ شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے اپنے فتاوٰی میں کہی ہے اور صاحب البدایہ والنہایہ نے اسی پر جزم کیا ہے۔ شیخ ابن قیم کہتے ہیں: "اسی بنا پر علماء کا صحیح قول یہ ہے کہ اہل مکہ عرفات میں قصر اور جمع کریں گے۔ اور یہ اس امر کی واضح تر دلیل ہے کہ سفر کسی معین مسافت یا معین ایام کے ساتھ محدود نہیں۔ اور عرفات کے قصر میں مناسک حج از البانی میں کتاب اور شیخ ابن قیم کے کلام میں یہ بحث ہے کہ ابوداؤد طیالسی کی روایت کے مطابق حضرت عمران بن حصین کی حدیث کے بعض طرق میں یہ الفاظ ہیں: "میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حنین اور طائف میں حاضر ہوا تو آپ دو رکعتیں پڑھ رہے تھے۔ پھر میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج و عمرہ کیا۔ تو آپ نے دو رکعتیں ہی پڑھیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اہل مکہ! تم اپنی نماز پوری کر لو ہم مسافر ہیں۔ پھر میں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حج و عمرہ کیا۔ انہوں نے دو رکعتیں

پڑھیں، پھر سلام پھیرنے کے بعد کہا: اپنی نماز پوری کرو ہم مسافر ہیں۔ اھ۔ اس حدیث میں اگرچہ منیٰ یا عرفہ کی تصریح نہیں، تاہم اتنی تصریح تو موجود ہے کہ حج کے موقعہ پر بھی یہ ارشاد فرمایا تھا۔

منیٰ اور عرفات میں قصر اور جمع کے سبب میں اختلاف

پھر اس میں اختلاف ہے کہ عرفات میں قصر اور جمع کا سبب افعالِ حج ہیں یا سفر؟ ابن تیمیہ کا میلان اس طرف ہے کہ یہ دونوں سفر کی وجہ سے ہیں، لیکن ان کے نزدیک نہ کسی تعیین مسافت کی تحدید ہے نہ دنوں کی۔ اور میرے نزدیک یہی امام مالک کے قول کا حاصل ہے جیسا کہ آگے آتا ہے۔ اور اوجز میں اس پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ اور ہمارے احناف کے نزدیک دونوں نمازوں کو جمع کرنے کا سبب افعالِ حج ہیں اور قصر کا سبب سفر ہے۔ اوجز میں ہے کہ: اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ اہل مکہ منیٰ میں پوری نماز پڑھیں گے یا قصر کریں گے، امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ مکہ میں پوری پڑھیں اور منیٰ میں قصر کریں۔ اسی طرح اہل منیٰ منیٰ میں پوری پڑھیں اور مکہ و عرفات میں قصر کریں۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ یہ مقامات اس مسئلہ کے ساتھ مخصوص ہیں کیونکہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفہ میں قصر پڑھی تو آپ کی اقتدا میں بلا امتیاز سب لوگوں نے قصر پڑھی۔ یہ مسئلہ کہ اہل مکہ منیٰ میں قصر کریں گے حضرت ابن عمرؓ وغیرہ اور امام اوزاعیؒ اور اسحاقؒ سے بھی منقول ہے، یہ حضرات فرماتے ہیں کہ قصر ہی ان مقامات میں سنت ہے۔ منیٰ اور عرفات میں صرف وہ لوگ پوری نماز پڑھیں گے جو وہاں مقیم ہوں۔ امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور اکثر اہل علم اس کے قائل ہیں کہ اہل مکہ منیٰ اور عرفات میں قصر نہیں کریں گے کیونکہ مسافتِ سفر مفقود ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اکثر شروح میں یہ بات زبان زد ہے کہ امام مالکؒ کے نزدیک قصر افعالِ حج کی وجہ سے ہے، سفر کی بنا پر نہیں۔ مگر یہ صحیح نہیں، جیسا کہ اوجز میں مالکیہ کی فقہی کتابوں سے تفصیل نقل کی گئی ہے۔ اور حاشیہ لامع میں ہے: اور میرے نزدیک اوجہ یہ ہے کہ قصر امام مالکؒ کے نزدیک بھی سفر ہی کی وجہ سے ہے، جیسا کہ خود امام مالکؒ نے مؤطا میں تصریح کی ہے، وہ فرماتے ہیں: "نمازِ یومِ عرفہ میں ظہر ہی کی ہے مگر سفر کی وجہ سے کم ہو گئی"۔ یہ امام مالکؒ کی جانب سے صاف تصریح ہے۔ البتہ مکہ سے منیٰ، منیٰ سے عرفات، عرفات سے مزدلفہ، مزدلفہ سے منیٰ اور وہاں سے مکہ آنے جانے کو امام مالکؒ سفرِ واحد سمجھتے ہیں کیونکہ احرام کی وجہ سے لازم ہے۔ ورنہ اگر قصر افعالِ حج کی وجہ سے ہوتا تو مکہ اور منیٰ کے حجاج اپنے وطن میں بھی قصر کرتے۔ اھ

یہ تمام بحث تو قصر کی تھی رہا دونوں نمازوں کو جمع کرنا، سو وہ ہمارے احناف کے نزدیک بھی افعال حج کی وجہ سے ہے۔ البتہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس کے لئے چند شرائط ہیں جن کی تفصیل حاشیہ لامع میں ذکر کی گئی ہے۔ اور بخاری میں ہے کہ: ابن عمرؓ سے جب امام کے ساتھ نماز فوت ہو جاتی تب بھی جمع کرتے۔ پس شیخ لامع فرماتے ہیں: یہ ان کا اجتہاد تھا۔ اور ہمارے نزدیک جمع چند شرائط کے بغیر جو اپنے محل میں مذکور ہیں جائز نہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جمع بین الصلوتین اس قیاس کے خلاف ہے جو نص سے ثابت ہے اور وہ یہ ہے: حق تعالیٰ کا ارشاد "ان الصلوۃ کانت علی المؤمنین کتابا موقوتا" یعنی بے شک نماز مسلمانوں پر فرض ہے اور وقت کے ساتھ محدود ہے۔ لہٰذا دونمازوں کا جمع کرنا مخالف نص ہے۔ پس محدود رہے گا اور اس کا تعدیہ صحیح نہ ہوگا کہ منفرد وغیرہ کے حق میں بھی جائز ہو جو مورد نص کے حکم میں نہیں۔ اھ

اور اس کے حاشیہ میں ہے: پس اگر اس کو امام کے ساتھ نماز نہ ملے تو اپنی جگہ نماز پڑھے پھر منفرد بھی اسی طرح دونوں نمازوں کو جمع کرے جس طرح امام کے ساتھ جمع کرے گا۔ یہ امام شافعیؒ امام مالکؒ، امام احمدؒ اور صاحبینؒ کا قول ہے۔ اور امام ثوریؒ، امام نخعیؒ اور امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ امام کے بغیر جمع کرنا صحیح نہیں۔ اور ہدایہ میں ہے کہ جس شخص نے اپنی قیامگاہ میں تنہا ظہر پڑھی، امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک وہ عصر کو اس کے وقت میں پڑھے۔ اور صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ منفرد بھی دونوں نمازوں کو جمع کرے۔ کیونکہ دو نمازوں کو ایک وقت میں جمع کرنا اس مقصد کے لئے جائز قرار دیا گیا ہے تا کہ وقوف کے لئے زیادہ وقت میسر آئے۔ اور منفرد بھی اس کا محتاج ہے۔ اور امام ابو حنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ وقت کی پابندی کا فرض ہونا نصوص سے ثابت ہے۔ لہٰذا اس کا ترک کرنا صرف اسی صورت میں جائز ہوگا جس میں شریعت کا استثنائی حکم وارد ہو۔ اور وہ صرف امام کی معیت میں جماعت کے ساتھ جمع کرنے کی صورت میں وارد ہے۔ اھ۔ اور صاحب لباب نے جمع عرفات کی چھ شرطیں ذکر کی ہیں۔ ان میں سے بعض تو ہمارے ائمہ کے نزدیک متفق علیہ ہیں۔ اور بعض میں اختلاف ہے۔ میں نے حاشیہ لامع میں ان کو ذکر کر دیا ہے۔

فلما فرغ ركب حتى اتى الموقف واستقبل القبلة وهناك اتى اهل نجد

ترجمہ: پس جب فارغ ہوئے تو سوار ہو کر موقف میں پہنچے۔ اور قبلہ کی طرف رخ کیا۔ اسی موقع پر اہل نجد آئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وقوف عرفات

پس جب نماز سے فارغ ہوئے تو سوار ہو کر موقف میں پہنچے جبل رحمت کے نیچے چٹانوں کے پاس وقوف فرمایا۔ زرقانی نے صخرات پر حضور کے جائے قیام کو تفصیل سے لکھا ہے۔ نیز ابن عابدین اور صاحب شفاء الغرام نے بھی خوب مفصل لکھا ہے۔ اور قبلہ کی طرف رخ کیا اور دعا و تضرع میں مشغول ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقام پر جو دعائیں فرمائیں انہیں صاحب البدایہ والنہایہ نے اور زرقانی نے شرح مواہب میں تفصیل سے نقل کیا ہے۔

حج وقوف عرفہ کا نام ہے

اسی موقع پر اہل نجد کے کچھ لوگ آئے اور انہوں نے حج کے بارے میں دریافت کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حج وقوف عرفہ کا نام ہے الخ۔ کذا فی الہدی۔ میں کہتا ہوں کہ یہ حدیث معروف ہے جس کو ابوداؤد، نسائی اور ترمذی وغیرہ نے روایت کیا ہے اس کی روایات کے الفاظ کا اختلاف بذل میں مفصل ذکر کیا ہے۔

وقوف عرفہ بالاجماع رکن ہے

اور اوجز میں ہے کہ اس پر امت کا اجماع ہے کہ وقوف عرفہ رکن ہے اس کے بغیر حج پورا نہیں ہوتا۔ بہت سے شارحین حدیث اور ناقلین مذہب نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ اس مسئلہ میں علماء کے درمیان ذرا بھی اختلاف نہیں بجز اس کے جو امام رازیؒ نے حسن بصریؒ سے نقل کیا ہے کہ وقوف عرفہ واجب ہے اور اگر یہ فوت ہو جائے تو مقام حرم کا وقوف اس کے قائم مقام ہو سکتا ہے۔ اور دیگر تمام فقہاء نے اس کا انکار کیا ہے۔ اور ان کا اس پر اتفاق ہے کہ حج وقوف عرفہ کے بغیر ادا نہیں ہوگا۔

وقوف عرفہ کا وقت

البتہ علماء کا اس سلسلہ میں چند مسائل میں اختلاف ہے۔ اول یہ مسئلہ کہ عرفہ کا حدود اربعہ کیا ہے؟ اوجز میں اس کو مفصل ذکر کیا ہے۔ دوم یہ مسئلہ کہ وقوف عرفہ کا وقت کب سے کب تک ہے۔ اوجز میں اس کی تفصیل ذکر کرنے کے بعد آخر میں لکھا ہے: اس سے معلوم ہوا ہوگا کہ فرض وقت کے اختلاف کا حاصل تین اقوال ہیں۔ اول یہ

عرفہ کی صبح صادق سے یوم النحر کی صبح صادق تک۔ یہ امام احمدؒ کا قول ہے۔

دوم شب یوم النحر۔ غروب سے طلوع صبح تک یہ امام مالکؒ کا قول ہے۔

سوم: یوم عرفہ کے زوال سے یوم النحر کی صبح صادق تک یہ امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کا قول ہے اور بعض نے اس پر اجماع بھی نقل کیا ہے۔

اور وقت وجوب میں دو قول ہیں۔ اول رات اور دن کو جمع کرنا۔ خواہ ان دونوں کے کسی بھی وقت میں متصل ہو۔ یہ امام مالکؒ کا قول ہے۔ جیسا کہ دردیر نے تصریح کی ہے۔ اور صاحب الروض المربع نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ اور نوویؒ نے اپنے مناسک میں اسی کو ذکر کیا ہے۔

دوم حنفیہ اور عامہ حنابلہ کا قول ہے کہ جب دن کو وقوف کیا ہو تو اس کو بعد غروب تک لمبا کرنا واجب ہے۔ ملا علی قاری اور المغنی وغیرہ نے اسی کو ذکر کیا ہے اور اگر دن کو وقوف کا اتفاق نہیں ہوا تو رات میں لمبا کرنا واجب نہیں۔"

وقوف عرفات کی حکمت

مخفی نہ رہے کہ مقام عرفات کو وقوف کے لئے منتخب کرنے کی کئی حکمتیں ذکر کی گئی ہیں مگر سب سے بہتر حکمت اس ناکارہ کے نزدیک یہ ہے کہ عرفات ہی وہ جگہ ہے جہاں عہد الست ہوا تھا۔ چنانچہ مشکوٰۃ میں بروایت احمد حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے موضع نعمان یعنی عرفہ میں اولاد آدم سے عہد لیا۔ الحدیث۔ گویا وقوف عرفات کے ذریعہ وہ عہد یاد دلایا جاتا ہے۔ جو اسی جگہ اولاد آدم (علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) سے لیا گیا تھا۔

عرفات کے علاوہ کسی اور جگہ عرفہ منانا

یہاں اس بات پر تنبیہ کرنا بھی مناسب ہے کہ ہمارے نزدیک تعریف مکروہ ہے۔ تعریف سے مراد یہ ہے کہ جس طرح عرفہ کے دن حجاج وقوف عرفہ کرتے ہیں۔ ان کی نقل اتارنے کے لئے دوسرے لوگ بھی اپنی بستی سے نکل کر کسی کھلے میدان میں جمع ہوں، جیسا کہ فقہ حنفی میں تصریح ہے۔ اور مالکیہ کے نزدیک اس میں کوئی مضائقہ نہیں جیسا کہ الدسوقی میں ہے۔ اور شرح مہذب میں ہے کہ غیر عرفات میں عرفہ منانے میں سلف کا اختلاف ہے۔ اثرم کہتے ہیں کہ میں نے امام احمد بن حنبلؒ سے اس کے بارے میں

وھناک استجیب دعاء المغفرۃ فیما عدا المظالم وھناک سقط رجل عن راحلتہ فمات

ترجمہ: اور اس جگہ باہمی حق تلفیوں کے ماسوا میں دعائے مغفرت قبول ہوئی۔ اور اسی جگہ ایک آدمی اپنی سواری سے گر کر جاں بحق ہو گیا۔

دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا: میں امید کرتا ہوں کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہوگا۔ اور حسنؒ، ثابتؒ اور ان کے علاوہ کئی حضرات یہ عمل کیا کرتے تھے کہ وہ عرفہ کے دن مسجد میں جمع ہو جاتے تھے۔ اور ایک جماعت نے جن میں نافع نخعی حماد اور مالکؒ بن انس وغیرہ شامل ہیں، اس کو مکروہ قرار دیا ہے اور ابوبکر طرطوشی مالکی نے بدعات حنکرہ پہ ایک کتاب لکھی ہے اور ان بدعات میں اس تعریف کو بھی ذکر کیا ہے۔

باہمی حق تلفیوں کے ماسوا میں دعائے مغفرت کا قبول ہونا اور اسی جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے لئے دعائے مغفرت فرمائی چنانچہ انسانوں کی باہمی حق تلفیوں کے ماسوا میں آپ کی دعائے مغفرت قبول ہوئی جیسا کہ خمیس، بدایہ والنہایہ، اور زرقانی کی شرح مواہب میں ہے اور مزدلفہ میں حقوق کے بارے میں بھی دعا قبول ہوئی جیسا کہ آگے مفصل آتا ہے۔

عرفات میں ایک حاجی کا انتقال اور اسی جگہ مسلمانوں میں سے ایک آدمی جس کا نام غیر معروف ہے بحالت احرام اپنی سواری سے گر کر جاں بحق ہو گیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا کہ اس کو احرام کی دو چادروں میں دفن کیا جائے۔ یہ حدیث تمام کتابوں میں معروف ہے، اس قصہ سے کئی احکام ثابت ہوتے ہیں جن میں سے بارہ حکم حافظ نے تفصیل سے ذکر کئے ہیں۔ ان میں سے دو مشہور و معروف ہیں اول یہ کہ محرم کے لئے چہرے کا ڈھانکنا مختلف فیہ ہے، امام شافعیؒ اور ایک روایت میں امام احمدؒ اس کو جائز کہتے ہیں، اور امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ اور ایک روایت میں امام احمدؒ اس کو ممنوع قرار دیتے ہیں۔ یہاں ایک تیسرا شاذ قول ہے کہ اگر زندہ ہو تو ڈھانکنا جائز ہے اور مر جائے تو ناجائز۔ یہ ابن حزم کا قول ہے۔

میں کہتا ہوں کہ حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ زندہ کے لئے جائز نہیں اور مرنے کے بعد جائز ہے۔

موت کے بعد احرام باقی رہتا ہے یا نہیں؟ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ موت کے بعد احرام باقی رہتا ہے یا نہیں؟ چنانچہ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک موت کے بعد احرام باقی رہتا ہے۔ اور امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک احرام ختم ہو جاتا ہے۔

شیخ قدس سرہ نے کوکب دری میں اس مسئلہ پر بہت عمدہ اور لطیف کلام کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: "اس مسئلہ میں علماء نے اختلاف کیا ہے بعض حضرات بشمول امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اس کا احرام باقی رہتا ہے اور بعض حضرات جن میں حضرت امام اعظم بھی شامل ہیں، فرماتے ہیں کہ موت سے احرام پورا ہو کر ختم ہو جاتا ہے۔ امام شافعیؒ اور ان کے موافقین کا استدلال اس حدیث سے ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا سر ڈھانکنے کی ممانعت فرمائی اور اس کی علت یہ بیان فرمائی کہ وہ قیامت کے دن تلبیہ، تہلیل کہتا ہوا اٹھے گا۔ اور امام صاحبؒ اور ان کے موافقین فرماتے ہیں کہ دنیوی احکام کے اعتبار سے اس کا احرام منقطع ہو چکا کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "جب آدمی مر جاتا ہے تو اس کا عمل ختم ہو جاتا ہے۔ ماسوا تین چیزوں کے، صدقہ جاریہ، یا ایسا علم جس سے نفع اٹھایا جائے، یا نیک اولاد جو اس کے لئے دعا کرے" یہ ارشاد نبوی اپنے عموم کے اعتبار سے محرم کو بھی شامل ہے۔ رہا یہ واقعہ تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ احرام ختم نہیں ہوتا بلکہ اس میں یہ احتمال ہے کہ یہ ان صاحب کی خصوصیت ہو، اس بات کی تائید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہوتی ہے جو اسی حدیث میں وارد ہے جس سے یہ حضرات استدلال کرتے ہیں یعنی آپ نے ارشاد فرمایا: "اس کو پانی اور بیری کے پتوں سے غسل دو" چونکہ بیری کے پتے میل کچیل کو صاف کرتے ہیں، سر کی جوئیں کو مارتے اور بالوں کو نرم کرتے ہیں اس لئے ان کا استعمال محرم کے لئے ممنوع ہے، عجب کہ ان صاحب کو اس سے غسل دینے کا حکم فرمایا ہے، رہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی کہ "وہ قیامت کے دن تلبیہ پڑھتے ہوئے اٹھے گا" اس سے ان حضرات نے یہ سمجھا ہے کہ اس جملہ میں اس کا سر نہ ڈھکنے کی علت بیان فرمائی ہے یعنی اس کے احرام کا باقی ہونا۔ مگر یہ ظاہر نہیں، نہ ان کے پاس اس کی کوئی دلیل ہے، بلکہ اس میں "فا" تعقیب کے لئے ہے جو صرف ایک فضیلت کو بیان کرنے کے لئے لائی گئی ہے۔ اور اس جملہ سے ان صاحب کی نیز ہر اس شخص کی فضیلت بیان کرنا مقصود ہے جو کسی نیک عمل کی حالت میں مر جائے کہ وہ اسی حالت میں اٹھایا جائے گا گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو نیکیاں جمع کرنے اور گناہوں سے پرہیز کرنے کی ترغیب دی کیونکہ کسی کو کچھ معلوم نہیں کہ وہ کس وقت لقمۂ اجل اور نشانۂ حوادث بن جائے۔ اور یہ تو سب کو مسلم ہے کہ لوگ جن احوال و اعمال میں مرے ہوں گے قیامت کے دن انہیں حالات میں اٹھیں گے۔ اس صورت میں اس شخص کا قیامت کے دن تلبیہ کہتے ہوئے اٹھنا سر کے نہ ڈھانکنے پر موقوف نہیں، بلکہ یہ دو صورت

وھذا کے نزلت علیہ الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم
الاسلام دیناً ہ

ترجمہ: اور اسی جگہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی: الیوم اکملت الخ یعنی آج کے دن تمہارے
لئے تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا۔ اور میں نے تم پر اپنا انعام تمام کر دیا اور میں نے اسلام کو تمہارا دین
بننے کے لئے پسند کر لیا۔ (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

میں وہ تلبیہ کہتے ہوئے اٹھے گا۔ دیکھئے ایک شخص کا انتقال سجدہ کی حالت میں ہو جاتا ہے تو وہ قیامت
میں بحالت سجدہ اٹھے گا۔ کیا ہمارے لئے جائز ہوگا کہ ہم اسے قبر میں بٹھا دیں کیونکہ اسے سجدہ کی
حالت میں اٹھنا ہے اس لئے کیا اسے اسی حالت میں رکھا جائے گا؟ اس کا کوئی بھی قائل نہیں۔ پس
اسی طرح محل متنازع فیہ میں سمجھنا چاہئے۔ حاصل یہ کہ احکام دنیویہ کو آخرت کے احکام پر قیاس نہیں
کیا جا سکتا۔ اس لئے جزئی واقعہ سے قاعدہ کلیہ کو وضع نہیں کر سکتا، جب کہ اس میں دیگر احتمالات
بھی ہیں۔ جن کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انتہی۔

آیت: الیوم اکملت لکم دینکم کا نازل ہونا

(ق) اور اسی جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت
نازل ہوئی: الیوم اکملت الخ یعنی آج کے دن
تمہارے لئے تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا اور میں نے تم پر اپنا انعام تمام کر دیا۔ اور میں نے اسلام
کو تمہارا دین بننے کے لئے پسند کر لیا۔ (ترجمہ حضرت تھانویؒ) اس آیت کے نازل ہونے پر ناقہ بیٹھ گئی۔
کرمانی، عینی اور مجمع الفوائد میں ہے کہ اس آیت کا نزول جمعہ کے دن عصر کے بعد ہوا۔ اس وقت نبی
کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ناقہ عضباء پر عرفات میں وقوف فرما تھے۔ نزول آیت کے وقت قریب تھا کہ
شدت ثقل کی وجہ سے اس کی ٹانگیں ٹوٹ جائیں۔ اس لئے ناقہ نے گھٹنے ٹیک دیئے۔ صحیح بخاری میں
طارق بن شہاب سے روایت ہے کہ یہود نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ تم ایک آیت پڑھتے ہو اگر وہ ہمارے
ہاں نازل ہوئی ہوتی تو ہم اس کے نازل ہونے کے دن کو عید بنا لیتے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ مجھے
خوب معلوم ہے کہ وہ کس جگہ نازل ہوئی، کب نازل ہوئی اور اس کے نزول کے وقت آنحضرت صلی
اللہ علیہ وسلم کہاں تشریف فرما تھے۔ یہ آیت جمعہ کے دن نازل ہوئی اور واللہ اس وقت ہم عرفہ
میں تھے۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ جمعہ کا دن تھا اور اس میں پانچ عیدیں جمع تھیں۔ جمعہ، عرفہ،

فلما غربت الشمس افاض من عرفة

ترجمہ۔ پس جب آفتاب غروب ہوا تو عرفات سے چلے۔

عید میسو، عید نصاریٰ، عید مجوس۔ تمام اہل ملل کی عیدیں نہ اس سے پہلے کبھی جمع ہوئیں نہ اس کے بعد۔

اس آیت کے نازل ہونے پر حضرت عمر کا رونا

ہارون بن عنترہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ رونے لگے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رونے کا سبب دریافت کیا، تو عرض کیا "رونا تو اس کا ہے کہ اب تک تو ہمارے دین میں ترقی و اضافہ ہو رہا تھا۔ لیکن اب وہ کامل ہو چکا اور قدرتی بات ہے کہ جب کوئی چیز حد کمال کو پہنچ جاتی ہے تو (ہر کمالے را زوالے کے مطابق) اس میں کمی اور تنزل شروع ہو جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا "سچ کہتے ہو"۔ اس آیت کے بعد حلال و حرام اور فرائض و احکام کی کوئی آیت نازل نہیں ہوئی۔ اور اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکیاسی دن اس عالم فانی میں رہے یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے گویا پیغام وصال تھا۔ ۱۲ م

عرفات سے روانگی کا وقت

پس جب آفتاب غروب ہوا۔ اور اچھی طرح غروب ہو گیا۔ تو عرفات سے چلے۔ ملا قاری لکھتے ہیں: اگر کوئی شخص غروب سے پہلے چلا جائے تو جماعت فقہاء کے قول میں اس کا حج صحیح ہے۔ البتہ امام مالک فرماتے ہیں کہ اس کا حج نہیں ہوا۔ ابن عبد البر فرماتے ہیں کہ فقہاء امصار میں سے کسی کا ہمیں علم نہیں جو امام مالک کے قول کا قائل ہو۔

غروب سے پہلے عرفات سے چلنا

موفق آگے لکھتے ہیں: جو شخص غروب سے پہلے چل پڑے اکثر اہل علم کے نزدیک اس پر دم لازم ہے۔ امام شافعی اصحاب رائے اور ان کے متبعین کا یہی مذہب ہے۔ نیز فرماتے ہیں: لوگوں کو امام سے پہلے چلنا مناسب نہیں۔ امام احمد کا قول ہے کہ مجھے یہ بات پسند نہیں کہ کوئی شخص امام سے پہلے جائے۔ ان سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص ہودج کے ساتھ امام سے پہلے چل دیتا ہے؟ تو فرمایا کہ میں نے کسی عالم کو نہیں پایا کہ وہ اس معاملہ میں نرمی کرتا ہو۔ سب ہی سختی کرتے ہیں۔ ہمارا حنفیہ کا مسلک جیسا کہ لباب میں ہے یہ ہے کہ اگر کوئی شخص غروب آفتاب سے پہلے حدود عرفہ سے نکل جائے تو اس کے ذمہ دم لازم ہے کیونکہ بعد غروب تک عرفہ میں ٹھہرنا واجب ہے۔ جیسا کہ عنقریب گذرا۔ اور شرح لباب

من طریق المأزمین۔
ترجمہ: مأزمین کے راستے سے۔

میں مزدلفہ سے منیٰ کی طرف چلنے کے بیان میں ہے: "حاصل یہ کہ مزدلفہ سے امام کے ساتھ چلنا سنت ہے۔ بخلاف عرفہ کے کہ وہاں سے امام کے ساتھ چلنا واجب ہے۔"

مزدلفہ پہنچنے سے پہلے مغرب کی نماز پڑھنے کا حکم

باقی رہا نماز مغرب کا مسئلہ، تو موفق فرماتے ہیں: "جو شخص عرفہ سے چلے اس کے لئے سنت یہ ہے کہ مزدلفہ پہنچنے سے پہلے مغرب نہ پڑھے اور مزدلفہ پہنچ کر مغرب وعشاء کو جمع کرے۔ اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔" کذا فی الاوجز۔ اور "باب النزول بین عرفۃ والمزدلفۃ" کے ذیل میں حافظ نقل کرتے ہیں کہ "حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ نماز نہیں مگر مزدلفہ میں" اور کوفیین اور ابن قاسم سے منقول ہے کہ اگر کسی نے مزدلفہ سے پہلے پڑھ لی تو اعادہ واجب ہے۔ اور امام احمدؒ سے مروی ہے کہ اگر پڑھ لی تو صحیح ہوگی۔ امام ابو یوسفؒ اور جمہور کا یہی قول ہے۔" اور اوجز میں ہے کہ مزدلفہ پہنچنے سے پہلے مغرب پڑھ لی اور مغرب وعشاء کو جمع نہیں کیا تو اس نے سنت کے خلاف کیا مگر نماز صحیح ہوگی۔ یہ امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ، امام اسحاقؒ اور ابو یوسفؒ کا قول ہے۔ اور امام ابو حنیفہؒ اور امام ثوریؒ فرماتے ہیں کہ نماز صحیح نہیں ہوگی۔ پوری تفصیل اوجز میں ہے۔ اور حنفیہ کی دلیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "نماز تمہارے آگے ہے" جو عنقریب آتا ہے۔

مأزمین کا راستہ

(عرفات سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی واپسی) مأزمین کے راستے سے ہوئی۔ شرح لباب کے حوالے سے پہلے گذر چکا ہے کہ عرفہ کی طرف ضب کے راستے سے جانا اور وہاں سے مأزمین کے راستے سے واپس آنا مستحب ہے۔ کرمانی کہتے ہیں کہ مأزمان: میم کا فتح، ہمزہ کا سکون، زاء کا کسرہ، اس کے بعد میم مفتوح، پھر نون تثنیہ۔ عرفہ اور مزدلفہ کے درمیان ایک معروف جگہ ہے۔ نوویؒ شرح مہذب میں فرماتے ہیں: "مزدلفہ کی طرف جانے میں مأزمین کا راستہ سنت ہے۔ جیسا کہ امام شافعیؒ نے تصریح کی ہے، ضب کا راستہ نہیں۔ امام

وأردف أسامة بن زيد ونزل في أثناء الطريق فبال۔

ترجمہ: اور اسامہ بن زید کو اپنے پیچھے سوار کیا۔ اور اثنائے راہ میں سواری سے اتر کر پیشاب کیا۔

(ف) اسی طرح حدیث ہذا میں راستہ بدلنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تھی (رش) امام بخاریؒ نے اس پر یہ عنوان قائم کیا ہے: باب من خالف الطریق اذا رجع یوم العید۔ حاشیہ لامع میں اس پر مبسوط کلام کیا ہے۔ اور اس میں بحوالہ حافظؒ اس کی حکمت میں بیس سے زیادہ اقوال نقل کئے ہیں۔

اسامہ بن زید کو اپنے پیچھے سوار کیا۔ اور نہایت سکون سے روانہ ہوئے۔ ناقہ کی مہار کھینچ رکھی تھی۔ تاکہ وہ تیز نہ چلے۔ یہاں تک کہ اس کا سر کجاوے کے اگلے حصہ سے لگ جاتا تھا۔ آپ کی سواری متوسط رفتار سے چل رہی تھی۔ کسی جگہ راستہ کشادہ ہوتا تو اس کی رفتار قدرے تیز کر دیتے۔ اور کہیں ٹیلا آتا تو اس کی مہار ڈھیلی چھوڑ دیتے۔ تاکہ اس کے لئے چڑھائی آسان ہو۔

آنحضرتؐ کا ارشاد علیکم السکینۃ

لوگ دائیں بائیں اونٹوں کو دوڑا رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف التفات فرماتے اور ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتے: "لوگو! سکون اور وقار کو لازم پکڑو"۔ یہ ترمذی کی روایت ہے اور ابوداؤد کی روایت میں لا یلتفت الیہم کے لفظ ہیں یعنی آپ لوگوں کی طرف التفات نہیں فرماتے تھے۔ شیخ نے بذل میں ابوداؤد کی روایت کو وہم قرار دیا ہے کیونکہ اکثر روایات "نہیں" کے لفظ سے خالی ہیں اور اگر یہ لفظ صحیح ہو تو اس کی توجیہ یہ ہوگی کہ بعض اوقات التفات فرماتے تھے، اور بعض اوقات التفات نہیں کرتے تھے۔ ابو الطیب شارح ترمذی محب طبری سے نقل کرتے ہیں کہ ترمذی کی روایت زیادہ صحیح ہے جس میں لا کا لفظ نہیں۔ میرے والد نور اللہ مرقدہٗ نے حضرت امام ربانی کی تقریر ابوداؤد میں لکھا ہے کہ: "صرف جبکہ انبوہ کے ساتھ قصداً بڑھتے تھے تب پیچھے کے ساتھ نہیں"۔

اثنائے راہ میں پیشاب کے لئے اترنا اور دو حدیثوں میں تعارض کا حل۔

اور اثنائے راہ میں سواری سے اتر کر پیشاب کیا۔ اور وضو کیا۔ یہاں پر یہ اشکال ہے کہ ابوداؤد اور مسند احمد میں حضرت شریدؓ سے مروی ہے کہ عرفات سے واپسی پر آپ

وتوضأ

ترجمہ: اور وضو کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا، پس آپ کے قدم مبارک زمین پر نہیں لگے، یہاں تک کہ آپ مزدلفہ پہنچ گئے۔ قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس سے مقصود اس امر کا بیان کرنا ہے کہ عرفات سے مزدلفہ تک کا سفر سواری پر ہوا۔ البتہ اتر کر وضو کرنے کی روایت اس کے خلاف نہیں۔ اھ۔ حاصل یہ کہ عرفات سے مزدلفہ تک کی مسافت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوار ہونے کو خوب مبالغہ سے بیان کرنا مقصود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ساری مسافت سواری پر طے کی، اور پیدل نہیں چلے۔ یہ مطلب نہیں کہ آپ سواری سے اترے ہی نہیں۔ لہٰذا یہ حدیث حدیث اسامہ کے معارض نہیں۔ صاحب عون المعبود نے یہ جواب دیا ہے کہ حضرت اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ردیف تھے اس لئے ان کی حدیث کو ترجیح ہے۔ مگر یہ جواب بعید ہے کیونکہ حضرت فضل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں تصریح ہے کہ وہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، لہٰذا ایک کو دوسرے پر ترجیح ممکن نہیں۔ کذا افادہ الشیخ فی البذل۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اثنائے راہ میں سواری سے اترنا مزدلفہ سے پیچھے شعب الایسر کے پاس ہوا تھا۔ جیسا کہ بخاری کی روایت میں ہے۔ قسطلانیؒ فرماتے ہیں: یہ شعب [[illegible] اور دال مفتوح پھر الف اور [illegible] مکسورہ پھر راء] جو اُن دونوں کے درمیان راستے کی بائیں جانب ایک جگہ ہے۔ امراء یعنی خلفائے بنی امیہ کی فرودگاہ تھی، کیونکہ وہ یہاں اترتے تھے اور مغرب کی نماز پڑھا کرتے تھے۔ حافظؒ فرماتے ہیں کہ الفاکہی نے حضرت عکرمہؓ سے روایت کیا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ کو پیشاب گاہ بنایا تھا، اور تم نے اس کو نماز گاہ بنا لیا ہے۔" گویا ان لوگوں پر اعتراض کرنا مقصود ہے جو جمع بین الصلوٰتین کو ترک کرتے تھے۔ اور ابوداؤد کی روایت میں حضرت اسامہؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: "ہم اس گھاٹی میں آئے جس میں نزول شب کے لئے لوگ اونٹ بٹھاتے ہیں" (الحدیث)

اور ہلکا پھلکا وضو کیا۔ اور بخاری کے الفاظ یہ ہیں کہ وضو میں اسباغ نہیں فرمایا۔ ابوداؤد کے لفظ یہ ہیں کہ ہلکا سا وضو کیا جس میں زیادہ مبالغہ نہیں تھا، اور حج میں اس پر بحث کی تفصیل ہے

کلام کیا ہے کہ اس سے مراد وضو شرعی ہے یا الفاظ کے اعتبار سے وضو لغوی یا استنجا زیادہ
مناسب ہے کہ وضو شرعی مراد نہ لیا جائے کیونکہ لغوی وضو کو وضو خفیف نہیں بلکہ وضو ناقص کہا
جاتا ہے۔ اور استنجا بھی مراد نہیں ہو سکتا کیونکہ حضرت اسامہؓ کا یہ ارشاد کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم
پر پانی ڈالا اس مراد کے منافی ہے۔ امام ابن عبدالبر کا یہ اعتراض بھی لازم نہیں آتا کہ ایک نماز کے لئے دو مرتبہ
وضو مشروع نہیں۔ کیونکہ دوبارہ وضو کرنا حدث کی وجہ سے کیا ہوگا۔ نیز یہ بھی متفق علیہ نہیں کہ دوبارہ وضو
صرف اسی شخص کے لئے مشروع ہے جو پہلے وضو سے فرض یا نفل نماز ادا کر چکا ہو۔ پہلا وضو بھی
محض اس لئے کیا تھا کہ طہارت کا سلسلہ ٹوٹنے نہ پائے۔ بالخصوص اس حالت میں تو یہ اور بھی بہت
اہم تھی کیونکہ ذکر الٰہی کی ضرورت بہت زیادہ تھی۔ اور پورا وضو اس لئے نہ کیا کیونکہ پانی پاس
موجود نہ تھا۔ الی آخر ما بسط فی اللامع۔

آب زمزم سے وضو

فائدہ: حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ جس پانی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے
اس موقعہ پر وضو کیا تھا وہ آب زمزم تھا۔ جیسا کہ عبداللہ بن احمد نے زوائد مسند
احمد میں حضرت علیؓ سے بسند حسن نقل کیا ہے۔ اس سے ان لوگوں کی تردید ہو جاتی ہے جو کہتے ہیں کہ آب زمزم
کا استعمال پینے کے علاوہ ممنوع ہے۔ ابن حجر شرح مناسک میں لکھتے ہیں کہ بعض لوگوں نے اس حدیث سے
یہ استدلال کیا تو ہے مگر جب تک یہ ثابت نہیں ہو جاتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پانی موجود تھا مگر
اس کے باوجود آپ نے زمزم سے وضو کیا تب تک یہ استدلال تام نہیں۔ ورنہ یہ احتمال بھی ہے کہ آپ کا آب
زمزم سے وضو کرنا اس لئے تھا کہ اس کے علاوہ اور کوئی پانی آپ کے پاس نہ تھا۔ اس لئے اسی سے وضو
کرنا پڑا۔ میں کہتا ہوں کہ علاوہ ازیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے استعمال پر دوسروں کے استعمال کو قیاس
نہیں کیا جا سکتا۔ بالخصوص جب کہ آپ کے فضلات کی طہارت کا قول راجح قرار دیا گیا ہے۔ در مختار میں ہے:
زمزم سے استنجا مکروہ ہے غسل مکروہ نہیں۔ نیز رد المحتار میں ہے کہ ماء مطلق اور ماء زمزم سے رفع حدث
کرنا بلا کراہت جائز ہے۔ امام احمد سے روایت ہے کہ مکروہ ہے۔ وہی امام ابن عابدین فرماتے ہیں: پہلے قول سے
مستفاد ہوتا ہے کہ نفی کراہت رفع حدث سے مخصوص ہے۔ ازالہ نجاست کا یہ حکم نہیں۔ پوری تفصیل
اوجز میں ہے۔ اور شرح لباب میں ہے: آب زمزم کا بکثرت پینا مستحب ہے اور زمزم میں نظر کرنا عبادت
ہے۔ اور اکثر علماء کے نزدیک آب زمزم سے وضو و غسل بلا کراہت جائز ہے البتہ امام احمد کا اس میں اختلاف

فقال اسامة الصلوٰة يا رسول الله قال المصلى امامك، ثم سار فاتى المزدلفة

ترجمہ: حضرت اسامہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ نماز؟ فرمایا نماز کی جگہ تمہارے آگے ہے۔ پھر سوار ہوئے۔ مزدلفہ پہنچے

چنانچہ غسل اور تجدید وضو کے لئے زمزم کا استعمال بقصد تبرک ہونا چاہیئے۔ اور صرف پاک چیز میں اسے استعمال کیا جائے۔ اس لئے ناپاک کپڑا دھونا، غسل جنابت کرنا۔ اور بے وضو کا وضو کرنا یا کسی ناپاک جگہ میں اس کو استعمال کرنا اچھا نہیں۔ اور اس سے استنجا کرنا مکروہ ہے۔ بلکہ بعض علماء نے اس کو حرام کہا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ بعض لوگوں نے اس سے استنجا کیا، تو بواسیر کا مرض پیدا ہو گیا۔ (فتح مختصراً) نوویؒ شرح مہذب میں فرماتے ہیں: ہمارا اور جمہور کا مذہب ہمارے مذہب کی طرح یہ ہے کہ اس سے غسل اور وضو مکروہ نہیں۔ امام احمد سے ایک روایت ہے کہ مکروہ ہے۔ جو محققین نے دونوں روایتوں کو نقل کر کے جواز کو ترجیح دی ہے۔ اور دلیل یہ پیش کی ہے کہ اس کا شرف اس کے استعمال کی کراہت کا موجب نہیں۔ جیسا کہ اس پانی کا استعمال مکروہ نہیں جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ ڈالے ہوں یا اس سے غسل فرمایا ہو۔

حضرت اسامہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ نماز؟ فرمایا: نماز کی جگہ تمہارے آگے ہے۔" اوجز میں ہے کہ باجی فرماتے ہیں: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ نماز کی جگہ تمہارے آگے ہے" اس کا تقاضا یہ ہے کہ نماز کا یہ وقت نہیں۔ یا نماز کی جگہ نہیں ہے، یا اتفاق سے دونوں چیزیں وہاں جمع ہو گئی ہوں۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ نماز نہ پڑھے یہاں تک کہ مزدلفہ پہنچ جائے۔ اور امام مالک نے اس مسئلہ پر اسی ارشاد نبویؐ سے استدلال کیا ہے۔ ابن حبیب کہتے ہیں کہ جس نے مزدلفہ سے قبل بلا عذر نماز پڑھ لی اس کا اعادہ کرے۔ اور یہی قول امام ابو حنیفہؒ کا ہے۔" اھ

مزدلفہ پہنچنا اور مزدلفہ کی وجہ تسمیہ

پھر آپ سواری پر روانہ ہوئے، مزدلفہ پہنچے ثم سار فاتی

شرح مواہب میں لکھتے ہیں کہ یہ عرفات و منیٰ کے درمیان ایک جگہ ہے جو سب کی سب حدود حرم کے اندر ہے۔ اس کا نام جمع بھی ہے۔ بفتح جیم و سکون میم۔ یا اس وجہ سے کہ حضرت آدم، حضرت حوا علیہما السلام کے ساتھ اس جگہ جمع ہوئے اور ان کے قریب گئے۔ یا بقول بعض اس لئے کہ یہاں دو نمازیں جمع کی جاتی ہیں۔ یا بقول بعض اس لئے کہ لوگ یہاں جمع ہوتے ہیں اور

فتوضأ فصلى المغرب

ترجمہ: پس وضو کیا اور مغرب کی نماز پڑھی

یہاں ٹھہر کر اللہ تعالیٰ کا قرب و نزدیکی حاصل کرتے ہیں۔ اسی لئے اس کا نام مزدلفہ ہوا۔ حافظؒ اس پر اضافہ فرماتے ہیں کہ یا اس لئے کہ لوگ منیٰ کے قریب ہو جاتے ہیں۔ یا اس لئے کہ اس میں رات کے ہر زلفہ (حصہ) میں نزول ہوتا ہے۔ یا اس لئے کہ یہ حق تعالیٰ کے یہاں قرب و منزلت کا ذریعہ ہے۔ پس نماز کا وضو کیا۔ بخاری و مسلم کے الفاظ یہ ہیں: "پس جب مزدلفہ پہنچے تو سواری سے اترے پس وضو کیا اور خوب کامل وضو کیا" اور اوجز میں ہے کہ احتمال ہے کہ محض وضو کی تجدید کی ہو۔ یا حدث لاحق ہونے کی بنا پر وضو کیا ہو۔ اور پھر مؤذن کو حکم دیا چنانچہ اذان ہوئی اور آپ نے کجاوے اتارنے اور اونٹ بٹھلانے سے پہلے نماز مغرب ادا کی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب کے بعد کھانا تناول فرمایا یا نہیں؟

راجح قول کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت شام کا کھانا نہیں تناول فرمایا جیسا کہ اوجز میں تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ اور اسی میں ہے کہ باجیؒ فرماتے ہیں: "ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد کھانا تناول فرمایا۔" حنفیہ میں سے صاحب ہدایہ وغیرہ نے اس کی موافقت کی ہے لیکن شراح ہدایہ نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً مروی نہیں بلکہ خود حضرت ابن مسعودؓ کے عمل سے ثابت ہے۔ حافظ درایہ میں فرماتے ہیں: "یہ حدیث کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شام کا کھانا کھایا۔ مجھے مرفوعاً نہیں ملی۔ البتہ بخاری شریف میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا اپنا عمل ذکر کیا ہے جس میں یہ مذکور ہے کہ جب صبح صادق ہوئی تو انہوں نے فجر کی نماز پڑھی۔ اور اسی روایت میں ان کا یہ قول بھی ہے کہ یہ دونوں نمازیں اپنے وقت سے ہٹا دی گئی ہیں اور آخر میں فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے۔" پس احتمال ہے کہ اس فقرے سے ان کی مراد صرف دو نمازوں کا جمع کرنا اور ان کے فہم کے مطابق دونوں نمازوں کا اپنے وقت سے ہٹایا جانا مراد ہو۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ ان کی مراد ان تمام افعال سے ہو جو ان سے صادر ہوئے۔"

فصل المشاعر

ترجمہ : پھر عشاء پڑھی

میں کہتا ہوں کہ غالباً یہی وجہ ہے کہ صاحب ہدایہ اور ان کے موافقین نے حدیث کو دوسرے احتمال پر محمول کیا ہے۔ اور یہ توجیہ بالخصوص حنفیہ نے پہلے احتمال ہی کی بنا پر ان کے نزدیک مستحب یہ ہے کہ عشاء کے لئے الگ اقامت نہ کہی جائے بلکہ پہلی اقامت ہی کافی ہے۔ ابن شیخ نے بذل میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث کی یہ توجیہ کی ہے کہ بعض صحابہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اور آپ کے حکم سے مغرب و عشاء کے درمیان کھانا کھایا اس کو مجازاً آپ کی طرف منسوب کر دیا گیا تھا (ق) پس جب کھانے سے فارغ ہو گئے تو اقامت کا حکم فرمایا

مزدلفہ میں اذان اور اقامت میں اختلاف

پس اقامت ہوئی پھر عشاء پڑھی۔ اور ہمارے حنفیہ کے نزدیک جیسا کہ شرح لباب میں ہے: اس جمع میں تعجیل مستحب ہے اس لئے فرض نمازیں یعنی جنس فرض ہو دونوں نمازوں کے جمع کرنے پر صادق ہے کجاوے یعنی سامان اتارنے سے پہلے پڑھے۔ بخلاف اس کی حالت ہو اور سواری کا مالک بھی راضی ہو۔ اور اونٹوں کو بٹھا دے کیونکہ اس سے بہ نسبت کھڑے رہنے کے ان کے لئے آسان ہوگی۔ یا ان کی حفاظت کی قصد سے ان کو بٹھا دے اور ان کو عقال بھی لگا دے۔ پس جب عشاء کا وقت ہو تو مؤذن اذان و اقامت کہے اور امام مغرب کی نماز عشاء کے وقت میں جماعت سے پڑھے۔ پھر عشاء جماعت سے پڑھے اور عشاء کے لئے اذان و اقامت کا اعادہ نہ کرے۔ ابن قیم الہدی میں فرماتے ہیں کہ ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دونوں نمازیں دو اذانوں اور دو اقامتوں سے پڑھیں۔ جیسا کہ عرفہ میں بھی یہی کیا تھا۔

علماء کے اس مسئلہ میں چھ قول ہیں جو اوجز میں مذکور ہیں۔ اول اذان کے بغیر دو اقامتیں یہ امام اسحٰق کا قول ہے اور امام احمد سے ایک روایت اور خطابی کی نقل کے مطابق امام شافعی کا ایک قول بھی یہی ہے۔ دوم صرف ایک اقامت پہلی نماز کے لئے۔ یہ ثوری کا قول ہے۔ اور امام احمد کی ایک روایت ہے۔ سوم ایک اذان دو اقامتیں یہ امام احمد کا صحیح قول اور امام طحاوی و امام زفر کا قول ہے۔ نووی فرماتے ہیں کہ یہی ہمارے ہاں صحیح ہے۔ چہارم

ایک اذان ایک اقامت صرف پہلی نماز کے لئے۔ یہ حنفیہ کا مذہب ہے۔ جیسا کہ شرح لباب سے اوپر گذر چکا ہے۔ مگر اس کے لئے یہ شرط ہے کہ دونوں میں کھانے وغیرہ کا فصل نہ ہوا۔ پنجم: دو اذانیں اور دو اقامتیں۔ یہ مالکیہ کا مذہب ہے۔ ششم: بغیر اذان و اقامت۔ محب طبری نے یہ قول بعض سلف سے نقل کیا ہے۔" انتہی مختصراً۔ ان اقوال کے ماخذ اوجز میں مذکور ہیں۔

دونوں نمازوں کے درمیان نوافل نہیں پڑھے نہ ان کے بعد | وش: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں نمازوں کے درمیان نوافل نہیں پڑھے نہ ان کے بعد وتروں کے علاوہ کچھ پڑھا۔ جیسا کہ آگے آتا ہے۔ اس پر امام بخاریؒ نے ترجمۃ الباب قائم کیا ہے: "باب من جمع بینہما لم یتطوع" اور اس کے ذیل میں ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ذکر کی ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں نمازوں کو جمع کیا اور ان کے درمیان نوافل نہیں پڑھے نہ ان کے بعد۔" اوجز میں اس پر مبسوط کلام کیا ہے۔ اس میں مالکیہ کی کتابوں سے نقل کیا ہے کہ ان دونوں کے درمیان نوافل پڑھے نہ ان کے بعد اور ابن حجر کی شرح منہاج سے نقل کیا ہے کہ "مسنون یہ ہے کہ نماز مغرب کے بعد ہر شخص اپنی سواری بٹھائے اور ان کے عقال باندھے پھر عشاء کی نماز پڑھیں۔ پھر سامان کھولیں۔ پھر سنتیں اور وتر پڑھیں۔" اور ہمارے حنفیہ کے نزدیک دونوں کے درمیان نوافل مکروہ ہیں۔ جیسا کہ ملا علی قاریؒ نے شرح لباب میں تصریح کی ہے اور دونوں نمازوں کے بعد جمع عرفات میں نوافل مکروہ ہیں، مزدلفہ میں مکروہ نہیں۔ ملا علی قاری فرماتے ہیں: "دونوں کے درمیان نفل نہ پڑھے، بلکہ مغرب و عشاء کی سنتیں اور وتر دونوں کے بعد پڑھے۔" اور مرقاۃ میں فرماتے ہیں: "قولہ ولم یسبح بینہما شیئاً یعنی دونوں نمازوں کے درمیان سنتیں اور نفل نہیں پڑھے۔ اور معتمد یہ ہے کہ مغرب و عشاء کی سنتیں اور وتر دونوں کے بعد پڑھے۔ کیونکہ ایک روایت میں ہے کہ عشاء کی سنتیں اور وتر کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم آرام کے لئے لیٹ گئے۔" اور مزدلفہ میں مغرب و عشاء کا جمع کرنا حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک افعال حج کے سبب سے ہے جیسا کہ اوجز میں تفصیلاً اور بذل میں اجمالاً ذکر کیا ہے۔ اور

ثم نام حتى اصبح

ترجمہ: پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سو گئے یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔

شافعیہ کے قول میں یہ جمع سفر کی بنا پر ہے۔ نووی شرح مسلم میں لکھتے ہیں کہ صحیح ہمارے اصحاب کے نزدیک یہ ہے کہ یہ جمع سفر کے سبب سے ہے لہٰذا یہ صرف اسی مسافر کے لئے جائز جس کا سفر بقدر قصر تک پہنچتا ہو۔ اھ

(ق) پھر آپ سو گئے یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ اور اس

مزدلفہ کی رات تہجد پڑھی یا نہیں؟

رات شب بیداری نہیں کی۔ اور قسطلانی نے مواہب میں اس پر بسط سے لکھا ہے۔ اور ترک تہجد کے وجوہ میں ان اعمال کا ذکر کیا ہے جو پہلے ذکر ہو چکے یعنی زوال سے غروب تک عرفہ کا وقوف، دعا اور تضرع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مبالغہ واجتہاد اور غروب کے بعد عرفہ سے مزدلفہ تک کا سفر نیز وہ بہت سے اعمال جو آپ کو یوم النحر میں کرنے تھے یعنی بہت سی قربانیوں کا نحر، رمی اور طواف زیارۃ وغیرہ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے" انتہی مختصرا۔ اور شیخ بذل میں فرماتے ہیں: "اگر کہا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تہجد کیسے ترک فرمایا جب کہ ایک جماعت کے قول کے مطابق وہ آپ پر فرض تھی۔ جواب یہ ہے کہ ترک تہجد اس جماعت کے قول پر مبنی ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ تہجد آپ پر فرض نہیں تھی۔ اور شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اور مولانا بحر العلوم نے رسائل الارکان میں اس کی تصریح کی ہے چنانچہ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مزدلفہ کی رات تہجد نہیں پڑھی کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہت سے مستحب امور کو اہم مجمعوں میں ترک فرمایا کرتے تھے تاکہ لوگ انہیں سنت نہ بنا لیں" اور بحر العلوم فرماتے ہیں: "راوی کے اس قول میں کہ "آپ لیٹ گئے" اس امر کی واضح دلیل ہے کہ اس رات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تہجد نہیں پڑھی" قسطلانیؒ نے مواہب میں اس کی تصریح کی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ احیاء العلوم میں جو لکھا ہے کہ "اس رات نوافل ترک نہ کرے بلکہ اس رات ان کا ادا کرنا تو بہت ہی اہم ہے" یہ غیر مناسب ہے"

شیخ فرماتے ہیں کہ احیاء میں جو لکھا ہے وہ بظاہر اس قول پر مبنی ہے کہ تہجد آپ پر فرض تھی پس بظاہر آپ نے واجب کو ترک نہیں فرمایا ہوگا۔ اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ تہجد فرض ہو یا سنت

(۵) قال و اذن لضعفة اهله ان يتقدموا الى منى قبل طلوع الفجر عند غيبوبة القمر و امرهم ان لا يرموا حتى تطلع الشمس

ترجمہ: (۵) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ضعفاء اہل بیت کو اجازت دی کہ وہ طلوع فجر سے پہلے جب کہ چاند غروب ہو منیٰ چلے جائیں اور انہیں حکم فرمایا کہ آفتاب طلوع ہونے سے پہلے رمی نہ کریں۔

بہرحال راوی کا یہ کہنا کہ آپ لیٹ گئے اس کے علم پر محمول ہوگا کہ اس نے آپ کو نماز پڑھتے نہیں دیکھا یا یہ کہا جائے کہ آپ مغرب و عشاء کی سنتیں اور وتر پڑھنے کے بعد لیٹے ہوں گے کیونکہ وتر حنفیہ کے نزدیک واجب ہیں۔ ان دونوں حضرات کے قول پر لازم آئے گا کہ آپ نے نماز تہجد کی طرح نماز وتر کو بھی ترک فرمایا۔ صدر وتر کا اطلاق جس طرح وتر پر ہوتا ہے اس طرح نماز تہجد پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے پس بظاہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تہجد اور وتر دونوں پڑھے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔ انتہیٰ ما فی البذل۔

میں کہتا ہوں کہ اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو بحوالہ مرقاۃ پہلے گزر چکی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سنتیں اور وتر پڑھنے کے بعد لیٹے تھے۔ اور وتر کا لفظ تہجد کے لئے روایات میں شائع و ذائع ہے، چنانچہ روایات میں ہے کہ آپ تین، پانچ، سات، نو اور گیارہ رکعات کے ساتھ وتر و تہجد پڑھا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اور بہت روایات اس مضمون کی وارد ہیں۔ اور یہ بحث کہ تہجد آپ پر فرض تھی یا نہیں؟ حاشیہ لامع میں کتاب التہجد کے آغاز میں اس پر مبسوط کلام کیا ہے۔ ابن عربی کہتے ہیں کہ یہ حضرت ام سلمہؓ کی باری کا دن تھا۔ میں کہتا ہوں کہ امام ابوداؤد نے باب التعجیل من جمع میں حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ام سلمہؓ کو لیلۃ النحر میں بھیجا۔ اور یہ وہ دن تھا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے یہاں تھے۔ پس مفصل کلام عنقریب آتا ہے۔

ضعفاء کو منیٰ جلدی جانے کی اجازت

(۵) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ضعفاء اہل بیت کو اجازت دی کہ وہ طلوع فجر سے پہلے جب کہ چاند غروب ہو منیٰ چلے جائیں۔ اور انہیں حکم فرمایا کہ آفتاب طلوع ہونے سے پہلے رمی نہ کریں۔

بحث: یہاں چند بحثیں ہیں۔

اول ضعفاء سے کون لوگ مراد ہیں؟ اور ضعفاء اہل بیت میں سے درج ذیل حضرات کے نام روایات میں مصرح ہیں، حضرت سودہؓ جیسا کہ صحیحین وغیرہ

میں ہے یا یہ کہ بوڑھوں اور بیماروں کی قسم کی تھیں۔ حضرت عائشہؓ اپنی بڑی عمر کے زمانے میں فرمایا کرتی تھیں کہ کاش میں نے بھی اجازت حاصل کر لی ہوتی۔ حضرت ام سلمہؓ جیسا کہ ابوداؤد اور نسائی کی روایت میں ہے، ام حبیبہ رضی اللہ عنہا۔ جیسا کہ مسلم کی روایت میں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ۔ چنانچہ صحیحین وغیرہ کی روایت میں ہے کہ وہ فرماتے ہیں "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گھر کے کمزور لوگوں کے ساتھ مجھے بھی بھیجا تھا" حضرت عباس رضی اللہ عنہ۔ امام طحاویؒ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباسؓ سے فرمایا تھا "آپ ہمارے کمزور بچوں اور عورتوں کو لے جائیے تاکہ یہ نماز فجر منیٰ جا کر پڑھیں" جیسا کہ شرح معانی الآثار میں ہے۔ اور فتح الباری میں ہے کہ صحیح ابوعوانہ کی حدیث میں ہے کہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں، بچوں اور کمزوروں کو منیٰ بھیج دیا کرتے تھے" مذکورہ بالا حضرات کی روایت شیخ ابن قیمؒ اور صاحب البدایہ والنہایہ نے بھی ذکر کی ہے، علامہ عینیؒ نے ابن حزم سے نقل کیا ہے کہ ضعفاء سے مراد عورتیں اور بچے ہیں، بعض کہتے ہیں کہ عاجز بوڑھے بھی اس میں داخل ہیں۔

دوم۔ جانے کا وقت ظاہر روایات کے مطابق دسویں رات کے چاند کے غروب کا وقت ہے، جیسا کہ مؤطا اور دیگر کتب حدیث میں حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کی روایت اس باب میں صریح ہے کہ وہ نماز میں مشغول تھیں اور دریافت کرتی تھیں کہ کیا چاند غروب ہو گیا؟ اور جب چاند کے غروب کی خبر دی گئی تو فرمایا "بس چلو" اور حاشیہ لامع میں ہے کہ حافظ ابن حجرؒ و عینیؒ کہتے ہیں کہ اس رات چاند کا غروب ثلث اخیر کے اوائل میں ہوتا ہے" اور ابن قیمؒ کہتے ہیں کہ سنت سے جو بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ تعجیل نصف شب کے بعد نہیں بلکہ چاند غروب ہونے کے بعد ہے۔ اور جن لوگوں نے نصف شب سے تحدید کی ہے ان کے پاس کوئی دلیل نہیں" اور اوجز میں حضرت عطاءؒ کے اس اثر کو جس میں ہے کہ "وہ اپنے گھر کی عورتوں کو پہلے بھیج دیا کرتے تھے" آثار ہی سے نقل کیا ہے کہ راوی نے اس تقدیم کا وقت بیان نہیں کیا، اس لئے احتمال ہے کہ ان کا معنیٰ آنا فجر سے اس قدر پہلے ہو کہ وہ فجر کی نماز منیٰ میں پڑھ سکیں۔ جیسا کہ حضرت اسماء کی حدیث میں ہے، اور یہ بھی احتمال ہے کہ ان کا آنا فجر کے بعد اور وقوف سے قبل ہو۔ مگر ان کے لئے زیادہ سہولت اس میں ہے کہ فجر سے پہلے چلیں کہ اس صورت میں ان کو تنہائی زیادہ میسر ہوگی" اور اسی میں ایک دوسری جگہ ہے کہ موفق کہتے ہیں:

"عورتوں اور بچوں اور کمزوروں کو پہلے بھیج دینے میں مضائقہ نہیں، عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور حضرت عائشہؓ
اور دیگر حضرات اپنے کمزور اہل وعیال کو پہلے بھیج دیا کرتے تھے۔ اور امام شافعیؒ اور اصحاب سب کے
اسی کے قائل ہیں۔ اور ہمیں معلوم نہیں کہ اس میں کسی کا اختلاف ہو۔" اوجز میں اس پر بسط سے لکھا ہے
اور اس کا خلاصہ لامع کے حاشیہ میں بایں الفاظ ذکر کیا ہے۔

مزدلفہ میں شب گذاری اور وقوف میں اختلاف

"یاد رہے کہ یہاں دو مسئلے ہیں۔ ایک تو رات مزدلفہ میں گذارنے کا۔ اور دوسرا مزدلفہ میں نماز فجر
کے بعد وقوف کا۔ یہ دونوں بسا اوقات ناقلین مذاہب پر ایک دوسرے سے مشتبہ ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ
ان کے اقوال مختلفہ اوجز میں نقل کر چکا ہوں جس کا حاصل یہ ہے کہ ظاہریہ کیفیت وقوف کے
قائل ہیں۔ ابن حزم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ جو مرد مزدلفہ میں امام کے ساتھ صبح کی نماز نہ پڑھے اس
کا حج باطل ہے ـــ باقی رہے ائمہ اربعہ اور ان کے متبعین تو ان کے مذاہب میں سے صحیح یہ ہے کہ نصف
اول کے بعد تک مزدلفہ میں رہنا معتمد قول کے مطابق امام شافعیؒ ـــــ اور امام احمدؒ کے
نزدیک واجب ہے۔ یہ اس صورت میں ہے کہ نصف شب سے پہلے مزدلفہ پہنچ گیا ہو ورنہ نصف اخیر میں
ایک گھڑی کی حاضری بھی کافی ہے۔ اور امام مالکؒ کے نزدیک کجاوے اتارنے کی بقدر ٹھہرنا واجب
ہے خواہ رات کے کسی حصہ میں ہو اور حنفیہ کے نزدیک مزدلفہ میں رات رہنا سنت مؤکدہ ہے۔ اور فجر کے
بعد وقوف کرنا تو حنفیہ کے نزدیک واجب ہے اور ثلاثہ کے نزدیک سنت۔ ابن ماجشون مالکی اور ابو عبید
کے نزدیک رکن ہے۔ جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ کمزوروں اور عورتوں کو پہلے
بھیج دینا بالاجماع جائز ہے۔ جیسا کہ اوجز میں تفصیل سے لکھا ہے۔ نوویؒ کہتے ہیں: "اگر مزدلفہ میں شب
باشی کو ترک کر دیا تو اس کی تلافی دم سے کرے۔ اور جس نے عذر کی بنا پر ترک کیا اس کے ذمہ کچھ نہیں" اور
دردیر کہتے ہیں: "کمزور عورتوں اور بچوں کو پہلے بھیج دینے کی بطور استحباب رخصت ہے۔" دسوقی اس پر لکھتے
ہیں: "یعنی جب کہ کجاوے اتارنے کی بقدر وہ مزدلفہ میں قیام کر چکے ہوں۔ اور کسی نے بلا عذر قیام
نہیں کیا تو اس پر دم لازم ہے۔ اور اس میں کمزور وغیرہ کا کوئی فرق نہیں۔" اور شرح لباب میں ہے کہ:

"مزدلفہ میں رات رہنا ہمارے نزدیک سنت مؤکدہ ہے اور فجر کے بعد وقوف واجب ہے۔ اور اگر وقوف ترک کر دیا
تو دم لازم ہوگا۔ البتہ اگر ترک وقوف کسی عذر کی بنا پر ہو تو اس کے ذمہ کچھ نہیں۔ مثلاً کوئی زیادہ ضعیف ہو

یا بچہ ہو یا عورت ہو جس کو ہجوم سے اندیشہ ہو۔"

یوم النحر کی رمی کا وقت

بحث سوم: مصنف کے اس قول میں کہ ان کو حکم فرمایا کہ سورج نکلنے سے پہلے رمی نہ کریں۔ حضرت اسماءؓ کے قول: "بیٹا! کیا چاند غروب ہو گیا؟" کے تحت لامع میں ہے: "حضرت اسماءؓ چاند کے غروب ہونے کا اس لئے پوچھتی تھیں کہ ان راتوں میں چاند کا غروب سحری کے قریب ہوتا ہے۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ وہ طلوع فجر کا قصد رکھتی تھیں۔ اور اس سے قبل کا ارادہ نہیں تھا۔ یہی ہمارا مذہب ہے۔" اور اس کے حاشیہ میں ہے کہ اس میں اختلاف ہے کہ یوم النحر کی رمی کا وقت کب شروع ہوتا ہے اور کب ختم ہوتا ہے۔ اوجز میں یہاں بھی خوب بسط سے مذاہب کو بیان کیا گیا ہے۔ موفق کہتے ہیں: "اس جمرہ کی رمی کے دو وقت ہیں۔ وقت فضیلت اور وقت جواز۔ وقت فضیلت تو طلوع آفتاب کے بعد ہے۔ ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دن چاشت کے وقت رمی کی تھی۔ اور جو عبدالمطلب کے نو عمر لڑکوں کو فرمایا تھا کہ رمی نہ کرنا جب تک کہ سورج نکل آئے۔" اس کو ابو داؤد وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ لیکن وقت جواز کی ابتدا امام احمدؒ کے نزدیک نصف شب سے ہو جاتی ہے اور یہی قول امام شافعیؒ کا ہے۔ اور امام احمدؒ سے ایک روایت یہ ہے کہ صبح صادق کے بعد اور طلوع آفتاب سے پہلے جائز ہے۔ یہ امام مالکؒ اور اصحاب رائے کا مذہب ہے۔ امام ثوریؒ اور امام نخعیؒ فرماتے ہیں کہ سورج نکلنے کے بعد ہی رمی کرے۔ پوری تفصیل اوجز میں دیکھ لی جائے۔ اور شیخ ابن قیمؒ کہتے ہیں کہ اس مسئلہ میں تین مذہب ہیں۔ اول: نصف شب کے بعد مطلقاً جائز ہے خواہ کوئی عذر ہو یا نہ ہو۔ یہ امام شافعی اور امام احمد کا مذہب ہے۔ دوم: صرف طلوع فجر کے بعد جائز ہے۔ یہ امام ابوحنیفہؒ کا مذہب ہے۔ سوم: اہل قدرت کے لئے طلوع آفتاب کے بعد ہی جائز ہے۔ یہ اہل علم کی ایک جماعت کا مذہب ہے۔"

رہی: اور حضرت عائشہؓ کی یہ حدیث منکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ام سلمہؓ کو بھیج دیا تھا۔ پس انہوں نے صبح صادق سے پہلے ہی رمی کر لی۔" رہی! شیخ ابن قیمؒ نے خوب بسط سے اس کا منکر ہونا ثابت کیا ہے۔ اسی طرح امام طحاوی، امام بیہقی اور صاحب الجوہر النقی نے بھی اس کو منکر کہا ہے۔ یہ حدیث ابو داؤد نے روایت کی ہے۔ اور اس پر سکوت کیا ہے۔ صاحب البدایہ والنہایہ لکھتے ہیں کہ اس حدیث کی روایت میں ابو داؤد متفرد ہیں۔ اور اس کی سند جید اور قوی ہے اور اس کے راوی

وقال: فلما طلع الفجر صلى الصبح

ترجمہ: رات ابھی جو تھی صبح صادق ہوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز فجر ادا کی

سب تو ہیں :

کیا مزدلفہ کی رات حضرت ام سلمہؓ کی باری کی تھی؟

اس حدیث سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی باری دسویں رات لیلۃ النحر تھی۔ مگر اس پر عبداللہ بن زمعہؓ کی حدیث سے اشکال ہوتا ہے جس کو امام ابو داؤد نے حضرت ام سلمہؓ سے روایت کیا ہے کہ وہ فرماتی ہیں کہ میری رات جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میرے یہاں قیام کرنا تھا، یوم النحر کی شام کو تھی۔ چنانچہ آپ میرے یہاں تشریف لائے: الخ
میرے نزدیک ان میں تطبیق یہ ہو سکتی ہے کہ ایام حج کی راتیں گذشتہ دن کے تابع ہوتی ہے جیسا کہ معروف ہے۔ اور حضرت عائشہؓ کی حدیث میں یہ آتا ہے کہ یوم النحر حضرت ام سلمہؓ کا تھا۔ رات کا ذکر نہیں ہے۔ اور عبداللہ بن زمعہؓ کی حدیث میں تصریح ہے کہ گیارھویں رات حضرت ام سلمہؓ کی تھی، اس لئے ان دونوں کے درمیان منافات نہیں۔

رات ابھی تو تھی کہ صبح صادق ہوئی تو آپ نے اول وقت میں نماز فجر ادا کی۔ بعض لوگوں کو وہم ہوا جو اس کے قائل ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم النحر کو نماز صبح قبل از وقت پڑھی تھی۔ اس وہم کا منشا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم النحر کو فجر کی نماز اس کے وقت سے پہلے پڑھی۔ حالانکہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی مراد ہے کہ جس وقت عام طور پر پڑھنے کی عادت تھی، اس سے پہلے پڑھی، یہ تاویل ناگزیر ہے۔ اور خود عبداللہ بن مسعودؓ کی اس حدیث سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ یہ دو نمازیں اپنے وقت سے ہٹ جاتی ہیں۔ ایک نماز مغرب کہ وہ لوگوں کے مزدلفہ آنے کے بعد پڑھی جاتی ہے اور دوسری نماز فجر جو صبح کے وقت پڑھی جاتی ہے۔ اور حدیث جابرؓ میں ہے جس میں قصہ حجۃ الوداع کا بیان ہے کہ جب صبح صادق نمودار ہوئی تو آپ نے ۔۔ اذان و اقامت[1] کے ساتھ نماز فجر پڑھی۔ کذا فی الہدی۔
اور آپ نے فرمایا یہ حج اکبر کا دن ہے اور یہ برأت مشرک سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم

لہ وفی الاصل بأذان واقامتین۔ والتصحیح من صحیح مسلم ص ۳۹۸ (مترجم)

(ق) وأعاد الدعاء لأمته

(ش) اور اپنی امت کے لئے دوبارہ دعا فرمائی۔

کی براءت کے اعلان کا دن ہے۔ پھر آپ سوار ہو کر مشعر حرام کے پاس موقف میں پہنچے، اور خوب روشنی ہونے تک دعا و تضرع، تکبیر و تہلیل اور ذکر میں مشغول رہے۔ انتہی۔

باہمی حقوق کے بارے میں آپ کی دعا قبول ہوئی

(ش) اور اپنی امت کے لئے دوبارہ دعا فرمائی۔ کہتے ہیں کہ آپ کی دعا باہمی حقوق کے بارے میں بھی قبول ہوئی، اور در منثور میں عباس بن مرداس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفہ کی شام کو اپنی امت کے لئے دعائے مغفرت فرمائی۔ حق تعالیٰ کی طرف سے جواب ملا گیا ہے کہ میں نے مظالم یعنی باہمی حق تلفیوں کے ماسوا ان کی بخشش فرمادی، البتہ ظالم سے مظلوم کا بدلہ ضرور لوں گا؛ آپ نے عرض کیا کہ اے میرے رب! آپ چاہیں تو مظلوم کو جنت سے بدلہ دے کر ظالم کو معاف کر سکتے ہیں، مگر عرفہ کی شام کو آپ کی یہ دعا قبول نہیں ہوئی۔ مزدلفہ کی صبح کو دوبارہ دعا فرمائی۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہنسے، حضرت ابوبکر صدیق نے عرض کیا: ہمارے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، یہ وقت ایسا ہے کہ آپ اس میں نہیں ہنسا کرتے، ہنسنے کا سبب کیا ہوا؟ اللہ تعالیٰ آپ کو ہنستا رکھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب اللہ کے دشمن ابلیس کو معلوم ہوا کہ میری دعا قبول ہوئی اور میری امت کی بخشش ہو گئی تو وہ سر پہ مٹی ڈالنے اور واویلا کرنے لگا، اس کی جزع فزع سے مجھے ہنسی آ گئی۔ اس حدیث کو ابن ماجہ، ابوداؤد نے روایت کیا ہے، اور ابوداؤد نے اس پر سکوت کیا ہے۔ اور ابن جریر نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفہ کی شام کو ہمیں خطبہ دیا جس میں ارشاد فرمایا: اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے تمہارے اس مقام میں تم پر بہت ہی احسان فرمایا ہے، پس تمہارے نیکوکاروں سے دعاؤں و مناجات کو قبول فرمایا، اور تمہارے نیکوکاروں کو وہ سب کچھ عطا کر دیا جس کا انہوں نے سوال کیا۔ اور تمہارے گنہگار تمہارے نیکوکاروں کو ہبہ کر دیئے یعنی نیکوکاروں کی بدولت تمہارے گنہگاروں کی بخشش فرمادی، البتہ تمہاری باہمی حق تلفیاں معاف نہیں ہوئیں۔ چلو اللہ کے نام پر، پھر جب مزدلفہ کی صبح ہوئی تو ارشاد فرمایا: اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے

تمہارے اس مقام میں تم پر بہت ہی احسان فرمایا۔ چنانچہ تمہارے نیکوکاروں سے ان کی طاعات و عبادات کو قبول فرمایا۔ اور تمہارے گنہگار تمہارے نیکوکاروں کو عطا کر دیئے یعنی نیک لوگوں کی بدولت گنہگاروں کو بخش دیا۔ اور تمہاری باہمی حق تلفیوں کا معاوضہ اپنے پاس سے ادا کر دیا۔ چلو اللہ تعالیٰ کے نام پر وہیں کی طرف۔ اصحابؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کل تو آپ ہمیں بہت ہی محزون و ملول کی حالت میں لائے تھے۔ اور آج نہایت فرحت و مسرت کی حالت میں لے جا رہے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کل میں نے اپنے رب سے ایک درخواست کی تھی جو منظور نہیں ہوئی۔ میں نے درخواست کی تھی کہ باہمی حق تلفیوں کو بھی معاف کر دیا جائے۔ مگر نا منظور ہوئی۔ اور آج جبریل علیہ السلام آئے اور کہا کہ آپ کا پروردگار آپ کو سلام کہتا ہے اور ارشاد فرماتا ہے کہ میں نے حقوق اپنے ذمہ لے لئے ہیں ان کو اپنے پاس سے ادا کر دوں گا۔"

عباس بن مرداسؓ کی حدیث طبرانی نے معجم میں عبد اللہ بن احمد نے زوائد مسند احمد میں اور ابو یعلیٰ اور ابن عدی نے روایت کی ہے۔ جیسا کہ تخریج دیلمی میں ہے۔ نیز بیہقی نے سنن میں، ابن اثیر نے تمہید میں اور ابو اللیث سمرقندی نے تنبیہ الغافلین میں بھی اس کو روایت کیا ہے۔ ابن جوزی نے اس کو بروایت عباس بن مرداس، بروایت ابن عمر اور بروایت عبادہ بن صامت۔ نیز عبد الرزاق اور طبرانی نے معجم کبیر میں روایت کیا ہے۔ موضوعات میں ذکر کیا ہے اور حافظ ابن حجر نے "القول المسدد" میں اور سیوطی نے "اللآلی المصنوعۃ" میں ابن جوزی پر تعقب کیا ہے۔ سیوطی کہتے ہیں کہ یہ حدیث ترمذی کی رائے کے مطابق حسن کی حد میں داخل ہے۔ بالخصوص جب کہ اس کے مجموعی طرق پر نظر کی جائے۔ اور ابو داؤد نے اس کا ایک حصہ روایت کر کے اس پر سکوت کیا ہے۔ لہٰذا یہ حدیث ان کے نزدیک صالح ہے۔ اور حافظ ضیاء مقدسی نے "المختارہ" میں بھی اس کی تخریج کی ہے۔ امام بیہقی "شعب الایمان" میں اس کو روایت کرنے کے بعد کہتے ہیں: "اس حدیث کے لئے بہت سے شواہد موجود ہیں جن کو ہم کتاب البعث میں ذکر کر چکے ہیں۔ پس اگر اپنے شواہد کی وجہ سے صحیح ہو تو یہ حجت ہے۔ اور اگر صحیح بھی نہ ہو تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد موجود ہے۔ "ویغفر ما دون ذالک لمن یشاء" یعنی اللہ تعالیٰ شرک کے ماسوا کو جس کے لئے چاہے گا بخش دے گا۔ اور شرک کے ماسوا میں ایک دوسرے پر ظلم کرنا بھی داخل ہے۔" اور یہ حدیث

بروایت انسؓ بھی مروی ہے جس کو ابویعلیٰ اور ابن منیع نے روایت کیا ہے، الخ۔ اور حاشیۂ
کوکب میں ابن جوزی کے تردد میں اس پر خوب بسط سے کلام کیا ہے۔

حج سے گناہوں کی مغفرت

میں کہتا ہوں کہ حج سے تمام خطاؤں کے معاف ہونے کا مسئلہ مشہور ہے جس پر شروح حدیث اور کتب مناسک میں خوب بسط سے
لکھا گیا ہے۔ اوجز میں اس پر کسی قدر تفصیل سے کلام کیا گیا ہے۔ اور حاشیۂ لامع میں اس کا خلاصہ
ذکر کیا گیا ہے۔ شیخ قدس سرہ لامع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "رجع کیوم ولدتہ امہ"
کے ذیل فرماتے ہیں "بظاہر صغائر مراد ہیں اور ممکن ہے کہ صغائر و کبائر دونوں مراد ہوں کیونکہ باب
حج میں بہت سی روایتیں ہیں جو مغفرت و استغفار کو متضمن ہیں۔ مگر حقوق العباد جب تک اصحاب
حقوق کی طرف سے معاف نہیں ہو جاتے ان کے ساقط اور ختم ہو جانے کا قائل ہونے کی جرأت مشکل
ہے۔ ہاں توبہ صادقہ سے وہ گناہ معاف ہو جائیگا جو تفریط حقوق کی وجہ سے لازم آیا" اھ اور اس
کے حاشیہ میں ہے کہ اس مسئلہ پر شیخ نے بھی جامع ترمذی کے افادات میں جو "الکوکب الدری" کے نام سے
مطبوع ہیں مختصر سا کلام کیا ہے۔ اور اس کے حاشیہ میں تو بڑی تفصیل ہے۔ اور اوجز میں ان روایات
کو ذکر کرنے کے بعد جن میں حج سے گناہوں کی تکفیر کا مضمون وارد ہوا ہے۔ لکھا ہے کہ بہت سے
محققین مثلاً قاضی عیاض اور ابن عبدالبر وغیرہ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ کہ کبائر توبہ کے
بغیر معاف نہیں ہوتے اس لئے بعض حضرات تو ان روایات کو صغائر کے ساتھ مؤول قرار دیتے ہیں۔
اور بعض حضرات اس طرف گئے ہیں کہ بعض اعمال کبائر کو بھی مٹا دیتے ہیں۔ بالخصوص حج کہ اس کے
بارے میں تو بڑی کثرت سے روایات وارد ہوئی ہیں۔ اور مختار یہی ہے کہ حج کبائر کو مٹا دیتا
ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی حربی مسلمان ہو۔ اور بعض نے کہا ہے کہ صرف ان کبائر کو جو
ان کے حقوق سے متعلق نہ ہو جیسے ذمی اسلام لے آئے"

شیخ ابن تیمیہ کہتے ہیں "جو شخص یہ اعتقاد رکھتا ہو کہ حج سے حقوق واجبہ ساقط ہو جاتے ہیں اس
سے توبہ کرائی جائے اگر توبہ نہ کرے تو قتل کر دیا جائے، کیونکہ حج سے حقوق العباد بالاجماع ساقط نہیں
ہوتے" شیخ قدس سرہ الکوکب میں فریقین کے دلائل پر مفصل بحث کے بعد فرماتے ہیں "تمام دعوی
ات میں سے معتدل مناسب یہی ہے کہ تمام طاعات و عبادات میں عبادت کنندگان کے مختلف

حالات کی بنا پر بے شمار تفاوت ہوتا ہے۔ بہت سے سونے والے اللہ تعالیٰ کے ہاں اعلیٰ مراتب
رکھتے ہیں۔ اور بہت سے۔ ایسے ان شب زندہ داروں کو بجز کلفت بیداری کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ اور
جب یہ ہے تو معلوم ہوا کہ تمام عبادات کا حکم یکساں نہیں۔ بلکہ بعض تو آدمی کو ایسا کر دیتی ہیں گویا آج کے
دن ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے۔ اور یہ جب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں اپنی کوتاہیوں پر ندامت ہو
اور گذشتہ زمانے میں جن حماقتوں کا ارتکاب کر چکا ہے ان پر حسرت و افسوس ہو اور بعض ایسی ہیں کہ گویا مر
تو گویا معاف کر دینے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتیں۔ بلکہ شبہ نہیں کہ اثناء وبال ہی ہو جائیں۔ اور آدمی کے
لئے عذاب و نکال کی موجب ہوں۔ چنانچہ یوں آتا ہے کہ آدمی نے جب نماز کے آداب کی نگہبانی کی رعایت
نہ کی ہو۔ خواہ ارکان و شرائط بجا لایا ہو تو نماز اس کو بددعا دیتی ہے کہ اللہ تجھے غارت کرے جیسے تو
نے مجھے ضائع کیا۔ اس مضمون کی اور بہت سی روایات ہیں ۱۲ منہ

ارشاد نبوی: جو شخص ہماری اس نماز میں حاضر ہوا الخ

(ق) اسی مقام میں عروہ بن مضرس طائی نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں قبیلہ طئی کے پہاڑ
سے آیا ہوں میں نے اپنی سواری کو تھکا دیا اور اپنی جان کو مشقت میں ڈالا کوئی پہاڑ نہیں جس پر میں
نہ ٹھہرا ہوں۔ تو کیا میرا حج ہو گیا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص ہماری اس نماز میں حاضر
ہوا پھر ہمارے ساتھ وقوف کیا یہاں تک کہ ہم یہاں سے جائیں، جب کہ اس سے قبل رات یا دن کے کسی
حصہ میں عرفات کا وقوف کر چکا تھا تو اس کا حج تام ہے۔ ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اس
حدیث کے پیش نظر بعض حضرات اس کے قائل ہیں کہ وقوف عرفہ کی طرح مزدلفہ میں شب باشی اور وہاں کا
وقوف رکن ہے۔ یہ صحابہ و تابعین وغیرہم کی ایک جماعت اور داؤد ظاہری کا مذہب اور شافعیہ کی ایک
روایت ہے۔ شیخ ابن قیم نے فریقین کے دلائل تفصیل سے ذکر کئے ہیں۔ مذکورہ بالا حدیث ابوداؤد، ترمذی،
نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کی ہے۔ حافظ فرماتے ہیں کہ ابن حبان، دارقطنی اور حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے۔
اور شیخ بذل میں فرماتے ہیں کہ حدیث میں وقوف عرفہ کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ یہ واجبات
حج میں سے ہے۔ اور شوکانی کہتے ہیں کہ اس حدیث سے امام احمد بن حنبل نے استدلال کیا ہے کہ وقوف عرفہ
کا وقت زوال کے ساتھ مخصوص نہیں۔ بلکہ یوم عرفہ کی صبح صادق سے یوم نحر کی صبح صادق تک اس کا
وقت ہے۔ کیونکہ دن اور رات کا لفظ مطلق ہے اور جمہور اس حدیث کا جواب یہ دیتے ہیں کہ دن سے مراد

رقال ثم سار من مزدلفة مردفا الفضل۔

ترجمہ: پھر آپ مزدلفہ سے روانہ ہوئے اور فضل کو اپنے پیچھے سوار کیا۔

ابعید والی ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ نے مزدلفہ کے بعد ہی وقوف کیا۔ اور المحلیٰ میں ہے کہ اس حدیث سے ان لوگوں کے خیال کی تردید ہو جاتی ہے جو کہتے ہیں کہ وقوف مزدلفہ کے غروبِ آفتاب سے فوت ہو جاتا ہے اور ان لوگوں کی بھی جو کہتے ہیں کہ اس کا وقت طلوعِ فجر کے بعد طلوعِ آفتاب تک رہتا ہے۔ انتہیٰ ما فی البذل مختصراً۔

طلوعِ آفتاب سے قبل مزدلفہ سے چلنا

(ق) پھر آپ طلوعِ آفتاب سے قبل مزدلفہ سے روانہ ہوئے۔ موفق لکھتے ہیں: ہمیں اس میں کسی کا اختلاف معلوم نہیں کہ سنت طلوعِ آفتاب سے پہلے چلنا ہے اور خوب روشنی ہو جانے تک وقوف سنت ہے۔ امام شافعیؒ اور اصحابِ رائے کا یہی قول ہے۔ امام مالکؒ کی رائے یہ تھی کہ اسفار سے پہلے چلنا چاہئے۔ کذا فی الاوجز۔

(ش) امام ابو داؤد نے حضرت عمرؓ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ اہلِ جاہلیت اس وقت تک نہیں چلتے تھے جب تک کہ کوہِ ثبیر پر دھوپ نہ دیکھ لیتے۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی مخالفت فرمائی اور طلوعِ آفتاب سے پہلے چلے۔ اور بخاری کے الفاظ عمرو بن میمون کی روایت سے یہ ہیں کہ میں نے حضرت عمرؓ کو دیکھا کہ آپ نے مزدلفہ میں صبح کی نماز پڑھی پھر وقوف کیا۔ پھر فرمایا کہ مشرکین مزدلفہ سے نہیں چلتے تھے یہاں تک کہ سورج نکل آئے اور وہ کہا کرتے تھے "اشرق ثبیر" یعنی اے کوہِ ثبیر تو دھوپ سے روشن ہو جا! اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی مخالفت کی اور طلوعِ آفتاب سے پہلے روانہ ہوئے۔

ثبیر مکہ کے پانچ پہاڑوں کا نام ہے

یہاں یہ یاد رہے کہ ثبیر مکہ کے پانچ پہاڑوں کا نام ہے جیسا کہ شیخ قدس سرہ نے بذل میں افادہ فرمایا ہے اور اسی طرح مجمع میں بھی مذکور ہے۔ البتہ صاحبِ قاموس نے اس میں علماء کا اختلاف ذکر کیا ہے کہ ثبیر نامی پہاڑ منیٰ میں ہے یا کسی اور جگہ۔ تفصیل میرے حاشیہ شرح لباب میں ہے۔

ابن عباسؓ کا راستے سے کنکریاں اٹھانا

اور فضل بن عباسؓ کو اپنے پیچھے سوار کیا اور حضرت اسامہؓ پیدل چل پڑے۔ اور اسی راستے میں ابن عباسؓ کو کنکریاں اٹھانے کا حکم فرمایا۔ اور اس بات کو بتایا کہ کنکریاں نہیں توڑیں جیسا کہ بعض بے علم کرتے ہیں۔ کذا فی البذل۔

(قال) وقد طریقہ ثلاث

ترجمہ: وہ اسی راستے میں

زرقانی کہتے ہیں کہ سنن بیہقی اور نسائی میں بسند صحیح علی شرط مسلم مروی ہے نیز حاکم نے مستدرک میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے حدیث روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فضل بن عباسؓ سے یوم النحر کی صبح کو فرمایا کہ میرے لئے کنکریاں جمع کرو جیسے پھینکنے کی کنکریاں ہوتی ہیں۔ کنکریوں کے مسائل پر اوجز میں بہت ہی بسط سے کلام کیا ہے کہ ان کو رات ہی کو جمع کر لے یا راستے سے لے؟ اور یہ کہ صرف جمرۂ عقبہ کے لئے سات کنکریاں لے؟ یا تمام دنوں کے لئے ستر کنکریاں لے؟ اور یہ کہ جمرات کے پاس سے کنکریاں اٹھا لینا جائز ہے یا نہیں؟ اس قسم کی اور بھی لطیف بحثیں کی ہیں۔ اور اسی میں یہ ہے کہ ابن حجر کہتے ہیں کہ ابن حزم کا یہ قول مردود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کنکریوں سے رمی کی تھی جو عبداللہ بن عباسؓ نے موضع سے اٹھائی تھیں الخ اور ابن عربی نے المحاضرہ میں ابن حزم کے قول کی موافقت کی ہے۔ اور حافظؒ نے تلخیص میں فضل بن عباسؓ کے نام کو ترجیح دی ہے اور اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ عبداللہ بن عباسؓ کو تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ضعفاء اہل بیت کے ساتھ رات ہی کو منیٰ بھیج دیا تھا۔

قبیلۂ خثعم کی ایک خاتون کا سوال

(ق) وہ اسی راستے میں تھے۔ ابن عربی نے المحاضرہ میں بھی یہی ذکر کیا ہے کہ یہ واقعہ جیسا کہ آگے آتا ہے راستہ میں پیش آیا؟ اس بارے میں روایات مختلف ہیں کہ آیا یہ واقعہ راستہ میں پیش آیا؟ جیسا کہ بخاری میں ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ "فضل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سوار تھے۔ پس قبیلۂ خثعم کی ایک عورت آئی فضل اس کی طرف دیکھنے لگے" اور مؤطا کی روایت کے الفاظ بھی اسی طرح کے ہیں۔ یا رمی کے بعد منحر میں یہ واقعہ پیش آیا؟ جیسا کہ متعدد روایات میں ہے۔ اور اوجز میں ہے کہ حافظؒ فرماتے ہیں کہ احتمال ہے کہ قبیلۂ خثعم کی خاتون کا سوال رمی جمرۂ عقبہ کے بعد ہوا ہو اور ابن عباسؓ بھی اس موقعہ پر حاضر ہوئے ہوں، اس لئے کبھی وہ اپنے بھائی فضل سے روایت کرتے ہیں کیونکہ وہی صاحب واقعہ ہیں اور کبھی خود اپنا مشاہدہ نقل کرتے ہیں۔ اس کی تائید ترمذی و احمد وغیرہما کی روایت سے ہوتی ہے۔ امام احمدؒ کے الفاظ یہ روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ

عرضت له امرأة جميلة سألته عن الحج عن أبيها فأمرها أن تحج عنه۔

ایک حسین و جمیل عورت آپ کے پاس آئی۔ اور دریافت کیا کہ کیا وہ اپنے باپ کی جانب سے حج کر سکتی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ وہ اس کی جانب سے حج کرے۔

یہ بھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منحر میں پہنچے اور فرمایا: یہ منحر ہے اور منیٰ کی ہر جگہ منحر ہے۔ اور آپ سے ایک عورت نے استفسار کیا اور ایک روایت میں ہے کہ آپ کے پاس قبیلہ خثعم کی ایک جوان لڑکی آئی۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فضل کی گردن موڑ دی۔ حضرت عباسؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ نے اپنے چچا زاد بھائی کی گردن موڑ دی۔ آپ نے فرمایا: میں نے دیکھا جوان لڑکا لڑکی ہیں مجھے ان کے حق میں شیطان کا خطرہ محسوس ہوا۔ الخ اور اس میں یہ بھی ہے کہ اس میں اختلاف ہے کہ یہ حدیث مسند ابن عباس ہے یا مسند فضل؟ ترمذی کہتے ہیں کہ میں نے محمد بن اسماعیل بخاری سے دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ اس سلسلہ میں ابن عباسؓ کی روایت بواسطہ فضل زیادہ صحیح ہے۔ الخ۔

قبیلہ خثعم کی ایک حسین و جمیل خاتون آپ کے پاس آئی۔ حافظ کہتے ہیں اس کے نام کا ذکر نہیں آیا۔ اور دریافت کیا کہ کیا وہ اپنے باپ کی جانب سے جو سواری پر بیٹھنے کی طاقت نہیں رکھتا حج کر سکتی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ اس کی جانب سے حج کرے۔ یہاں چند بحثیں ہیں۔ جو اوجز میں مفصل مذکور ہیں۔ اول: یہ کہ سائل مرد تھا یا عورت تھی؟ اور اس نے اپنے باپ کے بارے میں سوال کیا تھا یا اپنی ماں کے بارے میں؟ حافظ اس سلسلہ میں روایات کے اختلاف کو تفصیل سے ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: ان تمام طرق سے جو بات میرے سامنے ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ سائل مرد تھا، اس کے ساتھ لڑکی بھی تھی اس نے بھی سوال کیا۔ اور سوال مرد کے ماں باپ دونوں کے بارے میں تھا الخ۔

بحث دوم: جو شخص بذات خود قاصر ہو مگر کسی دوسرے سے حج کرا سکتا ہے اس پر حج فرض ہے یا نہیں؟ | جو شخص خود تو معذور ہو اس پر حج فرض ہے یا نہیں؟

اس مسئلہ پر اوجز میں خوب بسط سے لکھا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قتادہ، ابن الزبیر، امام شافعیؒ، احمدؒ اور صاحبینؒ کے نزدیک حج فرض ہے۔ اور امام مالکؒ و ابو حنیفہؒ کے نزدیک فرض نہیں۔ ان کی طرف سے اس حدیث کا جواب جیسا کہ مشائخ سے منقول ہے یہ دیا گیا ہے کہ حدیث خثعمیہ کے ساتھ مخصوص ہے اس کو دوسروں کی طرف متعدی نہیں کیا جا سکتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: من استطاع الیہ

مسئلہ: یعنی حج اسی پر فرض ہے جو بیت اللہ تک پہنچنے کی طاقت رکھے، اور اوجز میں ہے کہ ابن الہمام کا رجحان یہ ہے کہ یہ قصہ خثعمیہ سے مخصوص ہے۔ اور قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس مسئلہ میں حجت نہیں کیونکہ ظاہر حدیث یہ ہے کہ اس خاتون نے بتایا کہ فریضۂ حج ایسی حالت میں نازل ہوا کہ اس کا باپ طاقت نہیں رکھتا تھا۔ اس نے صرف یہ دریافت کیا کہ اس کے لئے اپنے باپ کی جانب سے حج کرنا جائز ہے یا نہیں؟ الخ

اور شیخ قدس سرہ کوکب میں فرماتے ہیں: اس کا قول "اللہ تعالیٰ کے فریضۂ حج نے اسے پایا"

یہاں دو احتمال ہیں، اول یہ کہ جب حج کا حکم نازل ہوا اس وقت یہ بڑے میاں حج کی قدرت و استطاعت رکھتے تھے مگر پہلے سال حج نہ کیا، یا پھر عوارض و موانع پیش آگئے ہوں گے یا یہ توقع ہوگی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں حج سے مشرف ہوسکیں گے اور بعد میں کمزور ہوگئے ہوں گے۔ اس صورت میں یہ کہنا صحیح ہے کہ حج کے حکم نے ان کو بڑھاپے کی حالت میں پایا۔ اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ حج کے بارے میں حکم خداوندی نازل ہی اس وقت ہوا جب کہ وہ شیخ کبیر تھے۔ انتہی۔

بحث سوم: کسی شخص کی طرف سے حج بدل جائز ہے یا نہیں؟

اوجز میں ہے کہ موفق کہتے ہیں کہ جو شخص بذات خود حج کرنے کی طاقت رکھتا ہو اس کی جانب سے حج واجب میں نیابت بالاتفاق جائز نہیں۔ ابن منذر کہتے ہیں کہ اہل علم کا اس پر اجماع ہے کہ جس پر حج اسلام فرض ہو اور وہ خود حج کرنے کی طاقت رکھتا ہو اس کی جانب سے کسی دوسرے کا حج بدل کرنا صحیح نہیں۔ اور یہی حکم حج فرض کا ہے، اور نذر کے حج کا ہے، اگر خود عاجز ہے تو کسی کو نائب بنا سکتا ہے۔ اور اگر خود قادر ہو تو نیابت صحیح نہیں کہ وہ بھی حج واجب ہے۔ اور نفل حج کی تین قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ جس نے حج فرض ادا نہیں کیا ایسا شخص کسی کو نفل حج کے لئے اپنا نائب نہیں بنا سکتا۔ دوم یہ کہ حج فرض ادا کرچکا ہو اور حج نفل ادا کرنے سے عاجز ہے اس کی طرف سے نائب بنانا صحیح ہے۔ سوم یہ کہ اس میں دو روایتیں ہیں۔ ایک یہ کہ صحیح ہے اور یہی امام ابو حنیفہ کا قول ہے۔ دوسری یہ کہ صحیح نہیں اور یہ امام شافعی کا قول ہے۔ بقیہ کی تفصیل اوجز میں ہے۔

بحث چہارم: مرد کا عورت کی جانب سے اور عورت کا مرد کی جانب سے حج بدل صحیح ہے یا نہیں؟

اوجز میں المغنی سے نقل کیا ہے کہ مرد کا عورت کی جانب سے اور عورت کا مرد کی جانب سے حج بدل عام اہل علم کے نزدیک صحیح ہے۔ اس مسئلہ میں کسی کا اختلاف ہمیں معلوم نہیں بجز حسن بن صالح کے کہ ان کے نزدیک مرد کی جانب سے عورت کا حج بدل

کرنا مکروہ ہے۔ ابن منذر کہتے ہیں کہ حسن بن صالح کا یہ قول ظاہر سنت سے مختلف ہے۔ کیوں کہ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خاتون کو اس کے باپ کی جانب سے حج کرنے کا حکم فرمایا" اوجز یہ چار
بحثیں حدیث الباب کے مناسب ہیں، اور حج بدل کے مسئلے میں بہت سی بحثیں ہیں۔ جن میں سے
دس بحثیں اوجز میں مذکور ہیں، چنانچہ باب الحج عن الغیر کی ابتداء میں اوجز کے الفاظ یہ ہیں۔

حج بدل کے متعلق دس بحثیں

"اس باب کے فروع بہت ہی زیادہ ہیں۔ ہم یہاں دس بحثوں میں ان مسائل کو ذکر کرتے ہیں جن کا جاننا نہایت ضروری
ہے۔ اول: حج فرض یا نفل میں نائب بنانا صحیح ہے یا نہیں؟ دوم: جو شخص خود قادر نہ ہو البتہ
دوسرے کی مدد سے حج پر قادر ہو اس پر حج فرض ہے یا نہیں؟ سوم: نابالغ کی طرف سے حج بدل کا
حکم۔ چہارم: جس شخص کے مرض کے زائل ہونے کی توقع ہو اس کی طرف سے اور محبوس کی طرف
سے حج بدل کا حکم۔ پنجم: حج بدل کے بعد مریض کو صحت ہو جائے۔ ششم: آمر کا فوت شرط ہے یا
نہیں؟ ہفتم: میت مال سے حج بدل کا حکم۔ ہشتم: دوسرے کی جانب سے حج ضرورت کا حکم۔
نہم: مرد کا عورت کی طرف سے اور عورت کا مرد کی طرف سے حج بدل۔ دہم: حج آمر کی طرف سے
ادا ہوتا ہے یا مامور کی طرف سے۔"

دق: فضل اس عورت کی طرف اور وہ فضل کی طرف دیکھنے لگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فضل
کا منہ پھیر دیا تاکہ وہ دونوں ایک دوسرے کو نہ دیکھیں۔ (ش) اور کنز العمال میں یہ اضافہ
ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آج کا دن وہ ہے کہ جس شخص نے اپنی نظر کو قابو میں
رکھا اس کے تمام گذشتہ گناہ معاف ہو جائیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فضل کا منہ
عورت کی طرف سے ہٹایا اس کے برعکس عورت کو منہ پھیرنے کا حکم نہیں کیا۔ اوجز میں اس
کے وجوہ تفصیل سے ذکر کئے گئے ہیں۔ من جملہ ان کے باجی سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم نے صرف فضل کا منہ دوسری طرف پھیر دینے کو کافی سمجھا، کیونکہ یہ چیز عورت کے لئے
فضل کا چہرہ دیکھنے سے مانع تھی گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو ایک دوسرے
کی طرف دیکھنے سے منع کر دیا۔ علاوہ ازیں دوسرے وجوہ اوجز میں تفصیل سے مذکور ہیں۔ اجنبی
مرد و عورت کا ایک دوسرے کو دیکھنے کا حکم اوجز میں دو مقام پر مفصل مذکور ہے۔ حدیث
خثعمیہ کے ذیل میں۔ اور "فقہ المرأۃ فی حجہا" کے ذیل میں۔

وسألہ آخر عن امہ۔

ترجمہ: اور اسی موقعہ پر ایک شخص نے اپنی والدہ کے بارے میں یہی سوال کیا۔

ایک شخص کا اپنی والدہ کے بارے میں سوال

اور اسی موقعہ پر ایک اور شخص نے اپنی والدہ کے بارے میں یہی سوال کیا۔ آپ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا: یہ بتا کہ اگر تیری ماں کے ذمہ قرض ہوتا تو تو اس کی جانب سے ادا کرتا یا نہیں؟ عرض کیا کہ ضرور کرتا۔ فرمایا: پھر اپنی ماں کی طرف سے حج بھی کر۔ کذا فی البدائع۔ یہ حدیث امام نسائیؒ نے حضرت فضل بن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سوار تھے کہ ایک شخص آیا اور اس نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میری ماں الخ۔ امام نسائی نے اس حدیث پر یہ عنوان قائم کیا ہے "باب حج الرجل عن المرأة"۔ امام نسائی کے طرز سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو واقعے الگ الگ ہیں۔ چنانچہ شیخ ابن تیمیہؒ کا بھی یہی رجحان ہے۔ اور ابن عربی نے المحاضرہ میں اسی کو ترجیح ذکر کیا ہے۔ چنانچہ وہ قبیلہ خثعم کی خاتون کا واقعہ نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ اسی نوعیت کا سوال ایک مرد نے بھی کیا۔ (مصادر) پیچھے قریب ہی اوجز سے گذر چکا ہے کہ حافظؒ کا رجحان یہ ہے کہ یہ ایک ہی قصہ ہے۔ وہ روایات کا اختلاف نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: "ان تمام طرق کو ملانے سے جو بات میرے لئے ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ سوال کرنے والا مرد تھا اس کے ساتھ اس کی لڑکی بھی تھی۔ اس لڑکی نے بھی سوال کیا۔ اور سوال مرد کے ماں باپ دونوں کے بارے میں تھا۔ اس کی تائید اس روایت سے نکلتی ہے جو ابو یعلیٰ نے بسند قوی فضل بن عباسؓ سے روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سوار تھا۔ ایک اعرابی آیا۔ اس کے ساتھ حسین و جمیل لڑکی بھی تھی۔ وہ اعرابی اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس نیت سے پیش کر رہا تھا کہ آپ اس سے نکاح کر لیں گے۔ اور میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا سر پکڑ کر دوسری طرف پھیر دیا۔" اس صورت میں اس جوان عورت کا یہ کہنا کہ میرے باپ کے ذمہ الخ غالباً اس سے مراد دادا ہوگا کیونکہ اس کا باپ تو اس کے ساتھ ہی تھا۔ غالباً اس شخص نے لڑکی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرنے کو کہا ہوگا۔ تاکہ آپ اس کی بات سنیں اور اسے دیکھ لیں۔ امید یہ ہوگی کہ آپ اس سے نکاح کر لیں گے۔ جب آپ نے اس کو

فلما اتی بطن محسر حرک ناقتہ واسرع السیر۔

ترجمہ: پس جب بطن محسر پہنچے تو اونٹنی کو تحریک کی اور رفتار تیز کردی۔

پسند نہ فرمایا تو اس نے اپنے باپ کے بارے میں خود بھی دریافت کیا ہوگا۔ اور کوئی مانع نہیں کہ اس شخص نے اپنی والدہ کے بارے میں بھی سوال کیا ہو۔ اھ۔

اور میرے نزدیک ان دونوں کے درمیان بہتر تطبیق یہ ہے کہ مذکورہ لڑکی اپنے باپ کے ساتھ نہیں بلکہ اپنے چچا کے ساتھ ہوگی۔ کیونکہ ابو یعلیٰ کی مسند رجالہ ایک روایت میں "اس کی لڑکی" کے لفظ کو مجاز پر محمول کرنا زیادہ آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ بہت سی مختلف روایتوں میں جو لڑکی کے سوال میں "میرے باپ" کا لفظ مذکور ہے اسے ہر جگہ مجاز پر محمول کیا جائے۔ حاصل یہ ہوا کہ لڑکی نے اپنے باپ کے بارے میں سوال کیا تھا۔ اور اس کے چچا نے اپنی والدہ کے بارے میں۔ مزید یہ کہ حافظ کے قول کے مطابق جب وہ شخص اپنے باپ کے بارے میں دریافت کر چکا تھا تو دوبارہ اس کے بارے میں لڑکی کے سوال کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ انتہی من الاوجز مختصراً۔

بطن محسر میں سواری کو تیز کرنا

پس جب بطن محسر پہنچے تو اونٹنی کو تحریک کی اور رفتار تیز کردی۔ مسلم اور ابوداؤد کے الفاظ حضرت جابرؓ کی طویل حدیث میں یہ ہیں یہاں تک کہ بطن محسر پہنچے تو تھوڑی سی تحریک کی۔ اور ابن ماجہ کی روایت میں ہے "وادی محسر میں اونٹنی کو دوڑایا"۔ اور ارشاد فرمایا کہ میری امت کو مجھ سے مسائل حج سیکھ لینے چاہئیں شاید کہ اس سال کے بعد ان سے نہ مل سکوں۔ (ق) جن مقامات میں اللہ کے دشمنوں پر اللہ کا عذاب نازل ہوا وہاں آپ کی یہی عادت مبارکہ تھی کہ تیزی کے ساتھ وہاں سے گذر جاتے تھے۔ وادی محسر میں اصحاب فیل پر وہ عذاب نازل ہوا تھا جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۂ فیل میں کیا ہے اور اسی مناسبت سے اسے محسر کہتے ہیں کہ یہاں ہاتھی آگے چلنے سے عاجز ہوکر رک گئے تھے۔ اور مقام حجر اور دیار ثمود میں گذرتے ہوئے بھی آپ نے یہی کیا تھا کہ کپڑے سے چہرہ انور ڈھانک لیا اور رفتار تیز کردی۔

محسر کی وجہ تسمیہ

اور محسر منیٰ اور مزدلفہ کے درمیان برزخ ہے اور اس میں اختلاف ہے کہ آیا منیٰ میں ہے کذا فی البذل۔ اور شرح لباب میں ہے کہ محسر میں تیز چلنا قدر

اور ان کے نزدیک مستحب ہے خواہ سواری پر ہو یا پیدل۔ اور اس کا نام محسّر اس لئے ہے کہ اصحاب فیل یہاں رُک گئے تھے۔ یا اس لئے کہ یہاں شیطان نے بصد حسرت وقوف کیا تھا۔" اھ اور زرقانی شرح مواہب میں لکھتے ہیں کہ وہ محسّر بضم میم و فتح حائے مہملہ و کسر سین مشددہ مہملہ، منیٰ اور مزدلفہ کے درمیان ایک جگہ ہے اور اصمعی کہتے ہیں کہ یہاں سے تیز گذرنے کی وجہ یہ ہے کہ بقول راضی نصاریٰ یہاں وقوف کیا کرتے تھے۔ اور بقول دیگر عرب یہاں ٹھہرتے تھے۔ ہمیں ان کی مخالفت کا حکم دیا گیا۔ اور وہ کہتے ہیں کہ اس کی حکمت کے بارے میں مجھے ایک اور بات ظاہر ہوئی ہے وہ یہ کہ یہاں اصحاب فیل پر عذاب نازل ہوا تھا۔ یہ ایک قول ہے مگر صحیح قول اس کے خلاف ہے کیونکہ اصحاب فیل حرم تک ہی داخل نہیں ہو سکے بلکہ حرم کے قریب ہلاک ہوئے۔ دراصل یہاں ایک آدمی نے شکار کیا تھا آسمان سے آگ نازل ہوئی اور اس شکاری کو خاکستر کر ڈالا۔ اسی لئے اہل مکہ اس مقام کا نام "وادیٔ نار" رکھتے ہیں۔" اھ اور نووی نے صرف نفس اصحاب فیل ہی کو وجہ تسمیہ میں ذکر کیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں: "یہ نام یوں پڑا کہ اصحاب فیل یہاں تھک کر عاجز رہ گئے تھے۔" اھ اور ان ہی نے شرح مناسک نووی میں "اس مقام میں تیز رفتاری کی وجوہ بسط سے بیان کئے ہیں۔ اور وہ فرماتے ہیں کہ اصحاب فیل پر عذاب کا نزول اس جگہ ہوا تھا جو عرفہ کے محاذی ہے۔ اور جسے مُغمّس [دوسری میم کے فتح کے ساتھ اور کبھی کسرہ بھی پڑھی جاتی ہے] کہا جاتا ہے۔ بلکہ معروف یہ ہے کہ اصحاب فیل حرم میں داخل ہی نہیں ہونے پائے تھے۔ جیسا کہ ابن اثیر نے جزم کے ساتھ ذکر کیا ہے۔" الخ۔

ان معروف روایات کے جن میں وادیٔ محسّر میں تیز چلنا مذکور ہے، وہ روایت منافی نہیں جو ابوداؤد نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہایت سکون کے ساتھ عرفہ سے چلے۔" الحدیث۔ اسی میں عرفہ سے چلنے کے بعد کا قصہ یوں نقل کیا ہے کہ "پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیچھے فضل بن عباسؓ کو سوار کیا اور ارشاد فرمایا: "اے لوگو! گھوڑے اور اونٹوں کو دوڑانا کوئی نیکی نہیں، بس سکون کو لازم پکڑو۔" ابن عباسؓ فرماتے ہیں: پس میں نے آپ کی اونٹنی کو قدم اٹھاتے (یعنی دوڑتے) ہوئے نہیں دیکھا۔" بظاہر یہ حدیث ان احادیث کے خلاف ہے جن میں وادیٔ محسّر میں تیز رفتاری کا ذکر ہے۔ نووی شرح مہذب میں لکھتے ہیں کہ اس کے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ اس حدیث میں یہ تصریح نہیں کہ آپ نے محسّر میں بھی تیز رفتاری کو

حتی اتی جمرۃ العقبۃ فرماھا راکبا

ترجمہ: یہاں تک کہ جمرۂ عقبہ کے پاس پہنچے پس سوار ہونے کی حالت میں جمرۂ عقبہ کی رمی کی۔

ترک فرمایا تھا۔ لہذا یہ حدیث ان احادیث کے منافی نہیں جن میں تیز رفتاری کی تصریح ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر اس میں تیز رفتاری کے ترک کی تصریح بھی ہوتی تب بھی تیز رفتاری کے ثبوت کی روایات دو وجہ سے مقدم ہیں۔ ایک یہ کہ ان میں اثبات ہے اور وہ نفی پر مقدم ہے۔ دوسری یہ کہ وہ کثرۃ رواۃ، صحت سند اور شہرت میں اس سے بڑھ کر ہیں۔ لہذا وہ مقدم ہوں گی۔

جمرۂ عقبہ کے پاس آنحضرتؐ کس جگہ کھڑے ہوئے

یہاں تک کہ جمرۂ عقبہ کے پاس پہنچے یعنی وادی کے نشیب میں کھڑے ہو کر جمرہ کا استقبال کیا۔ اس طور کہ بیت اللہ بائیں جانب اور منیٰ دائیں جانب تھا۔ کذا فی الہدی۔ اور اس حیثیت سے کھڑا ہونا ائمہ ثلاثہ کے نزدیک مستحب ہے جیسا کہ اس کی تفصیل ان کی کتب فقہ سے اوجز میں ذکر کی گئی ہیں۔ اور حنابلہ کے نزدیک مستحب ہے کہ منہ قبلہ کی طرف ہو۔ اور اوجز میں حافظؒ سے نقل کیا ہے کہ کسی جگہ سے رمی کرے جائز ہے خواہ جمرہ کی طرف منہ ہو یا وہ دائیں جانب ہو یا بائیں جانب اور اوپر سے رمی کرے یا اس کے نیچے سے۔ اختلاف صرف اس میں ہے کہ افضل کیا ہے۔ اھ

رمی اور یہ کہ آپ اونٹنی پر سوار تھے یعنی سوار ہونے کی حالت میں جمرۂ عقبہ کی رمی کی۔ کذا فی البذل۔ اور یہ بہت سی روایات میں معروف ہے۔ اور البدایہ والنہایہ میں ہے کہ ابن ماجہ میں ام جندبؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں: میں نے یوم النحر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جمرۂ عقبہ کے پاس دیکھا اور آپ ایک خچر پر سوار تھے۔ الحدیث۔ اور یہاں خچر کا ذکر بہت ہی غیر معروف ہے۔ اھ

رمی کا حکم

باقی رمی کا حکم تو جمہور کے نزدیک یہ واجب ہے اگر اسے ترک کر دیا تو دم سے اس کی تلافی ہوگی۔ اور مالکیہ کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے اس لئے اس کی تلافی کی جائیگی۔ اور مالکیہ سے ایک روایت یہ ہے کہ جمرۂ عقبہ کی رمی رکن ہے اس کے ترک سے حج باطل ہو جائیگا۔ اور اس کے مقابل بعض کا قول یہ ہے کہ رمی صرف تکبیر کی یادداشت کے لئے ہے۔ جیسا کہ تکبیر بوقت رمی کی مباحث میں آگے آتا ہے۔ تفصیل اوجز میں ہے۔

له کذا فی الفتح وغیرہ

بعد طلوع الشمس —————— ترجمہ: طلوع آفتاب کے بعد۔

رمی پیدل ہو یا سواری پر؟ اوجز میں اس پر تفصیل سے لکھا ہے: ان دونوں صورتوں کے جواز پر ائمہ اربعہ کا اجماع نقل کرنے کے بعد افضلیت میں اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے موفق سے نقل کیا ہے کہ نافع کہتے ہیں ابن عمر یوم النحر کو جمرۂ عقبہ کی رمی اپنی سواری پر کیا کرتے تھے اور باقی تمام ایام کی رمی پیدل ہی کرتے تھے۔ اور وہ اس عمل کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرتے تھے۔ اس روایت سے جمرۂ عقبہ کی رمی اور دیگر جمرات کی رمی کے درمیان فرق ثابت ہوتا ہے۔ امام نووی اپنے مناسک میں جمرۂ عقبہ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اگر منیٰ میں سوار ہو کر آیا ہو تو اس کی رمی سواری پر کرے۔ اور ایام تشریق کے پہلے دو دنوں کی رمی پیدل مستحب ہے۔ اور تیسرے دن کی سوار ہو کر۔ ابن جماعہ کہتے ہیں کہ یہی مستحب ہے۔ اور دردیر لکھتے ہیں: اور منیٰ میں پہنچتے ہی جمرۂ عقبہ کی رمی مستحب ہے خواہ سوار ہو کر ہو۔ اور دیگر جمرات کی رمی پیدل کرنا مندوب ہے۔ اھ۔ اور دسوقی اس کی شرح میں لکھتے ہیں یعنی مستحب یہ ہے کہ منیٰ پہنچتے ہی جس حالت میں پہنچا ہو خواہ سوار ہو کر یا پیدل اسی حالت میں رمی کرے۔ انتہی مختصراً۔ اور احناف کا مذہب تو شیخ قدس سرہ کوکب میں فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم النحر کی رمی سوار ہونے کی حالت میں کی۔ یہ ہمارے نزدیک اگرچہ جائز ہے مگر خلاف اولیٰ ہے۔ اس موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سواری پر ہونے کا مقصد وہی ہے جو آپ کے سواری کی حالت میں طواف کرنے کا ہے کہ لوگ رمی کا طریقہ دیکھ لیں۔ یعنی رمی کرنے والا جمرات سے کتنی دور کھڑا ہو، کنکریوں کی تعداد کتنی ہو اور کس جانب کھڑا ہونا چاہئے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے دن کی رمی میں ان امور کو بیان فرما دیا تو اس کے بعد سوار ہو کر رمی نہیں کی۔ اھ۔ اور اس کے حاشیہ میں ہے کہ شیخ کا یہ ارشاد فقہ حنفی کے تین اقوال میں سے ایک کے مطابق ہے جس کا منشا یہ ہے کہ پیدل رمی کرنے میں کمال تضرع ہے نیز اس صورت میں لوگوں کی ایذا کا خطرہ نہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ سوار ہو کر رمی کرنا مطلقاً افضل ہے۔ اور تیسرا قول یہ ہے کہ جس رمی کے بعد رمی ہو اس میں پیدل رمی کرنا افضل ہے۔ ورنہ سوار ہو کر۔ حضرت شیخ کے نزدیک یہی قول مختار ہے۔ نیز آپ نے اپنے رسالہ ترجمۃ المناسک میں بھی اسی کو ترجیح دی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: اور پیدل رمی کرنا اولیٰ ہے۔ جیسا کہ ابن ہمام کا مختار ہے۔ اھ۔

طلوع آفتاب کے بعد یوم نحر کی رمی کے وقت میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ ضعفا کو مزدلفہ سے قبل

اور وقت کھینچنے کی بحث میں گذر چکا ہے۔

جمرہ کے پاس سے اٹھائی ہوئی کنکریوں سے رمی کرنا

ابن عربی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دن کی رمی ان کنکریوں کے ساتھ کی تھی جو ابن عباسؓ نے مقام رمی سے اٹھائی تھیں۔" اور ابن عربی کا یہ قول اس روایت کے خلاف ہے جو پہلے گذر چکی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ نے ان کو راستہ سے کنکریاں اٹھانے کا حکم کیا تھا۔ جو کنکریاں موضع رمی سے اٹھائی جائیں ان سے رمی کرنے پر اوجز میں خوب بسط سے کلام کیا ہے۔ اوجز میں ہے کہ موفق کہتے ہیں: "رمی کی کنکریاں راستے سے اٹھائے یا مزدلفہ سے اور یہ اس لئے مستحب ہے کہ منیٰ آنے کے بعد رمی سے پہلے کسی چیز میں مشغول نہ ہو کیونکہ جس طرح مسجد حرام کا تحیہ طواف ہے اسی طرح منیٰ کا تحیہ رمی ہے۔ اور امام شافعیؒ نے اس کو مستحب قرار دیا ہے۔ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ کنکریاں جہاں سے چاہو اٹھالو اور یہی صحیح تر ہے انشاء اللہ تعالیٰ کیونکہ ابن ماجہ کی حدیث ہے کہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عقبہ کی صبح کو جب کہ آپ اپنی اونٹنی پر سوار تھے، مجھ سے فرمایا کہ میرے لئے کنکریاں اٹھالاؤ۔ پس میں نے سات کنکریاں اٹھائیں۔" الحدیث۔ اور یہ منیٰ کا قصہ ہے اور اس میں تو کوئی اختلاف ہی نہیں کہ جہاں سے اٹھالے کفایت کریں گی۔ انتہیٰ۔

اور نووی کی شرح مہذب میں لکھتے ہیں: "ہمارا مذہب یہ ہے کہ رمی کے لئے کنکریاں اٹھانا مزدلفہ کے درمیان مستحب ہے اور حضرت عطاؒ، امام مالکؒ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ جہاں سے چاہے اٹھالے۔ ابن منذر کہتے ہیں: اس امر میں علماء کے درمیان کسی اختلاف کا مجھے علم نہیں کہ جہاں سے بھی اٹھالے کفایت کریں گی۔" انتہیٰ۔ اور اوجز میں مدونہ سے نقل کیا ہے کہ رمی کے لئے جہاں سے چاہے کنکریاں اٹھالے۔ البتہ جمرۂ عقبہ کے لئے مزدلفہ سے اٹھانا مستحب ہے۔" اور ابن عابدینؒ کہتے ہیں کہ "مستحب یہ ہے کہ جمرۂ عقبہ کے لئے مزدلفہ سے یا راستہ سے سات کنکریاں اٹھالے۔ اور ان سات کے علاوہ کے لئے ہمارے نزدیک کوئی مخصوص جگہ مقرر نہیں۔" انتہیٰ ملخصًا۔

اور ہدایہ میں ہے کہ "جہاں سے چاہے کنکریاں اٹھالے، مگر جمرہ کے پاس سے نہ لے، کہ یہ مکروہ ہے۔"

؎ کذا فی الاصل۔ شیخ

وَاحِدَةٍ بَعْدَ وَاحِدَةٍ يُكَبِّرُ مَعَ كُلِّ حَصَاةٍ

ترجمہ: یکے بعد دیگرے ایک ایک کنکری مارتے اور ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کہتے۔

کیونکہ جمرہ کے پاس کی کنکریاں غیر مقبول ہوتی ہیں، احادیث میں یہی آتا ہے، اس لئے وہاں سے اٹھانے میں بدشگونی ہے تاہم اگر کوئی ایسا کرے تو کفایت کرے گا کہ فعل رمی بہرحال پایا گیا۔ ابن ہمام اور سروجی لکھتے ہیں "اگر موضع رمی سے کنکریاں اٹھا کر رمی کی تو اس کو کفایت نہیں کرے گی" اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ اس کو کفایت کرے گی کیونکہ یہ بھی کنکریاں ہیں۔ لہٰذا عموم میں داخل ہیں ہماری دلیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر موضع رمی سے کنکریاں لی تھیں اور آپ نے فرمایا تھا "مجھ سے اپنے مناسک حاصل کرو" اور اوجز میں اس پر مفصل کلام کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ابن حزم کا یہ قول مردود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کنکریوں سے رمی کی تھی جو عبداللہ بن عباسؓ نے مقام رمی سے اٹھائی تھیں۔ علاوہ ازیں دونوں اقوال کے درمیان تطبیق ممکن ہے کہ مزدلفہ سے جو کنکریاں لی تھیں شاید ان میں سے کوئی حضرت فضلؓ سے گر گئی ہوگی۔ اس کے بدلہ میں آپ نے موقف سے یعنی جہاں آپ بطن وادی میں کھڑے تھے وہاں سے اٹھانے کا حکم فرمایا ہوگا۔ یہ نہیں کہ جہاں رمی کی کنکریاں گرتی ہیں وہاں سے اٹھانے کا حکم فرمایا ہو۔ اھ۔ الخ یہ بحث بہت بسط سے ہے۔

رمی سے متعلق سات تحقیقیں

یکے بعد دیگرے ایک ایک کنکری مارتے اور ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کہتے۔ کتاب الہدی، اور اوجز میں مسائل رمی پر خوب بسط سے کلام کیا ہے جس میں تقریباً بیس ابحاث ذکر کی ہیں۔ سات تحقیقیں اس مقام سے متعلق ہیں۔ اول: تکبیر کے وقت رفع یدین کا حکم۔ دوم: تکبیر کس وقت کہی جائے، رمی کے ساتھ یا رمی کے بعد؟ اکثر اہل علم کے نزدیک رمی کے ساتھ تکبیر کہنا مختار ہے۔ جیسا کہ اوجز میں اہل کتب تقدمہ سے نقل کیا ہے۔ سوم: اس تکبیر کا حکم، حافظ کہتے ہیں اس پر سب کا اجماع ہے کہ جو شخص تکبیر ترک کردے اس کے ذمہ کچھ لازم نہیں۔ البتہ امام ثوریؒ کا قول ہے کہ تارک تکبیر کھانا کھلا دے اور اگر دم کے ذریعہ اس کی تلافی کرلے تو میرے نزدیک اور بھی اچھی بات ہے۔ اھ۔ چہارم: الفاظ تکبیر، اوجز میں متعدد آثار سے اس کے الفاظ نقل کئے ہیں مثلاً بِسْمِ اللّٰهِ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ اور اَللّٰهُ اَكْبَرُ صَغِيرًا وغیرہ۔ پنجم: اگر تکبیر کے بجائے تسبیح کہے تو مضائقہ نہیں۔

ساتوں کنکریاں ایک ہی بار پھینکنے کا حکم

ششم: ایک ایک کنکری پھینکنا یہاں پر بحث اصل مقصود ہے اور اوجز میں اس پر بھی خوب بسط سے لکھا ہے۔ موفق کہتے ہیں: اگر بہت سی کنکریاں ایک ہی دفعہ پھینک دیں تو صرف ایک سمجھی جائے گی۔ امام احمدؒ نے اس کی تصریح کی ہے۔ اور یہی امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور اصحاب الرائے کا قول ہے۔ اور عطاء کہتے ہیں کہ اگر ساری ایک ہی دفعہ پھینک دیں تو کفایت کریں گی: میں کہتا ہوں کہ حافظؒ نے حنفیہ کا قول جو عطاء کے موافق نقل کیا ہے یہ صحیح نہیں۔ حنفیہ کی کتابوں میں معروف وہی ہے جو موفق نے نقل کیا ہے۔

رمی کے بجائے صرف تکبیر کہہ لینا

ہفتم: جو اوجز میں بحث رمی کے ضمن میں ذکر کی گئی ہے۔ وہ یہ کہ طبری نے بعض کا قول نقل کیا ہے کہ اگر کوئی کنکری نہ پھینکے بلکہ ہر جمرہ کے پاس سات مرتبہ تکبیر کہنا چاہیے تب بھی کافی ہے۔ ان صاحب کا کہنا ہے کہ کنکریاں پھینکنا دراصل سات تکبیروں کی یادداشت کے لئے ہے: جیسا کہ تسبیحات میں انگلیاں بند کرنا محض گنتی یاد رکھنے کے لئے ہے: پوری بحث اوجز میں دیکھئے۔ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں ایک باب کا عنوان یہ قائم کیا ہے "باب یکبر مع کل حصاۃ" میرے نزدیک اوجہ یہ ہے کہ اس عنوان سے مقصود اسی قول کی تردید ہے۔ چنانچہ میں نے تراجم بخاری میں اس کو بیان کیا ہے۔

(ق) اور حضرت بلالؓ اور حضرت اسامہؓ دونوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے ایک نے آپ کی اونٹنی کی مہار تھام رکھی تھی۔ دوسرے صاحب آپ کو دھوپ سے بچانے کے لئے کپڑے سے سایہ کر رہے تھے۔ اگر یہ یوم نحر کا قصہ ہے تو اس سے ثابت ہوا کہ محرم کے لئے کجاوہ وغیرہ کے سائے میں بیٹھنا جائز ہے۔ اور اگر یہ ایام منیٰ میں سے کسی اور دن کا قصہ ہے تو مسئلہ مذکورہ کی دلیل نہیں۔ اور حدیث میں یہ ذکر نہیں آتا کہ یہ کس وقت کا قصہ ہے۔ کذا فی البذل (ش) اور محرم کے سائے میں بیٹھنے کا مسئلہ اختلافی ہے اس کا بیان رسالہ کے ابتدائی صفحات میں آچکا ہے۔ جہاں یہ بحث آئی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹنی پر حج کیا۔ اور مشکوٰۃ شریف میں بروایت مسلم ام حصینؓ سے مروی ہے وہ فرماتی ہیں کہ: میں نے اسامہؓ و بلالؓ کو دیکھا کہ ان میں سے ایک آپ کی اونٹنی کی مہار تھامے ہوئے تھے۔ اور دوسرے اپنے کپڑے سے آپ کو سایہ کر رہے تھے۔ یہاں تک

کہ آپ جمرۂ عقبہ کی رمی سے فارغ ہو گئے" یہ حدیث اسی لفظ سے ابو داؤد میں بھی آئی ہے ملا علی قاری کہتے ہیں "اول سے مراد بلا شبہ بلال ؓ ہیں اور دوسرے سے اسامہ ؓ" اھ۔

میں کہتا ہوں کہ نسائی میں اسی حدیث کی روایت میں اس کی تصریح موجود ہے۔ روایت کے لفظ یہ ہیں "پس میں نے بلال ؓ کو دیکھا کہ آپ کی اونٹنی کی مہار تھامے ہوئے ہیں۔ اور اسامہ بن زید ؓ آپ پر کپڑے سے سایہ کر رہے ہیں ــــــ اور آپ احرام کی حالت میں تھے۔ یہاں تک کہ آپ نے جمرۂ عقبہ کی رمی کی" الخ اس میں آپ کے محرم ہونے کی بھی تصریح ہے۔ جس سے اس بات کی تعیین ہو گئی کہ یہ قصہ یوم نحر کا ہے۔ اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ ابو داؤد میں عمرو بن الاحوص کی ایک والدہ سے روایت ہے کہ وہ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سواری پر بطن وادی سے جمرہ کی رمی کر رہے تھے۔ اور ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کہتے تھے۔ ایک آدمی پیچھے سے آپ کو پردہ کر رہا تھا۔ میں نے اس شخص کا نام دریافت کیا تو لوگوں نے بتلایا کہ فضل بن عباس ؓ ہیں" الخ شیخ بذل میں اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں "یہ حدیث امام احمدؒ نے مفصل ذکر کی ہے۔ اور اس کے سیاق سے یہ اشکال حل ہو جاتا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ بطن وادی سے جمرۂ عقبہ کی رمی کر رہے تھے۔ اور آپ کے پیچھے ایک آدمی آپ کو لوگوں سے پردہ کر رہا تھا۔ کہ کہیں کوئی پتھر آپ کو نہ لگے" الخ تو اب صورت یہ ہوئی کہ حضرت فضل ؓ تو آپ کو پیچھے سے پردہ کئے ہوئے تھے۔ تاکہ آپ کو پیچھے سے آنے والی کنکریوں سے بچائیں۔ اور حضرت اسامہ ؓ اپنے کپڑے سے آپ کے سر مبارک پر دھوپ سے سایہ کر رہے تھے۔ اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ دونوں قصے دو الگ الگ ایام کے ہوں مگر ام حصین ؓ کی حدیث کا واقعہ متعین طور پر یوم نحر کا ہے۔ کیونکہ نسائی کی روایت میں آپ کے محرم ہونے کی تصریح ہے اور زرقانی ؒ نے یہ تطبیق دی ہے کہ ممکن ہے دونوں باری باری سایہ کر رہے ہوں۔ اور دیگر سے احتی جانے کی بحث میں گذر چکا ہے کہ بلال ؓ کے ہاتھ میں ایک لکڑی تھی جس پہ کپڑا لٹکا کر وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سایہ کر رہے تھے۔

ولم یزل یلبی الی اول حصاۃ ثم رجع الی منی فخطب خطبۃ ۔

ترجمہ: اور پہلی کنکری تک آپ برابر تلبیہ پڑھتے رہے پھر منی کی طرف لوٹے اور ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔

حاجی تلبیہ کب بند کرے گا

اور پہلی کنکری پھینکنے تک آپ برابر تلبیہ پڑھتے رہے یہ مشہور اختلافی مسئلہ ہے جو اوجز میں بسط کے ساتھ لکھا جا چکا ہوں ۔ اس کا اجمالی خلاصہ حاشیہ لامع میں مذکور ہے ۔ اور وہ یہ ہے کہ حاجی تلبیہ کب ختم کرے ۔ بخاری کی حدیث میں حضرت فضلؓ اور حضرت اسامہؓ دونوں کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رمی جمرۂ عقبہ تک برابر تلبیہ کہتے رہے ۔ جمہور کے قول کی ـــــ جن میں امام ابو حنیفہؒ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ بھی شامل ہیں دلیل ہے کہ جمرۂ عقبہ کی رمی تک تلبیہ کہنا چاہئے ۔ البتہ اس میں ان کا اختلاف ہے کہ پہلی کنکری کے ساتھ بند کرے یا ساری پوری کرنے کے بعد ۔ جمہور پہلی صورت کے قائل ہیں ۔ اور امام احمدؒ اور بعض اصحاب شافعیؒ دوسری صورت کے ۔ اور ایک گروہ کا قول ہے کہ محرم جب حرم میں داخل ہو جائے تو تلبیہ بند کرے لیکن جب مکہ سے عرفہ کی طرف نکلے تو دوبارہ تلبیہ شروع کرے ۔ ابن عمرؓ کا یہی مذہب ہے ۔ اور ایک گروہ کا قول ہے کہ جب عرفات میں موقف کی طرف چلے تو تلبیہ بند کرے ۔ امام مالکؒ اسی کے قائل ہیں ۔ اور انہوں نے اس کو یوم عرفہ کے زوال آفتاب کے ساتھ مقید کیا ہے ۔ پوری تفصیل اوجز میں دیکھی جائے ۔

خطبۂ یوم نحر

پھر منی کی طرف لوٹے اور ایک بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا ۔ اس خطبہ میں ائمہ کا اختلاف یوم الترویہ کے ذیل میں گذر چکا ہے ۔ چنانچہ شافعیہ و حنابلہ اس کے قائل ہیں ۔ اور حنفیہ و مالکیہ اس کے قائل نہیں بلکہ وہ اسے وصایا عامہ پر محمول کرتے ہیں ۔ عینیؒ نے یہ بات بڑے وثوق سے کہی ہے کہ یہ خطبہ وصایا عامہ کے باب سے تھا مناسک حج سے نہ تھا ۔ اور شیخ بذل میں فرماتے ہیں کہ امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ خطبہ مذکورہ متعلقات حج سے نہیں تھا کیونکہ احکام حج میں سے اس میں کوئی بات نہیں بیان فرمائی گئی ۔ اس میں صرف وصایا عامہ ذکر فرمائے ۔ اور کسی نے یہ نقل نہیں کیا کہ آپ نے اس خطبہ میں یوم نحر سے متعلق کوئی حکم بیان فرمایا ہو جس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ یہ خطبہ حج کی خاطر مقصود نہیں تھا ۔ اور ابن قصار کہتے ہیں : یہ خطبہ آپؐ نے ان مضامین کی تبلیغ کی خاطر ارشاد فرمایا تھا جو اس میں ذکر کئے گئے ہیں کیونکہ آپ نے دور دراز تو

سے بہت سا مجمع جمع تھا۔ دیکھنے والوں نے یوں گمان کیا کہ آپ نے خطبہ دیا۔ اور ان حضرات کا یہ کہنا
کہ یہ خطبہ دعایا عامہ کے قبیل سے تھا اس کی تائید ان مضامین سے ہوتی ہے جو شیخ ابن قیم نے اس
خطبہ کے ضمن میں نقل کئے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں: آپ نے لوگوں کو ایک بلیغ خطبہ دیا جس میں یوم نحر کی
اللہ تعالیٰ کے نزدیک حرمت اور تمام شہروں کے مقابلے میں مکہ مکرمہ کی عزت و حرمت بیان فرمائی۔ اور
حکم فرمایا کہ ہر وہ شخص جو کتاب اللہ کے مطابق تمہاری قیادت کرے اس کی سمع و طاعت بجا لاؤ۔
اور لوگوں کو ارشاد فرمایا کہ وہ اپنے مناسک حج سیکھ لیں۔ اور ارشاد فرمایا کہ شاید میں اس سال
کے بعد حج نہیں کروں گا۔ ان کو احکام حج کی تعلیم فرمائی۔ مہاجرین و انصار کے لئے ان کے منازل تجویز
فرمائے۔ لوگوں کو حکم فرمایا کہ وہ آپ کے بعد کفر کی طرف نہ لوٹ جائیں کہ ایک دوسرے کا گلا کاٹنے لگیں۔
آپ نے حکم فرمایا کہ حاضرین نے جو کچھ سنا ہے آپ کی جانب سے ان لوگوں کو جو یہاں موجود نہیں ا
پہنچا دیں اور آپ نے بتایا کہ بہت سے لوگ جن کو احکام پہنچائے جائیں سننے والے سے زیادہ محفوظ
کرنے والے ہوتے ہیں۔ اور آپ نے خطبہ میں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ہر مجرم کا جرم صرف اسی کی ذات پر
عائد ہوگا اور کسی دوسرے سے اس کی باز پرس نہیں ہوگی۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے لوگوں کے کان
کھول دیئے۔ یہاں تک کہ اہل منیٰ اپنی اپنی جگہ پر آپ کا خطبہ سن رہے تھے اور آپ نے اپنے اسی خطبہ
میں فرمایا: اپنے رب کی عبادت کرو۔ نماز پنجگانہ ادا کرو۔ ماہ مبارک کے روزے رکھو۔ اپنے اولو الامر
کی اطاعت کرو۔ اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ اور آپ نے اس وقت لوگوں کو الوداع کہی۔
اس لئے اس کا نام "حجۃ الوداع" ہوا۔

وغیرہ، اور اسی خطبہ میں آپ نے ایک دوسرے کے خون، مال اور آبرو کی حرمت بیان فرمائی۔
اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ وارث کے لئے وصیت نہیں ہے جیسا کہ بخاری میں ہے اور یہ بھی فرمایا کہ زمانہ
گھوم کر اپنی اصل حیثیت پر آ گیا ہے۔ سال کے بارہ مہینے ہیں۔ جن میں چار حرمت کے مہینے
ہیں۔ اور اس میں یہ بھی فرمایا کہ عنقریب تم اپنے رب کے سامنے جاؤ گے اور وہ تمہارے اعمال کے بارے
میں دریافت فرمائیں گے۔ دیکھو میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا الخ جیسا کہ روایات میں معروف ہے۔
اور یہ بھی تین بار فرمایا: دیکھو! کیا میں نے پہنچا دیا ہے؟ اور فرمایا سنو! جو حاضر ہیں وہ ان کو پہنچا
دیں جو حاضر نہیں۔ (الزرقانی، الطبقات) اور آپ نے مسیح دجال کا بھی تذکرہ کیا اور بہت طویل بیان فرمایا۔

یہ پوری حدیث بخاری کی باب حجۃ الوداع میں موجود ہے۔ ان کے علاوہ اور بہت سی وصیتیں فرمائیں۔
جو بہت سی کتب احادیث میں بالخصوص طبقات ابن سعد میں وارد ہوئی ہیں۔ اور اس سے زیادہ لطیفہ
واضح یہ ہے کہ یہ تمام روایات دلالت کرتی ہیں کہ اس خطبہ میں وصایا عامہ ذکر فرمائی تھیں۔ اسی
بنا پر امام بخاری فرماتے ہیں، جیسا کہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے ان سے نقل کیا ہے کہ اس خطبہ کے کسی راوی ابن
عمرؓ، ابن عباسؓ، ابی بکرہؓ وغیرہ نے یہ ذکر نہیں کیا کہ آپ نے کسی ایسی چیز کی تعلیم فرمائی ہو جس کا
تعلق یوم نحر سے ہے۔

سورۃ النصر کا نزول اور اللہ تعالیٰ یہ بھی کہتے ہیں کہ بیہقی میں حضرت ابن عمرؓ کی حدیث سے
بسند ضعیف اس وداع کا سبب مذکور ہے اس کے لفظ یہ ہیں کہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم پر اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وسط ایام تشریق میں نازل ہوئی اور آپ نے
سمجھا کہ یہ پیغام وداع ہے۔ پس آپ نے اپنی قصواء نامی اونٹنی کو تیار کرنے کا حکم فرمایا۔ پس تیار کی
گئی۔ پس آپ سوار ہوئے اور عقبہ میں ٹھہرے اور لوگ آپ کے گرد جمع ہو گئے۔ پس آپ نے فرمایا
اے لوگو! اس کے بعد حدیث کے مضامین ذکر کی ہیں جو اوپر ذکر ہوئے۔ اور یہ حدیث اس امر کی
دلیل ہے کہ یہ خطبہ یوم نحر میں نہیں۔ بلکہ ایام تشریق میں ہوا تھا کیونکہ یہ خطبہ سورۃ النصر کے نزول
کے بعد تھا اور سورۃ النصر وسط ایام تشریق میں نازل ہوئی۔ سورۃ النصر کے زمانہ نزول میں علماء
مختلف ہیں کہ آیا اس کا نزول وصال نبوی سے ایک سال پہلے ہوا تھا۔ یا دو سال پہلے اور یہ کہ اس
کا نزول مکہ میں ہوا یا مدینہ میں؟ ان روایات کی تفصیل درمنثور میں ہے۔ مندرجہ بالا روایت جو زرقانی
نے نقل کی ہے، علامہ سیوطیؒ نے بھی اسے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی تخریج ابن ابی شیبہ، عبد بن
حمید، بزار، ابویعلیٰ، ابن مردویہ اور بیہقی نے دلائل نبوت میں ابن عمرؓ سے کی ہے۔ اور ایام منیٰ کے ذیل
میں بھی وسط ایام تشریق میں اس کے نازل ہونے کا بیان آئے گا۔

حضرت شیخ بذل میں فرماتے ہیں کہ مولانا محمد یحییٰؒ نے اپنے شیخ قدس سرہ کے افادات میں تحریر
کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات حج کے سلسلہ میں روایات مختلف ہیں۔ اور ظاہر یہ ہے
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی دن خطبہ دیا۔ بلکہ ساتویں تاریخ سے ختم مناسک تک تمام ایام میں
خطبہ دیا۔ اور اس میں کوئی منافی کی بات نہیں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت سے یہی

ظاہر ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کو ہر وقت وعظ و تذکیر فرماتے تھے خصوصاً ان
دنوں میں وہ وعظ و نصیحت کے بہ نسبت دیگر اوقات کے زیادہ محتاج تھے۔ اور زیادہ سے زیادہ
تعداد میں جمع بھی تھے۔ لہذا یہ مناسب نہیں کہ خطبات کی تمام روایات کو تین یا چار خطبوں کی طرف راجع
کیا جائے۔ اور ہمارے علماء احناف رحمہم اللہ کا یہ مذہب کہ امام مکہ میں ساتویں کو خطبہ دے پھر نویں پھر گیارہویں
کو تو اس کا مقصد لوگوں کے لئے آسانی پیدا کرنا ہے۔ کیونکہ ان کے ہر ایک اجتماع سے انہیں حرج لاحق ہوگا
کہ انہیں ہر دن سامان اٹھانا اور چیزیں درست کرنا پڑیگی، رہا ان خطبات پر موقوف رکھنا تو علماء
کا یہ مقصد نہیں کہ ان خطبات پر زیادتی کرنا منع یا بدعت ہے۔ واللہ اعلم۔ انتہی۔ پھر قسطلانی نے کہا ہے کہ
کہ شیخ ابن تیمیہ کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ خطبہ بوقت چاشت ہوا۔ اور مناسک نووی میں ہے کہ
امام کے لئے سنت ہے کہ اس دن نماز ظہر کے بعد خطبہ دے۔ اور ابن حجر اس کی شرح میں لکھتے
ہیں کہ اس پر امام شافعیؒ اور ان کے اصحاب کا اتفاق ہے۔ مگر اس میں اشکال ہے کیونکہ احادیث
میں تصریح ہے کہ یہ خطبہ یوم نحر کی چاشت کو ہوا نہ کہ ظہر کے بعد۔ ابوداؤد میں بسند ثقات مروی ہے:
میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ منیٰ میں شہباء نامی خچر پر چاشت کے وقت خطبہ
دے رہے تھے۔ مصنف نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ صحیح بخاری میں ابن عباسؓ کی روایت سے معلوم
ہوتا ہے کہ یہ خطبہ زوال کے بعد تھا کیونکہ اس روایت میں ہے کہ بعض سائلین نے عرض کیا کہ میں نے شام
ہونے کے بعد رمی کی۔ اور شام کا اطلاق زوال کے بعد پر ہوتا ہے۔ اس لئے ابن عباس کی روایت
مقدم ہے کیونکہ وہ صحت و شہرت میں ابوداؤد کی روایت سے فائق ہے۔ اور علامہ سبکی نے یہ جواب
دیا کہ ابوداؤد کی روایت میں جو خطبہ مذکور ہے وہ یوم نحر کا نہیں بلکہ گیارہ تاریخ کا خطبہ ہے چنانچہ
طبقات ابن سعد میں عمرو بن یثربی سے یہی روایت اسی طرح مروی ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کا یوم نحر سے اگلے دن کا خطبہ یاد رکھا ہے۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قصواء نامی
اونٹنی پر سوار تھے۔ اور وہ اس پورے خطبہ کو نقل کیا کرتے تھے۔

خطبہ خچر پر دیا تھا یا اونٹنی پر؟

زرقانی کہتے ہیں کہ آپ نے شہباء نامی خچر پر خطبہ دیا۔ ملا علی قاری کہتے ہیں کہ شہباء کے معنی ہیں جس کا رنگ سفید ہو
اور اس میں تھوڑی سیاہی کی آمیزش ہو۔ اور قسطلانی کہتے ہیں یعنی سفید رنگ جس کی سفیدی

قلت: وعلی رضی اللہ عنہ یعبر عنہ

ترجمہ: رش! اور حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ترجمانی کرتے تھے۔

سیاہ رنگ غالب ہو۔" اور ابوداؤد کی کتاب اللباس کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ "اور سرخ چادر آپ کے زیب تن تھی۔" یہ حدیث ابوداؤد نے رافع بن عمرو المزنی سے اسی طرح روایت کی ہے۔ اور ابوداؤد ہی میں ہرماس بن زیاد سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں: "میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قربانی کے دن منیٰ میں اپنی عضباء نامی اونٹنی پر خطبہ دے رہے تھے۔" شیخ قدس سرہ بذل میں فرماتے ہیں کہ "یہ رافع بن عمرو کی روایت ہرماس کی روایت کے مخالف ہے لہذا ہرماس کی روایت کو خطبہ یوم النحر پر محمول کیا جائیگا۔ اور رافع بن عمرو کی حدیث خطبہ یوم النحر کے علاوہ کسی اور دن کی ہے۔"

حضرت علیؓ کا ترجمانی کرنا

رش! اور حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ترجمانی کرتے تھے۔ جیسا کہ زرقانی میں ہے۔ زرقانی کہتے ہیں "یُعَبِّرُ" بمعنی اَبْلَغَ ہے یعنی آپ کی آواز کو دور تک پہنچاتے تھے۔ جوہری کہتے ہیں کہ جب کسی کی جانب سے گفتگو کرو تو اس کے لئے عَبَّرْتُ عَنْ فُلَانٍ کہا جاتا ہے۔ اور زبان مافی الضمیر کی ترجمانی کرتی ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ وہ آپ کی عبارت کی تفسیر و تشریح کرتے تھے۔ اس صورت میں یہ لفظ تعبیر خواب سے ماخوذ ہوگا جس کے معنی ہیں تفسیر کرنا۔ یا یہ مطلب ہے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات لوگوں کو سمجھاتے تھے۔ یہ عَبَّرْتُ الکتاب سے ماخوذ ہوگا۔ لیکن پہلے معنی ظاہر بلکہ متعین ہیں۔" اور ملا علی قاری کہتے ہیں: "یعنی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز دور کے لوگوں کو پہنچاتے تھے۔ گویا حضرت علی رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنی دور کھڑے تھے جہاں تک آپ کی آواز پہنچ رہی تھی، اور وہ اسے سمجھ کر دور کے لوگوں کو کسی زیادتی کے بغیر سمجھا رہے تھے۔ اور ابن حجر کا یہ کہنا بے محل ہے کہ وہ اپنی طرف سے کچھ اضافہ کرکے پہنچاتے تھے۔" اھ۔

علامہ زرقانی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحابہ کے اس قول کے خلاف نہیں کہ "ہمارے کان کھل گئے تھے اور ہم اپنی اپنی جگہ آپ کی آواز سن رہے تھے۔" کیونکہ ممکن ہے کہ یہ خطبہ اس خطبے کے علاوہ ہو کیونکہ منیٰ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی بار خطبے ہوئے، یا یہ کہا جائے کہ معجزہ صرف انہی لوگوں کے حق میں تھا جو اس مجلس میں موجود نہیں تھے۔ اور جو لوگ اس مجلس میں حاضر تھے وہ معتاد طریقے ہی سے سنتے

تھے۔ اس لئے بسا اوقات کوئی لفظ شغل کی وجہ سے سننے سے رہ جاتا تھا یا بعض لوگ اس لغت سے ناواقف ہوں گے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے خطاب فرما رہے تھے۔ کیونکہ اس موقع پر مختلف قبائل سے بہت سی مخلوق جمع تھی۔ اور ملا علی قاری نے کہا ہے کہ یہ خطبہ اس خطبہ کے علاوہ تھا جو قبل ازیں ذکر کیا گیا۔ کیونکہ یہاں اونٹنی کا ذکر ہے اور وہاں خچر کا ذکر تھا۔ اور وہ حدیث جس میں خچر کا ذکر ہے۔ ابوداؤد، نسائی، بغوی اور طبرانی وغیرہ نے ان ہی سے یعنی رافع بن عمرو المزنی سے طوالت کے ساتھ روایت کی ہے اور وہ فرماتے ہیں: میں اپنے والد کے ساتھ حجۃ الوداع کو گیا۔ اس وقت میری عمر دس پانچ برس یا اس سے زیادہ تھی۔ میں نے دیکھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک شہبا نامی خچر پر لوگوں سے خطاب فرما رہے ہیں۔ اور علی بن ابی طالب آپ کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ لوگ کچھ کھڑے ہیں کچھ بیٹھے ہیں۔ میرے والد تو بیٹھ گئے۔ اور میں اونٹوں کے درمیان سے ہوتا ہوا خچر تک جا پہنچا۔ پس میں نے آپ کی رکاب پکڑ لی پھر میں نے آپ کے زانو پر ہاتھ رکھ کر پنڈلی تک ہاتھ پھیرا یہاں تک کہ قدم مبارک تک پہنچ گیا۔ پھر میں نے تلوے مبارک اور پاؤں مبارک کے درمیان ہاتھ ڈالا۔ مجھے آج تک یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ کے قدم مبارک کی ٹھنڈک میں اپنے ہاتھ میں پاتا ہوں۔ انتہی ـــــ ملا علی قاری کا کلام ختم ہوا۔

اور صحابہ کا یہ قول کہ ہم منیٰ میں اپنی اپنی جگہ بیٹھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ سن رہے تھے۔ اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے تو حضرات صحابہؓ اپنے اپنے خیموں میں کیسے بیٹھے رہے۔ حضرت شیخ قدس سرہ نے بذل میں اس کا بہت ہی عمدہ جواب التعلیق المحمود سے نقل کیا ہے۔ یہ میرے والد مرحوم نور اللہ مرقدہ کے سنن ابوداؤد کے افادات کا مجموعہ ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں جواب یہ ہے کہ یا تو اس سے مراد یہ ہے کہ جو لوگ کسی ضرورت سے اپنے خیموں میں رہ گئے تھے وہ بھی آپ کی آواز سن رہے تھے۔ یہ مطلب نہیں کہ وہ سب اپنے اپنے خیموں میں بیٹھے رہے یا یہ مراد ہے کہ اگر وہ اپنے خیموں میں بھی ہوتے اور خطبہ میں حاضر نہ ہوتے تب بھی آپ کی آواز سن سکتے تھے اور یہ بھی ممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے متفرق مسائل آغاز کئے ہوں۔ اور ان کو جمع کرنے کا اہتمام نہ فرمایا ہو کہ وہ حضرات از خود جمع ہوتے الخ۔ میں کہتا ہوں کہ اس ناکارہ کے نزدیک یہ تطبیق بھی ہو سکتی ہے کہ اس سے یہ مراد نہیں کہ وہ اپنی اپنی قیام گاہوں اور خیموں میں تھے کہ ان کی قیام گاہیں تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خطبہ کے بعد متعین فرمائی تھیں۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ خطبہ سننے کے لئے اس مجلس میں جہاں بھی کوئی بیٹھا تھا خواہ وہ آپ سے کتنا ہی دور بیٹھا ہو آپ کا خطبہ سن رہا تھا۔ گویا اس حدیث

(قال: وودع الناس فسمی حجۃ الوداع)

ترجمہ: راوی کہتا ہے اور آپ نے لوگوں کو الوداع کہی اس لئے یہ حج "حجۃ الوداع" کہلایا۔

میں منتقل ہے مجلس خطبہ کی نشست گاہیں مراد ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ سے دور تھیں کیونکہ صحابہ کرامؓ اس موقعہ پر ایک لاکھ چوبیس ہزار تھے۔ ظاہر ہے سب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب جگہ ملنا ممکن نہیں تھا۔ اس زمانہ میں لاؤڈ سپیکر یا مکبر الصوت بھی ایجاد نہیں ہوا تھا۔ اس لئے سب تک آواز کا پہنچنا آپ کا معجزہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے کان کھول دیئے۔

حجۃ الوداع کی وجہ تسمیہ اور دوسرے نام

(راوی) کہتا ہے اس موقعہ پر آپ نے لوگوں کو الوداع کہی، اس لئے یہ حج حجۃ الوداع کہلایا۔ اور حدیث میں ہے کہ یہ نام قسطلانی شارح بخاری نے لکھا ہے۔ الوداع "واؤ" کے فتح کے ساتھ ہے اور اس کا کسرہ بھی جائز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اس حج میں رخصت کیا اور آپ کو معلوم ہو چکا تھا کہ اس کے بعد آپ کو ایسے کسی اور موقعہ کا اتفاق نہیں ہوگا نہ اس جیسا اجتماع میسر ہوگا۔ اور سبب اس کا یہ ہوا کہ وسط ایام تشریق میں آپ پر اذا جاء نصر اللہ نازل ہوئی اور آپ نے جان لیا کہ یہ وداع کا پیغام ہے کہ آپ کی اجل قریب ہے۔ اور بعض کہتے ہیں اس کو حجۃ الوداع اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں لوگوں کو رخصت کیا اور یہ ارشاد فرمایا کہ شاید اس سال کے بعد تم سے نہیں مل سکوں گا۔ جن لوگوں نے اس نام کو مکروہ کہا ہے وہ ان کی غلطی ہے۔ اور اس کو حجۃ البلاغ کا نام بھی دیا گیا ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں فرمایا تھا ھل بلغت (کیا میں نے پہنچا دیا؟) اور اس کو حجۃ الاسلام بھی کہتے ہیں کہ اس سال پہلی بار صرف مسلمانوں نے حج کیا۔ کوئی مشرک شریک حج نہیں تھا۔ اور صاحب کے حاشیہ میں قسطلانی سے نقل کیا ہے کہ اس کو حجۃ الوداع اس بنا پر کہا گیا کہ آپ نے اس میں اور اس کے بعد لوگوں کو وداع (رخصت) کیا اور اس کا نام حجۃ الاسلام اس وجہ سے ہے کہ ہجرت کے بعد آپ نے مدینہ سے اس کے علاوہ کوئی حج نہیں کیا۔ اور حجۃ البلاغ اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ آپ نے اس میں مسائل حج کی قولاً وفعلاً تبلیغ فرمائی۔ نیز اس کا نام حجۃ التمام اور حجۃ الکمال بھی ہے۔ اور بخاری کے حاشیہ مطبوعہ ہندوستان میں اس پر یہ اضافہ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے الیوم اکملت لکم دینکم الآیہ اسی میں نازل کی۔ اور علامہ عینیؒ نے اس پر یہ اضافہ

کیا ہے کہ "حجۃ الوداع" کا نام زیادہ مشہور ہے۔" اھ اور ملا علی قاری فرماتے ہیں: "اس کا نام
"حجۃ الوداع" اس وجہ سے ہوا کہ آپ نے اس حج میں لوگوں کو یا حرم کو الوداع کہی" اھ اور
نیل المآرب میں ہے: "اس کو "حجۃ الوداع" کہنا مکروہ ہے۔ یہ کراہت کا قول صاحب تجنیس
نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔" اوجز کی عبارت ختم ہوئی۔

اور امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں ابن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ "ہم آپس کی گفتگو
میں "حجۃ الوداع" کا لفظ استعمال کیا کرتے تھے، جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان موجود تھے۔
مگر ہمیں خبر نہیں تھی کہ "حجۃ الوداع" کا مفہوم کیا ہے؟" شیخ نور الحقؒ فرماتے ہیں کہ "صحابہ کرام میں حضرات
خاصین اور دیگر اہل طبقہ کے حضرات تو اس کی وجہ تسمیہ جانتے تھے۔ مگر عام لوگ صرف دوسروں کی تقلید
میں یہ لفظ استعمال کرتے تھے، کیونکہ یہ بات بعید از قیاس ہے کہ کوئی بھی اس کی وجہ تسمیہ سے ناواقف ہو
مگر اس کے باوجود یہ نام استعمال کرتے ہوں۔ اور بعید نہیں کہ اس نام رکھنے کی ابتداء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کے اس ارشاد سے ہوئی ہو کہ شاید میں تم کو اس سال کے بعد نہیں دیکھ سکوں گا۔ پس لوگوں نے آپ کے
اس ارشاد کو اس معنی پر محمول کیا ہے کہ آپ آئندہ اس اجتماع کے ساتھ حج نہیں کریں گے، اس بنا پر
انہوں نے اس کا نام "حجۃ الوداع" رکھا۔ پھر جب اسی سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تو
لوگوں کو معلوم ہوا کہ آپ کا وداع کہنا کسی خاص جماعت سے مخصوص نہیں تھا۔ اور یہ کہ یہ صرف ان
لوگوں کو جو اس حج میں جمع تھے رخصت کرنا نہیں تھا بلکہ خاص و عام سب کو رخصت کرنا تھا۔" اھ اور
اس کے حاشیہ میں مولانا محمد حسن مکی کے "تقاریر" سے نقل کیا ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد کہ "ہمیں خبر
نہیں تھی" اس سے مراد یہ ہے کہ ہمیں خبر نہیں تھی کہ اس کو "حجۃ الوداع" کیوں کہتے ہیں کیونکہ غایت محبت کی
بنا پر ہمارے دل میں اس کا وہم بھی نہیں آتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے رخصت ہو جائیں گے۔ اھ
اور حافظ کہتے ہیں: "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "حجۃ الوداع" کا لفظ ذکر فرمایا اور
صحابہؓ اسے استعمال کرنے لگے۔ مگر ان کا ذہن ادھر نہیں گیا کہ وداع سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کا لوگوں کو وداع کرنا ہے، یہاں تک کہ اس کے کچھ عرصہ بعد ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا سانحہ پیش آیا
تو صحابہ کرامؓ اصل مراد کو سمجھے۔ لہٰذا انہیں معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اپنی اس وصیت

لہ وفی الاصل والمعنی ابدلنا آخرہ ببدء والظاہر او بعدہ فتنبہ۔

کے ذریعہ رخصت کیا تھا کہ آپ کے بعد کفر کی حالت کی طرف نہ لوٹ جائیں۔ اور اس وداع کو یوں مؤکد فرمایا
کہ پہلے ان کو اس بات پر گواہ بنایا کہ آپ تمام احکام خداوندی ان تک پہنچا چکے ہیں۔ اور پھر ان کی گواہی پر
اللہ تعالیٰ کو گواہ بنایا۔ اس وقت انہیں معلوم ہوا کہ حجۃ الوداع کے لفظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی
مراد کیا تھی؟ اور بخاری کی کتاب الحج "باب الخطبۃ بمنیٰ" میں بروایت عاصم عن ابیہ عن ابن عمر رضی اللہ
عنہ اس حدیث میں یہ لفظ ہے "فودع الناس" یعنی آپ نے لوگوں کو رخصت کیا۔ اور بیہقی کی روایت میں
ہے کہ سورۃ "اذا جاء نصر اللہ والفتح" وسط ایام تشریق میں نازل ہوئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے محسوس کیا کہ یہ وداع یعنی رخصت کا پیغام ہے۔ پس آپ سوار ہوئے اور لوگ جمع ہو گئے۔ پس
آپ نے خطبہ دیا الخ۔ اور یہی تفصیل حاشیہ لامع میں ہے۔

ارشاد نبوی، شاید میں تمہیں اس سال کے بعد نہیں دیکھوں گا

اور شیخ قدس سرہ الکوکب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے
ارشاد "شاید کہ میں تمہیں اس سال کے بعد نہیں دیکھوں گا" کے ذیل
میں فرماتے ہیں کہ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود اس
بات کی ترغیب دینا تھا کہ وہ آپ سے احکام سیکھ لیں۔ آپ نے اس حج میں اپنی امت کو وداع کیا
تھا۔ اس لئے اس کا نام حجۃ الوداع ہوا۔ تمام صحابہ اس کی وجہ تسمیہ کو نہیں سمجھ سکے۔ البتہ بعض فقہاء صحابہ
نے شروع ہی سے جان لیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کچھ ہی عرصہ میں انہیں چھوڑ کر سفر آخرت پر
روانہ ہونے والے ہیں۔ اور ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔ پھر جب اس حج کے تقریباً
دو ماہ بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دار دنیا سے رحلت کر کے عالم آخرت پہنچے تو تمام صحابہؓ کو تب معلوم ہوا کہ
اس حج کو حجۃ الوداع کے نام سے کیوں موسوم کیا گیا۔ اھ اور نووی لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا
ارشاد "شاید کہ میں اس حج کے بعد دوسرا حج نہ کر سکوں" اس میں ان کو وداع کہنے کی طرف اشارہ تھا اور
انہیں وصال نبوی کے قرب کی اطلاع دینا تھا۔ اور اس امر پر برانگیختہ کرنا تھا کہ آپ سے اخذ و استفادہ
کا بہت ہی اہتمام کریں۔ آپ کی ملازمت اور آپ سے دین کے امور کے سیکھنے کی فرصت کو غنیمت
جانیں۔ اسی بنا پر اس کو حجۃ الوداع کا نام دیا گیا۔ واللہ اعلم۔ اھ

وسئل هناك عن اشياء بالتقديم والتاخير فقال افعل ولا حرج

ترجمہ: اور اس موقعہ پر آپ سے چند چیزوں کی تقدیم و تاخیر کے بارے میں دریافت کیا گیا۔ آپ نے فرمایا: "کوئی حرج نہیں، اب کر لو"۔

ارشادِ نبوی: کوئی حرج نہیں اب کر لو

اور اس موقعہ پر آپ سے چند چیزوں کی تقدیم و تاخیر کے بارے میں دریافت کیا گیا، آپ نے فرمایا "کوئی حرج نہیں، اب کر لو"۔ شیخ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ اس موقعہ پر آپ سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص نے رمی سے پہلے حلق کر لیا، اور یہ بھی دریافت کیا گیا کہ ایک شخص نے رمی سے پہلے ذبح کا عمل کر لیا۔ آپ نے فرمایا: کوئی حرج نہیں۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں: میں نے نہیں دیکھا کہ آپ سے اس دن کسی چیز کے بارے میں دریافت کیا گیا ہو اور آپ نے یہ نہ فرمایا ہو کہ کوئی حرج نہیں، اب کر لو۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ ذبح، حلق اور رمی کی تقدیم و تاخیر کے بارے میں آپ سے عرض کیا گیا۔ آپ نے فرمایا: کوئی حرج نہیں۔ یہ حدیث صحیحین میں ہے۔ اور اسامہ بن شریک کہتے ہیں: ایک شخص عرض کرتا کہ یا رسول اللہ! میں نے طواف سے پہلے سعی کر لی یا میں نے فلاں چیز کو مؤخر کر دیا اور فلاں چیز کو پہلے کر لیا۔ مگر آپ ہر ایک کو یہی فرماتے کہ کوئی حرج نہیں، کوئی حرج نہیں، البتہ حرج اس شخص پر ہے جس نے کسی مسلمان آدمی کی عزت بطور ظلم پامال کی، پس یہ ایسا شخص ہے جو حرج میں واقع ہوا اور ہلاک ہوا۔ اور یہ فقرہ کہ میں نے طواف سے پہلے سعی کر لی اس حدیث میں محفوظ نہیں۔ محفوظ یہ ہے کہ رمی، نحر اور حلق کی تقدیم و تاخیر کا سوال کیا گیا تھا۔ انتہی۔ اور اسامہ بن شریک کی اس روایت کو ابو داؤد، طحاوی اور دارقطنی نے روایت کیا ہے، جیسا کہ نووی نے شرح مہذب میں لکھا ہے۔ اور دارقطنی کہتے ہیں کہ "میں نے طواف سے پہلے سعی کر لی" کا فقرہ صرف جریر نے شیبانی سے روایت کیا ہے۔

یوم النحر کے چار افعال کی تقدیم و تاخیر سے متعلقہ مباحث

رفیق! اس سوال میں چند بحثیں ہیں۔

اول: یہ سوال و جواب کس وقت ہوا؟ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال و جواب بوقت چاشت خطبہ کے دوران ہوئے اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ شام کے وقت خطبہ کے دوران ہوئے، کیونکہ ایک سوال یہ ہوا تھا کہ

لہ کذا فی البدر وفی الجامع لحدیث عبد اللہ بن عمرو بن العاص میشیخ

رمی سے تمام ہو جانے کے بعد ہوئی تھی؟ اور بعض سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سوال و جواب دوران خطبہ نہیں ہوئے۔ بلکہ اس وقت ہوئے جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اونٹنی کے لئے تشریف فرما تھے۔ چنانچہ مؤطا کی روایت اس پر دلالت کرتی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے موقعہ پر منیٰ میں لوگوں کی خاطر ٹھہرے ہوئے تھے۔ اور لوگ آپ سے سوالات کر رہے تھے۔" اور مسلم شریف میں بھی یہ روایت اسی سند سے مروی ہے۔ اس کے الفاظ اس سے زیادہ واضح ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کی خاطر ٹھہرے دراں حالیکہ لوگ آپ سے سوال کر رہے تھے۔" اور امام بخاری نے اپنی صحیح میں ایک باب کا عنوان یوں قائم کیا ہے "باب الفتیا علی الدابۃ عند الجمرۃ" اور اس کے ذیل میں یہ حدیث نقل کی ہے کہ آپ یوم النحر میں خطبہ دے رہے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاریؒ نے اس حدیث کو خطبہ پر نہیں بلکہ مسائل بتانے پر محمول کیا ہے چنانچہ آپ کہتے ہیں بخاری کا ترجمۃ الباب دلالت کرتا ہے کہ یہ خطبہ نہیں تھا۔" اھ تفصیل اوجز میں ہے۔

بحث دوم

روایات میں صرف یہ ہے کہ سوال ان چار چیزوں کی تقدیم و تاخیر کے بارے میں تھا جو اس دن کی جاتی ہیں یعنی رمی، ذبح، حلق اور افاضہ (طواف) کے لئے مکہ جانا اور یہی چار کام اس دن کئے جاتے ہیں۔ اوجز میں بسط کے ساتھ ان روایات کو ذکر کیا جو ان چاروں کے علاوہ میں مروی ہیں۔ اور اسامہ بن شریک کی روایت میں طواف سے پہلے سعی کرنے کا ذکر بھی ہے۔ اور شیخ ابن قیم کا قول پہلے گزر چکا ہے کہ یہ محفوظ نہیں۔ اور اوجز میں ہے کہ حافظ کہتے ہیں: "جو شخص طواف سے پہلے سعی کرے اس کے بارے میں دو قول ہیں۔ بعض اہل حدیث اسامہ بن شریک کی روایت کی بنا پر اس کے قائل ہیں کہ یہ صحیح ہے دوبارہ کی ضرورت نہیں۔ اور جمہور کہتے ہیں کہ یہ کفایت نہیں کرے گی۔ وہ حدیث اسامہ کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ یہ طواف قدوم کے بعد اور طواف افاضہ سے پہلے سعی کرنے پر محمول ہے اور ابن حزم کا مذہب یہ ہے کہ سعی کی تقدیم جائز ہے۔ اور ابن حزم نے ان لوگوں پر رد کیا ہے جو طواف و سعی کی تقدیم و تاخیر کے درمیان اور رمی کی استثناء کی تقدیم و تاخیر کے درمیان فرق کے قائل ہیں۔" اھ

اور نووی شرح مہذب میں لکھتے ہیں: "اگر کسی نے طواف سے پہلے سعی کر لی تو ہمارے نزدیک اس کی سعی صحیح نہیں یہی جمہور علماء کا قول ہے اور ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ ماوردی نے اس پر اجماع نقل کیا ہے اور یہی امام مالکؒ، امام ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ کا مذہب ہے۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم نے طواف کے بعد سعی کی اور فرمایا کہ مجھ سے مناسک سیکھ لو۔ رہی اسامہؓ کی حدیث! تو خطابی وغیرہ کی توجیہ کے مطابق اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے طواف قدوم کے بعد اور طواف! افاضہ سے پہلے سعی کی تھی۔

بحث سوم اکثر روایات میں صرف چار چیزوں کی تقدیم و تاخیر کے بارے میں سوال کا ذکر ہے۔ حافظؒ فرماتے ہیں کہ مجموعہ روایات سے چند صورتیں نکلتی ہیں جو ضرب و تقسیم کے بعد چوبیس تک پہنچ جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض تو مذکور ہیں اور بعض کو راویوں نے ذکر نہیں کیا۔ یا تو اختصار کی بنا پر یا اس وجہ سے کہ پیش نہیں آئی تھیں۔ اوجز میں ان چوبیس صورتوں کا نقشہ بصورت جدول دیا گیا ہے، تاکہ ان کا سمجھنا آسان ہو۔ جی چاہے تو وہاں دیکھ لو۔

بحث چہارم: ان افعال میں ائمہ کا اختلاف جاننا چاہیے کہ یوم نحر میں علی الترتیب چار عمل کئے جاتے ہیں: رمی، ذبح، حلق، طواف! افاضہ۔ یہ ترتیب علماء کے نزدیک مسنون ہے کیونکہ بہت سی روایات میں آتا ہے کہ آپ نے یہ عمل اسی ترتیب سے ادا کئے۔

امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور صاحبینؒ کے نزدیک ان چاروں میں ترتیب سنت ہے واجب نہیں۔ اس لئے اگر ان میں سے کسی چیز کو آگے پیچھے کر دیا تو ان کے نزدیک دم واجب نہیں۔ ان کا استدلال ان روایات سے ہے۔ جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے "افعل ولا حرج" یعنی کوئی مضائقہ نہیں۔ اب رہ گئے امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک بعض چیزوں میں ترتیب واجب ہے اور بعض میں سنت۔ پس جس نے ترتیب واجب کے خلاف کیا اس کے ذمہ دم لازم ہے۔ اور جس نے ترتیب مسنون کے خلاف کیا اس کے ذمہ دم تو نہیں مگر اس نے برا کیا۔ چنانچہ امام مالکؒ کے نزدیک رمی کے درمیان اور باقی تین چیزوں کے درمیان ترتیب واجب ہے۔ پس اگر ان تین چیزوں میں سے کسی ایک کو بھی رمی سے مقدم کر دیا تو دم واجب ہوگا۔ اور باقی تین چیزوں میں ترتیب سنت ہے۔ رہا امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک صرف مفرد بالحج کے لئے طواف اور ذبح کے درمیان ترتیب سنت ہے۔ ان کے علاوہ باقی تمام چیزوں میں ترتیب واجب ہے۔ خواہ مفرد ہو یا غیر مفرد۔ پس جو شخص ترتیب واجب کے خلاف کرے اس کے ذمہ دم لازم ہوگا۔ یہ اس تفصیل کا خلاصہ ہے جو اوجز میں مذاہب اربعہ کی کتابوں سے نقل کی گئی ہے۔ اور اوجز میں کتب فروع وغیرہ سے نقل مذاہب، ائمہ کے دلائل اور ان کے جواب میں خوب بسط سے کلام کیا ہے ترتیب

اور دم کے واجب ہونے پر حنفیہ اور ان کے موافقین کا استدلال متعدد وجوہ سے ہے۔ ایک یہ کہ یہ عرف قاعدہ ہے کہ راوی حدیث کا فتویٰ جب اس کی روایت کے خلاف ہو تو اس کے فتویٰ پر عمل ہوگا۔ اور حدیث الباب کے راوی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ وجوب دم کا فتویٰ دیتے ہیں۔ اور حافظؒ نے جو اس کا جواب دیا ہے عینیؒ نے اس پر رد کیا ہے جس کی تفصیل اوجز میں ہے۔ دوم یہ کہ امام مالکؒ موطا میں فرماتے ہیں کہ "وہ امر جس میں ہمارے یہاں اختلاف نہیں یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے سر کا حلق نہ کرے نہ اپنے جسم کے بال کاٹے یہاں تک کہ نحر کرے (جیسا کہ حضورؐ نے عمل کر کے فرمایا) کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ولا تحلقوا رؤسکم حتی یبلغ الہدی محلہ۔

سوم یہ کہ ابن رشد کہتے ہیں کہ امام مالکؒ کا اعتماد اس بات پر ہے کہ جس شخص نے کسی ضرورت کی بنا پر قبل از وقت حلق کیا اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فدیہ کا حکم فرمایا، اب جو شخص بلا ضرورت ایسا کرے اس پر کوئی چیز کیوں واجب نہ ہوگی۔ شیخ ابن ہمام نے اس پر جو جرح کی ہے اس کا جواب اوجز میں دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اور متعدد دلائل جن سے وجوب دم ثابت ہوتا ہے اوجز میں مفصل مذکور ہیں۔ نیز وہ احادیث جن میں یہ آتا ہے کہ "افعل ولا حرج" کوئی مضائقہ نہیں اب کرلو) ان کے بارہ جواب تفصیل سے ذکر کئے ہیں۔ ان میں سب سے واضح جواب یہ ہے کہ "لا حرج" میں گناہ کی نفی کی گئی ہے۔ دم کے وجوب یا عدم وجوب سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ اوجز میں ہے: "یہاں صرف گناہ کی نفی مراد ہے کسی اور چیز کی نہیں۔ اس کی ایک دلیل ابو داؤد کی یہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہی فرماتے رہے کہ: کوئی حرج نہیں مگر اس شخص پر جس نے کسی مسلمان کی عزت کو بطور ظلم پامال کیا پس یہی ایسا شخص ہے جو حرج میں واقع ہوا اور ہلاک ہوا"۔ یہ حدیث باواز بلند پکار کر کہتی ہے کہ یہاں صرف گناہ کی نفی مقصود ہے کیونکہ سلف و خلف میں سے کوئی شخص اس کا قائل نہیں کہ کسی مسلمان کی عزت پامال کرنے پر دم لازم آتا ہے۔ شیخؒ کوکب میں ارشاد فرماتے ہیں: "ارم ولا حرج" (اب رمی کرلو اور کوئی مضائقہ نہیں) کے ذیل میں فرماتے ہیں: اس سے ان حضرات نے استدلال کیا ہے جو ان امور ثلاثہ میں عدم ترتیب کے قائل ہیں کیونکہ "لا" نفی جنس کے لئے ہے جس سے تمام اقسام حرج کی نفی ہو جاتی ہے۔ امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ایسے موقعوں پر ایسی چیزوں کو حرج شمار نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ صحابہ کرام نے

وَنَزَّلَ النَّاسَ مَنَازِلَهُم

ترجمہ: اور آپ نے لوگوں کو ان کی قیام گاہوں میں اتارا کر ٹھیرنے کیلئے جائے قیام تجویز فرمائی

جب خطبہ سنا اور انہیں احکام کا علم ہوا تب انہیں احساس ہوا کہ وہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے خلاف عمل کر چکے ہیں۔ اور یہ خیال ان کے لئے بے چینی کا باعث ہوا کہ اندریں صورت انہیں اپنے حج سے بجز بار گناہ کے اور کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔ اور قضا کے واجب ہونے میں انہوں نے حرج محسوس کیا۔ اسی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاد سے دفع کیا۔ کہ جس چیز کا تمہیں اندیشہ ہے کہ ان غلطیوں کی وجہ سے قضا لازم ہوگی) اس سے کوئی حرج لاحق نہیں ہوا یعنی نہ تم گناہ گار ہوئے۔ نہ ان افعال کی قضا لازم ہے) رہا دم کے وجوب کا مسئلہ! تو وہ حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے جس کو ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے۔ لہٰذا اس پر عمل ہوگا۔"

اور ابن عباس کی یہ حدیث اوجز میں طحاوی اور ابن ابی شیبہ کے حوالے سے متعدد طرق کے ساتھ مذکور ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ان از حد امام پر تعجب ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "افعل ولا حرج" اور کوئی معنا نقد نہیں۔ اب کر لیں سے استدلال کرتے ہوئے ان افعال اربعہ میں تو وجوب ترتیب کے قائل نہیں۔ لیکن رمی جمرات میں ترتیب کو واجب کہتے ہیں حالانکہ جمرۂ اولیٰ سے پہلے جمرۂ وسطیٰ کی رمی کرنا بھی تقدیم و تاخیر میں داخل ہے۔ مگر یہاں وہ افعل ولا حرج کو نہیں لیتے۔

مہاجرین و انصار کیلئے منازل کی تعیین

اور آپ نے لوگوں کو ان کی قیام گاہوں میں اتارا ــــ کر ٹھیرنے کے لئے جائے قیام تجویز فرمائی۔

یہ حدیث ابوداؤد میں ان الفاظ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منیٰ میں لوگوں کو خطبہ دیا اور انہیں ان کی قیام گاہوں میں اتارا۔ چنانچہ قبلہ کی داہنی طرف اشارہ کر کے فرمایا "مہاجرین یہاں اتریں" اور قبلہ کی بائیں جانب اشارہ کر کے فرمایا "اور انصار یہاں فروکش ہوں۔ اور دوسرے لوگ ان کے ارد گرد قیام کریں" ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منیٰ میں ہمیں خطبہ دیا۔ پس ہمارے کان کھل گئے۔ یہاں تک کہ جو بھی ارشاد فرماتے ہمیں اپنی اپنی جگہ سنائی دے رہا تھا۔ پھر آپ لوگوں کو حج کے مسائل سکھانے لگے یہاں تک کہ رمی جمرات کے بیان تک پہنچ گئے۔ پھر آپ نے اپنی دونوں انگشتان شہادت دونوں کانوں میں رکھ کر بلند آواز سے فرمایا

دشمن کی لشکری ہو جو آگے بڑھ کر حملہ کرتی ہے۔ پھر مہاجرین کو حکم دیا تو وہ مسجد کی اگلی جانب اترے اور انصار کو حکم فرمایا تو وہ مسجد کی پچھلی جانب فروکش ہوئے۔ اس کے بعد پھر دوسرے لوگ اترے"

شیخ قدس سرہ پہلی حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں: "ان کی نمازگاہ یعنی ان کیلئے متعین کیا" قبلہ کی بائیں جانب یعنی جب تم قبلہ کی جانب منہ کرکے کھڑے ہو تو جو جانب تمہارے دائیں ہاتھ واقع ہوگی وہ قبلہ کی بائیں جانب ہے۔ اور جو تمہارے بائیں ہاتھ واقع ہوگی وہ قبلہ کی دائیں جانب ہوگی اور اگلی حدیث میں آئے گا کہ مہاجرین کو حکم فرمایا تو وہ مسجد کی اگلی جانب اترے اور انصار کو حکم فرمایا تو وہ مسجد کی پچھلی جانب اترے۔ اس کے بعد پھر دوسرے لوگ اترے" ان دونوں کے درمیان تطبیق یہ ہوگی کہ مہاجرین یمین قبلہ کی جانب مسجد کے اگلے حصہ میں اترے اور انصار قبلہ کی بائیں جانب مسجد کے پچھلے حصہ میں۔ "پھر اور لوگ" یعنی مہاجرین و انصار کے علاوہ جو اور لوگ ہیں وہ ان کے گرد اترے۔ آپ نے ان کی حد بندی کی اس لئے متعین کیں تاکہ ان کے مختلف قبائل کا اختلاط نہ ہو اور تاکہ ایک دوسرے کے قریب رہیں۔ اور انہیں اپنی ضروریات میں تنگی پیش نہ آئے" اھ

پھر یہاں یہ امر بھی پیش نظر رہے کہ اس بارے میں روایات مختلف ہیں کہ ان کے منازل کی تعیین خطبہ کے بعد ہوئی یا خطبہ سے پہلے؟ اور اس اختلاف کا حل اس لئے ممکن نہیں جو پہلے بھی کئی بار گذر چکا ہے کہ آپ کا خطبہ ان ایام میں کئی بار ہوا۔ اور بار بار تعلیم فرمائی اس لئے یہ کہا جائے گا کہ منازل کی تعیین ایک خطبہ کے بعد اور دوسرے خطبہ سے پہلے ہوئی۔

یہاں اس پر بھی تنبیہ ضروری ہے کہ امام بخاری نے عمرۃ التنعیم کے باب میں یہ حدیث ذکر کی ہے کہ سراقہ بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جمرۂ عقبہ کے پاس ملے جب کہ آپ اس کی رمی کر رہے تھے تو عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا یہ آپ ہی لوگوں کے لئے خاص ہے؟ فرمایا "نہیں بلکہ ہمیشہ کے لئے ہے" اھ۔ مگر آپ کی سعی کے ذکر میں

گذر چکا ہے کہ یہی سوال انہوں نے مروہ

کے پاس کیا تھا۔ تفصیل وہاں

گذر چکی ہے۔

ثم انصرف الى المنحر فنحر ثلاثا وستين

ترجمہ:۔ پھر منحر (قربان گاہ) کی طرف گئے پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تریسٹھ اونٹ نحر و ذبح کئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قربان گاہ

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم منحر (قربان گاہ) کی طرف تشریف لے گئے۔ یہ منیٰ میں ایک معروف جگہ ہے یوں منیٰ کی ساری زمین قربانی کی جگہ ہے، جیسا کہ حدیث میں آتا ہے۔ ابن التین کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قربانی کی جگہ جمرۂ اولیٰ کے قریب ہے جو مسجد کے متصل ہے۔ یہ زرقانی میں ہے۔ اور قطب الدین فرماتے ہیں کہ یہ جمرۂ عقبہ کے قریب تھی، اور یہ جو جمرۂ وسطیٰ کے قریب مسجد کی صورت میں مشہور ہے، اور جسے عوام مسجد نحر کہتے ہیں اس کی کچھ اصل نہیں بلکہ صحیح تر یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قربانی کی جگہ آپ کی قیام گاہ ہی میں تھی، مسجد خیف کے قریب اور قبلہ مسجد خیف سے آگے۔

آنحضرت نے کتنے اونٹ خود ذبح کئے

پس آپ نے عمر مبارک کے سالوں کی تعداد کے مطابق اپنے دست مبارک سے تریسٹھ اونٹ نحر و ذبح کئے۔ کذا فی المواہب۔ اور زرقانی کہتے ہیں کہ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے تریسٹھ اونٹ ذبح کرکے یعنی عمر مبارک کے کل سالوں کی تعداد کا قصد کیا۔ چنانچہ عمر مبارک بھی ۶۳ سال تھی پس ہر سال کے مقابلہ میں ایک اونٹ ہوا۔ یہ بات قاضی عیاض نے نقل کی۔ بعد ازاں زرقانی کہتے ہیں ظاہر یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف وہی اونٹ ذبح کئے جو آپ کے ساتھ مدینہ سے لائے تھے۔ اور ان کی تعداد ۶۳ تھی، جیسا کہ ترمذی نے روایت کیا ہے۔ اور سو میں سے باقی ماندہ کے ذبح کا کام حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سپرد فرمایا۔ اور مرقات میں قاضی عیاض سے نقل کیا ہے کہ غالباً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف وہی اونٹ ذبح کئے جو آپ کے ساتھ مدینہ سے آئے تھے۔ اور سو میں سے باقی ماندہ جو حضرت علیؓ کے ساتھ یمن سے آئے تھے وہ حضرت علیؓ کو عطا کر دئیے۔ اور لمعات کے حاشیہ میں ہے کہ اس سلسلہ میں روایات مختلف ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے کتنے اونٹ ذبح کئے۔ چنانچہ بخاری کی اس حدیث سے جو حضرت انسؓ سے مروی ہے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے سات اونٹ ذبح کئے۔ اور علماء کے یہاں معروف اور صحیح یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر مبارک کے سالوں

کی تعداد کے مطابق ۶۳ اونٹ اپنے دست مبارک سے ذبح کئے تھے۔ شیخ ابن تیمیہؒ منہاج میں کہتے ہیں کہ آپ نے ۶۳ اونٹ اپنے ہاتھ سے ذبح کئے، اور بقیہ کے ذبح کرنے کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا تھا۔ پس اگر کہا جائے کہ تم اس حدیث کا کیا کرو گے جو صحیحین میں حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے سات اونٹ ذبح کئے؟ اس کے جواب میں ابن حزمؒ کہتے ہیں کہ حضرت انسؓ کی حدیث کی تین توجیہیں ہو سکتی ہیں۔ اول یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعی سات سے زیادہ اونٹ بدست خود ذبح نہ کئے ہوں جیسا کہ حضرت انسؓ کا بیان ہے البتہ ایسا ہوا کہ سات کے بعد ۶۳ تک تو آپ نے اپنے سامنے ذبح کرائے، اور پھر وہاں سے تشریف لے گئے اور باقی ماندہ کے ذبح کرنے کا حکم حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا۔ دوم یہ کہ حضرت انسؓ نے صرف سات ہی کو ذبح ہوتے دیکھا ہو، اور حضرت جابرؓ نے ۶۳ کو اور ہر شخص نے اپنے اپنے مشاہدہ کو بیان فرمایا۔ سوم یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سات اونٹ تو بلا شرکت غیرے ذبح کئے، انہی کو حضرت انسؓ نے بیان کیا، اس کے بعد حضرت علیؓ نے آپ کے ساتھ نیزہ پکڑا، اور دونوں نے مل کر ۶۳ تک ذبح کئے، چنانچہ عروہ بن حارث کندی کہتے ہیں کہ انہوں نے اس دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ نے نیزہ اوپر کی جانب سے پکڑا اور حضرت علیؓ کو نیچے کی طرف سے پکڑنے کا حکم فرمایا۔ پھر دونوں نے مل کر اونٹ ذبح کئے، اور ۶۳ کے بعد سو تک حضرت علیؓ نے تنہا ذبح کئے، جیسا کہ حضرت جابرؓ کا بیان ہے۔ اگر کہا جائے کہ تم اس حدیث کا کیا کرو گے جو امام احمدؒ اور ابوداؤدؒ نے حضرت علیؓ سے روایت کی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تیس اونٹ ذبح کر لئے تو مجھے حکم فرمایا، باقی میں نے ذبح کئے؟ ہم کہتے ہیں کہ یہ غلط ہے، دراصل حضرت علیؓ کے ذبح کردہ اونٹوں کی تعداد کو راوی نے غلطی سے الٹ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا۔

اگر کہا جائے کہ تم عبداللہ بن قرطؓ کی حدیث کا کیا کرو گے جس میں یوں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب پانچ اونٹ لائے گئے، پس وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آگے بڑھتے تھے کہ آپ کس سے ابتداء فرماتے ہیں؟ ہمارا جواب یہ ہے کہ ہم اسے قبول کر کے اس کی تصدیق کرتے ہیں، دراصل سو اونٹ یکبارگی ہی آپ کے پاس نہیں لائے گئے تھے، بلکہ گروہ در گروہ لائے جاتے تھے، ان میں سے ایک گروہ پانچ نفری تھا۔ اور یہی گروہ تھا جن میں سے ہر ایک آگے بڑھ کر یہ چاہتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے اس سے بسم اللہ کریں۔ ابن تیمیہ کی تقریر مختصراً ختم ہوئی۔

اور ہمارے شیخ قدس سرہٗ نے حضرت علیؓ اور حضرت جابرؓ کی حدیث میں متعدد وجوہ سے تطبیق دی ہے۔ ان میں ایک یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تریسٹھ کسی کی اعانت کے بغیر ذبح کئے اور سینتیس حضرت علیؓ کی شرکت کے ساتھ اور باقی ماندہ حضرت علیؓ نے ذبح کئے۔ میں کہتا ہوں یہ جواب میرے نزدیک سب سے عمدہ ہے کیونکہ اس میں حضرت علیؓ کی روایت کو غلط کہنے اور راوی پر لفظ کے الٹ جانے کا دعویٰ کرنے کی حاجت نہیں پڑتی۔ اور حضرت انسؓ کی حدیث میں سات کی تخصیص کی سب سے عمدہ توجیہ یہ ہے کہ وہ سات وہی ہیں جن کا ذکر عبد اللہ بن قرطؓ کی حدیث میں ہے جو بحوالہ احمد و ابوداؤد پہلے گزر چکی۔ یوں آیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک آگے بڑھتا جاتا تھا کہ آپ کس سے ابتدا کرتے ہیں؟ اور اس خصوصیت کی بنا پر انہیں الگ ذکر کیا، اور عبد اللہ بن قرطؓ کی اس حدیث میں امام احمدؒ اور ابوداؤدؒ نے پانچ یا چھ کا لفظ شک راوی کے ساتھ ذکر کیا ہے ایسی بعید نہیں کہ وہ سات ہوں۔ اور بعض میں موفق کے کلام سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ عبد اللہ بن قرطؓ کی حدیث میں ذکر شدہ پانچ اونٹوں کو حضرت جابرؓ کی حدیث کے سو اونٹوں کے علاوہ سمجھتے ہیں چنانچہ وہ اس بحث میں کہ قربانی کا گوشت کھانا مستحب ہے، لکھتے ہیں: "اصحاب رائے کہتے ہیں کہ صدقہ کرنا زیادہ بہتر ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدی کے سو اونٹ ذبح کئے اور ہر اونٹ سے گوشت کا ٹکڑا لینے کا حکم فرمایا اور پھر ان سب کا شوربا نوش فرمایا۔ اور آپ نے پانچ اونٹ ذبح کئے اور فرمایا جو چاہے ان کا گوشت کاٹ کر لے جائے۔" آگے چل کر لکھتے ہیں: "اور آپ نے ان میں سے کچھ نہیں کھایا۔" اور موفق کے ان دونوں عبارتوں سے ظاہر ہے کہ وہ پانچ اونٹوں والی حدیث کو قصۂ حجۃ الوداع کے علاوہ کسی اور موقع پر محمول کرتے ہیں۔ حاشیہ لامع کا مضمون ختم ہوا۔

سات اونٹوں کی تخصیص کی وجہ

اور اس ناکارہ کے نزدیک جیسا کہ ابھی گزرا ان پانچ یا سات کی اختلاف روایات۔ کی تخصیص کی سب سے عمدہ توجیہ وہی ہے جس کی طرف ابوداؤد کی روایت میں یوں اشارہ کیا گیا ہے: "ان میں سے ہر ایک آگے بڑھتا تھا کہ آپ سب سے پہلے کس سے ابتدا فرماتے ہیں" اور شاعر نے خوب کہا ہے۔

داغ جاتے تو ہیں مقتل میں ہر اک سب سے
دیکھئے وار کرے وہ ستم آرا کس پر؟

اور دوسرے شاعر نے اسی مضمون کو یوں باندھا ہے: ۔

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ بر کف　　بامید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد (میر خسرو)

نمبر ۱ ——— سے

قصور نصیب دشمن کہ شور با آں تیغ خفت — سر بر دستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(عراقی)

قربانی کی جھول اور کھال کے صدقہ کا حکم

ذبح ہوئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ حکم فرمایا کہ ان کی جھول، چمڑے اور گوشت مساکین پر صدقہ کر دیں، اور یہ بھی فرمایا کہ قصاب کو اجرت میں قربانی کی کوئی چیز نہ دیں، اور فرمایا کہ اجرت ہم اپنے پاس سے دیں گے، اور فرمایا کہ جس کا جی چاہے گوشت کاٹ کر لے جائے" اھ

قصاب کو اس میں سے اجرت نہ دی جائے

اور ابن ماجہ کے حاشیہ میں ہے کہ بغوی کہتے ہیں: جب قصاب کو اجرت پوری دے دی جائے اور پھر اگر وہ فقیر ہو تو اس پر صدقہ کر دیا جائے تو کوئی حرج نہیں، اور بغوی کے علاوہ دوسرے حضرات نے کہا ہے کہ قصاب کو اس کی اجرت میں گوشت دینا ممنوع ہے کیونکہ یہ معاوضہ ہے، اور بطور صدقہ یا ہدیہ کے دینا اندر دے قیاس جائز ہے، لیکن شارع کے مطلقاً منع کرنے سے مفہوم ہوتا ہے کہ اس کو صدقہ کے طور پر دینا بھی ممنوع ہے کیونکہ اس کی وجہ سے اجرت میں رعایت کرنے کا احتمال ہے، بالآخر یہ بھی معاوضہ ہی کی صورت ہو جائے گی، اور صرف حسن بصریؒ اور عبداللہ بن عبیدؒ نے اس کی رخصت دی ہے"

آنحضرتؐ نے شوربا نوش فرمایا

بخاری اور مشکوٰۃ میں مسلم وغیرہ کی جو طویل حدیث حضرت جابرؓ سے مروی ہے اس میں یہ ہے: "حضرت علیؓ کو حکم فرمایا انہوں نے باقی ماندہ اونٹ ذبح کئے، پھر حکم فرمایا کہ ہر قربانی کا ایک ایک ٹکڑا لیا جائے۔ چنانچہ ان کو ہنڈیا میں پکایا گیا۔ پس دونوں حضرات نے ان کا گوشت کھایا اور شوربا نوش کیا"

ہدی کے کن کن جانوروں کا گوشت کھانا جائز ہے

نووی کہتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ نفل کی ہدی اور قربانی سے کھانا مستحب ہے، علماء فرماتے ہیں کہ چونکہ ہر ایک قربانی سے کھانا سنت ہے اور سو قربانیوں کو الگ الگ پکانے میں زحمت تھی اس لئے سب کو ایک ہی ہنڈیا میں ڈال دیا گیا، تاکہ آپ اس مجموعہ کے شوربے کو جس میں ہر ایک کا جز ہے نوش فرما سکیں، اور شوربے میں جو گوشت ہے اس سے بقدر ضرورت تناول فرما سکیں۔ اور علماء کا اتفاق ہے کہ نفل ہدی اور قربانی سے کھانا سنت ہے واجب نہیں ہے اھ۔

میں کہتا ہوں کہ اس حدیث سے موفق نے المغنی میں اور صاحب ہدایہ نے استدلال کیا ہے کہ تمتع اور قران

کی ہدی سے کھانا مستحب ہے۔ یہ مشہور اختلافی مسئلہ ہے جس کی تفصیل اوجز میں ان کی کتب فروع
سے نقل کی گئی ہے اور اس کا خلاصہ حاشیۂ لامع میں ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: "جن ہدایا کا گوشت کھایا
جاسکتا ہے ان کے بیان میں آئمہ مذاہب کا اختلاف ہے جس کی تفصیل اوجز میں ذکر کی گئی ہے۔ اور
اس میں مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ گذشتہ عبارتوں سے واضح ہوا کہ حنابلہ کے نزدیک
دم تمتع، دم قران اور دم تطوع کے علاوہ کسی کا کھانا جائز نہیں۔ یہی قول حنفیہ کا ہے۔ امام مالکؒ کا مشہور
مذہب یہ ہے کہ ہر وہ ہدی جو اپنے محل پر پہنچ چکی ہو اس کا کھانا جائز ہے۔ البتہ جزائے صید، فدیۂ اذیٰ
اور نذر مساکین کی ہدی کا کھانا جائز نہیں۔ لیکن شافعیہ کے نزدیک کسی دم واجب کا کھانا جائز نہیں۔
حتیٰ کہ دم تمتع اور دم قران کا کھانا بھی درست نہیں۔ اور دم تطوع کا کھانا جائز ہے۔ مگر کچھ گوشت
کا صدقہ کرنا بھی واجب ہے" اھ

کیا ان سو[۱۰۰] اونٹوں میں ابوجہل کا اونٹ بھی تھا؟

کیا حجۃ الوداع میں ابوجہل کا اونٹ نحر کیا گیا | جیسا کہ ترمذی شریف کے باب حج النبی صلی اللہ علیہ وسلم
میں حضرت جابرؓ سے اس کی تصریح منقول ہے۔ اور مؤطا امام مالکؒ کے الفاظ بروایت عبداللہ بن
ابی بکر بن حزم یہ ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج یا عمرہ میں ابوجہل کا اونٹ ہدی کیا تھا" اور
اوجز میں ہے کہ یہ راوی کا شک ہے۔ اور ابوداؤد میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم حدیبیہ کے سال میں جن اونٹوں کو ہدی لے گئے ابوجہل کا اونٹ بھی ذبح کیا تھا۔ اس کی ناک میں چاندی
کی نکیل تھی۔ اور ترمذی نے حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین حج کئے،
دو ہجرت سے پہلے اور ایک ہجرت کے بعد جس کے ساتھ عمرہ بھی تھا۔ آپ اپنے ساتھ ۶۳ اونٹ
لے گئے تھے۔ اور باقی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ یمن سے لائے تھے، ان میں ابوجہل
کا اونٹ بھی شامل تھا۔ صاحب عارضۃ الاحوذی وغیرہ نے اس اختلاف سے سکوت
اختیار کیا۔ اور شیخؒ کوکب میں فرماتے ہیں: "یہ صحیح نہیں کیونکہ ابوجہل کا اونٹ عمرۂ حدیبیہ
میں ذبح فرمایا تھا اور اگر یہاں نہیں تو عمرۂ قضا میں۔ اور وہ اتنی مدت زندہ نہیں رہا کہ
اسے حجۃ الوداع میں ذبح کرنے کی نوبت آتی جس میں آپ نے سو اونٹ قربان کئے تھے" اھ
اور اس کے حاشیہ میں ہے کہ یہی صحیح ہے کیونکہ عام اہل سیر ابن اسحٰق، ابن ہشام اور ابن کثیر

وقلت: وذبح عن نسائه بقرة

ترجمہ: (ش) اور آپ نے ازواج مطہرات کی طرف سے ایک گائے ذبح کی۔

نے "البدایہ والنہایہ" میں ابوجہل کے اونٹ کی قربانی کا تذکرہ عمرۂ حدیبیہ میں ذکر کیا ہے جو اوائل میں نہیں۔ چنانچہ زاد المعاد میں قصۂ حدیبیہ کے فوائد کے ضمن میں لکھا ہے: "ان میں ایک یہ ہے کہ اللہ کے دشمنوں کو غیظ دلانے کا استحباب ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدی کے جانوروں میں ابوجہل کا اونٹ بھی قربان کیا"۔ اور شیخ محمد عمر ونے اپنے اس قول میں کہ "اگر یہاں نہیں تو عمرۂ قضاء میں" اس قصہ کی طرف اشارہ کیا ہے جو اہل سیر نے ذکر کیا ہے کہ یہ اونٹ بھاگ گیا تھا۔ چنانچہ العینی میں ہے کہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرۂ حدیبیہ میں جن جانوروں کا ہدیہ کیا ان میں ابوجہل کا اونٹ بھی ہدی کیا تھا۔ یہ آپ کو غزوۂ بدر کی غنیمت میں حاصل ہوا تھا۔ مروی ہے کہ ابوجہل کا یہ اونٹ بھاگ کر مکہ چلا گیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کارندے اس کے تعاقب میں گئے۔ سفہاء قریش نے انکار کیا کہ اسے واپس نہ کیا جائے مگر سہیل بن عمرو نے جس نے معاہدۂ صلح کا سنگ بنیاد رکھا تھا انہیں اس سے منع کیا۔ چنانچہ وہ واپس لایا گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے نحر کیا۔ پوری تفصیل اوجز میں ہے۔

صاحب خمیس نے لکھا ہے کہ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عمر مبارک کے سالوں کی تعداد کے مطابق ۶۳ اونٹ ذبح کئے اور ۶۳ غلام آزاد کئے۔ اور حیوۃ الحیوان میں ہے کہ آپ نے حجۃ الوداع میں ۱۰۰ اونٹ ذبح کئے اور ۶۳ غلام آزاد کئے تھے اھ

ازواج مطہرات کی طرف سے گائے ذبح کرنا اور اس میں اشکال

(ش) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات کی طرف سے ایک گائے ذبح کی۔ ابوداؤد کے لفظ بروایت ابوہریرہؓ یہ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ازواج مطہرات کی جانب سے جنہوں نے عمرہ کیا تھا ایک گائے ذبح کی جو ان کے مابین مشترک تھی"۔ اس پر مشہور اشکال ہے کہ ازواج مطہرات تو نو تھیں ایک گائے ان سب کی طرف سے کیسے کافی ہوگی؟ اوجز میں اس اشکال کے کئی جواب دیئے گئے ہیں۔ اور اس کا خلاصہ کوکب کے حاشیہ میں ہے۔ جس کے الفاظ یہ ہیں: "اور میرے نزدیک سب سے اچھا جواب یہ ہے کہ آنحضرت صلی

اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ کی جانب سے الگ گائے ذبح کی تھی جیسا کہ مسلم میں حضرت جابرؓ کی
روایت سے مفہوم ہوتا ہے اور بقیہ ازواج کی جانب سے ایک گائے تھی جو ابو داؤد کی روایت
میں مذکور ہے حضرت عائشہؓ ان میں داخل نہیں تھیں۔ کیونکہ ابو داؤد کے الفاظ ہیں "ان ازواج کی طرف
سے جنہوں نے عمرہ کیا تھا" اس سے مانع ہیں کیونکہ حضرت عائشہؓ ہمارے نزدیک مفرد بالحج تھیں۔
البتہ یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کو خارج کر کے بھی تو ازواج مطہرات کی تعداد آٹھ ہوتی
ہے، میرے نزدیک بعید نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سودہؓ کو حضرت عائشہؓ کی گائے
میں شریک کر دیا ہو۔ کیونکہ انہوں نے اپنی باری حضرت عائشہؓ کو دے رکھی تھی۔ اس توجیہ کے مطابق
حضرت عائشہؓ کی حدیث پر شذوذ کا حکم کرنے کی حاجت نہیں رہتی، جیسا کہ حافظؒ نے کیا ہے اور
ابن حزمؒ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ دیگر ازواج مطہرات کے ساتھ شریک نہیں تھیں۔
کیونکہ دیگر ازواج کا تمتع تھا۔ اور حضرت عائشہؓ کا قران۔ اور قران والے پر ابن حزمؒ کے نزدیک
ہدی لازم نہیں۔

ابن قیمؒ اس پر رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "یہ مسلک فاسد ہے جس میں ابن حزمؒ تمام لوگوں سے متفرد
ہیں، کیونکہ صحابہؓ، تابعینؒ اور ما بعد کے تمام حضرات اس پر متفق ہیں کہ قارن پر ہدی لازم ہے، جس طرح
کہ متمتع پر لازم ہے۔" میں کہتا ہوں حضرت عائشہؓ کا قارن ہونا ان کے مسلک پر مبنی ہے ورنہ ہمارے
نزدیک مفرد بالحج تھیں۔ یہ بحث احرام عائشہؓ کے بیان میں پہلے گذر چکی ہے بعد ازاں ابن قیمؒ نے
طویل کلام میں اس اشکال کا جواب دیا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ وہ روایات جن میں سات کی شرکت
کا ذکر ہے تعداد میں بھی زیادہ ہیں اور صحت میں بھی فائق ہیں۔ اور زرقانی نے شرح مواہب میں ان
روایات پر خوب بسط سے لکھا ہے، اور نسائی کی اس روایت کو جو حضرت عائشہؓ سے مروی ہے،
ترجیح دی ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے حج کے سال ہماری جانب سے فقط ایک
گائے ذبح کی تھی" اور حافظؒ نے جو اس حدیث پر شذوذ کا حکم کیا ہے اس پر زرقانیؒ نے تعقب کرتے
ہوئے لکھا ہے کہ حدیث عائشہؓ کا راوی عمار الدہنی مسلم اور سنن اربعہ کا راوی ہے اس کی زیادتی
مقبول ہوگی کہ جو لفظ دوسرے نے یاد نہیں رکھا وہ اس نے یاد رکھا۔ اور اس راوی کی زیادتی دیگر
راویوں کے خلاف بھی نہیں کیونکہ معمر کی روایت میں جو الفاظ ہیں کہ "آپ نے صرف گائے ذبح کی"

اس سے مراد جنس ہے۔ مطلب یہ کہ اونٹ اور بکری کی قربانی نہیں کی بلکہ صرف گائے کی قربانی کی تھی۔ انتہیٰ
یہ اس صریح روایت کے خلاف نہیں جس میں ہر ایک کی جانب سے گائے ذبح کرنے کا ذکر آتا ہے۔ اور
شذوذ کا حکم تو جب کیا جا سکتا ہے جب کہ دو روایتوں میں تطبیق ممکن نہ ہو۔ اور یہاں ممکن ہے الخ
حاصل یہ کہ ترمذی کا رجحان اس طرف ہے کہ تمام ازواج کی جانب سے ایک ایک گائے ذبح کی گئی تھی۔

نحر کی جگہ ذبح اور ذبح کی جگہ نحر

اس حدیث میں چند بحثیں ہیں جن کی تفصیل اوجز میں ہے۔ ایک یہ کہ روایات میں ذبح اور نحر دونوں الفاظ آتے ہیں۔ اس امر میں علماء کا اختلاف ہے کہ قابل ذبح جانور کا نحر اور قابل نحر جانوروں کا ذبح جائز ہے یا نہیں؟ موفق کہتے ہیں: اہل علم کے درمیان اس امر میں تو اختلاف نہیں کہ اونٹ کا نحر مستحب ہے اور اس کے علاوہ دوسرے مویشیوں کا ذبح۔ پھر اگر اونٹ کا ذبح اور دیگر مویشیوں کا نحر ہو تو جمہور علماء کے نزدیک جائز ہے۔ اور داؤد ظاہری سے منقول ہے کہ اونٹ نحر کے بغیر اور دیگر جانور ذبح کے بغیر حلال نہیں ہوں گے۔ انتہیٰ مختصراً۔ امام مالکؒ کا صحیح مذہب یہ ہے کہ اونٹ کا نحر واجب ہے جیسا کہ اوجز میں دردیر اور دسوقی کا قول مفصل مذکور ہے۔

ہدی میں اشتراک: بحث دوم

ایک بحث یہ ہے کہ ہدایا میں اشتراک جائز ہے یا نہیں؟ جمہور کے نزدیک جائز ہے اور مالکیہ کے نزدیک جائز نہیں۔ چنانچہ موطا میں ہے کہ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ انہوں نے بعض اہل علم سے سنا ہے کہ ایک بدنہ (اونٹ یا گائے) میں مرد اور عورت دونوں شریک نہ ہوں بلکہ ہر ایک کو الگ بدنہ کی ہدی کرنی چاہئے۔ اور دردیر کہتے ہیں: ہدی خواہ واجب ہو یا تطوع اس میں اشتراک صحیح نہیں۔ نہ ذات میں نہ اجر میں۔ اگر وہ افراد نے اشتراک کیا تو دونوں کی ہدی جائز نہیں ہوئی۔ اھ دسوقی کہتے ہیں: پس ہدی کا معاملہ قربانی سے مختلف ہے کہ قربانی کے اجر میں اشتراک صحیح ہے الخ۔ پوری تفصیل اس میں دیکھی جائے۔

بحث سوم: یہ گائے ہدی کی تھی یا قربانی کی

روایات میں دونوں الفاظ وارد ہیں جن کی تفصیل اوجز میں ہے۔ حافظ فرماتے ہیں: بظاہر یہ دونوں کا تعارض ہے کیونکہ ابوہریرہؓ کی روایت میں تصریح ہے کہ یہ گائے ان ازواج کی جانب سے ذبح کی گئی جنہوں نے عمرہ کیا تھا۔ اس سے ان لوگوں کی روایت قوی ہو جاتی ہے جنہوں نے ہدی کا لفظ

روایت کیا ہے۔ اور اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ یہ ہدی تمتع کی تھی۔ اور اس میں امام مالکؒ کے اس قول
کے خلاف کوئی دلیل نہیں کہ اہل مکہ کے ذمہ قربانیاں نہیں۔ ان کے علاوہ اور بعض بحثیں ہیں جن کی تفصیل ابن حزمؒ نے
یہ امر بھی مختلف فیہ ہے کہ آنحضرت

حجۃ الوداع میں آپ نے بکری بھی ذبح کی یا نہیں؟

صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقعہ پر بکریاں
بھی ذبح کی تھیں یا نہیں؟ چنانچہ حضرت ابوبکرہؓ کی حدیث سے جو آگے آتی ہے بظاہر یہ بات معلوم ہوتا
ہے۔ شیخ ابن القیمؒ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایا پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "اگر کہا جائے تم اس
حدیث کا کیا کرو گے جو صحیحین میں حضرت ابوبکرہؓ سے مروی ہے اور جس میں یہ ہے کہ منیٰ میں آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کے خطبہ یوم النحر کا ذکر ہے اور اس کے آخر میں بروایت مسلم یہ لفظ ہیں: پھر آپ لوٹ کر آئے
دو سیاہ مینڈھوں کی طرف پس ان کو ذبح کیا۔ اور بکریوں کے ایک ریوڑ کی طرف پس اس کو
ہمارے درمیان تقسیم فرمایا" اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ مکہ کا ہے۔ اس کے برعکس حضرت
انسؓ کی حدیث سے جو صحیح بخاری کے متعدد مواضع میں مروی ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مدینہ کا واقعہ ہے۔
جواب یہ ہے کہ لوگوں نے اس سلسلہ میں دو طریق اختیار کئے ہیں۔ ایک یہ کہ اس موقعہ پر حضرت انسؓ کا
بیان صحیح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں دو مینڈھے ذبح کئے تھے۔ اور یہ کہ آپ عید
کی نماز سے فارغ ہو کر دو مینڈھوں کی طرف لوٹے۔ چنانچہ حضرت انسؓ نے مکہ میں اونٹ ذبح
کرنے اور مدینہ میں مینڈھے ذبح کرنے کے واقعہ کو ایک دوسرے سے الگ کر کے بیان کیا ہے۔ جس
سے واضح ہوتا ہے کہ یہ دو واقعے ہیں۔ اور اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ جتنے حضرات نے منیٰ میں آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کی قربانی کا ذکر کیا ہے انہوں نے صرف اونٹوں کا نحر ذکر کیا ہے۔ یہی ہدی آپ ساتھ
لے کر گئے تھے۔ اور ان کا نحر کرنا افضل تھا۔ بجائے اس کے کہ جو بکریاں آپ ساتھ نہیں لے گئے انہیں
ذبح کرتے۔ چنانچہ حضرت جابرؓ نے قصہ حجۃ الوداع میں ذکر کیا ہے کہ آپ رمی کر کے واپس ہوئے تو
اونٹوں کا نحر کیا۔ دراصل بعض راویوں کو اس میں اشتباہ ہو گیا۔ چونکہ مینڈھوں کے ذبح کرنے کا واقعہ
عید کے دن کا تھا۔ اس بنا پر انہوں نے خیال کر لیا کہ منیٰ کا واقعہ ہے۔ دوسرا طریقہ ابن حزمؒ اور
ان کے ہم مسلک لوگوں کا ہے کہ دونوں حدیثیں صحیح ہیں۔ اور دونوں عمل جداجدا ہیں۔ حضرت ابوبکرہؓ
نے مکہ کی قربانی کا ذکر کیا ہے۔ اور حضرت انسؓ نے مدینہ کی قربانی کا۔ — وہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے یوم النحر میں بکریوں کو ذبح کیا۔ اور گائے اور اونٹوں کا نحر کیا تھا۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دن اپنی بیویوں کی طرف سے گائے کی قربانی دی تھی۔ یہ صحیحین میں ہے اور صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم النحر میں حضرت عائشہ کی طرف سے ایک گائے ذبح کی تھی۔ اور سنن میں ہے کہ آپ نے آل محمد کی جانب سے ایک گائے نحر کی تھی۔ ابن حزم کا مذہب ہے کہ حاجی کے لئے ہدی کے ساتھ قربانی بھی مشروع ہے۔ اور صحیح، انشاء اللہ پہلا طریقہ ہے۔ اور حاجی کے لئے ہدی تعظیم کی قربانی کا حکم رکھتی ہے، کسی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل نہیں کیا نہ آپ کے صحابہ کرامؓ سے کہ انہوں نے ہدی اور قربانی کو جمع کیا ہو بلکہ ان کی ہدی ہی قربانی تھی۔ پس یہ منیٰ میں ہدی ہے اور دوسری جگہ میں قربانی۔ رہا حضرت عائشہؓ کا بیان کہ آپ نے اپنی بیویوں کی طرف سے گائے کی قربانی کی تھی تو اس میں ہدی پر قربانی کا اطلاق کیا گیا ہے" ابن قیم کا کلام ختم ہوا۔

میں کہتا ہوں کہ حضرت ابو بکرہؓ کی یہ حدیث امام بخاریؒ نے صحیح بخاری میں دو جگہ روایت کی ہے کہیں مختصر کہیں مطول۔ مگر اس کے کسی طریق میں مینڈھوں کے ذبح کرنے کا ذکر میں نے نہیں دیکھا۔ نووی شرح مسلم میں لکھتے ہیں: "قاضی کہتے ہیں کہ دار قطنی نے کہا ہے کہ راوی کا یہ قول "پھر آپ لوٹے الخ" یہ ابن عون کا وہم ہے اور اصل یہ جملہ ابن سیرین نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے، مگر ابن عون نے اسے ابن سیرین کی سند سے ابو بکرہ کی اس حدیث میں ذکر کر دیا۔ قاضی کہتے ہیں کہ امام بخاریؒ نے یہ حدیث ابن عون سے روایت کی ہے مگر اس میں یہ فقرہ ذکر نہیں کیا، غالباً انہوں نے اسے عمداً ترک کر دیا ہے۔ اور یہی حدیث مسلم شریف کی کتاب الدیات میں ایوب اور قرہ نے ابن سیرین سے روایت کی ہے انہوں نے بھی یہ زائد فقرہ نقل نہیں کیا۔ قاضی کہتے ہیں کہ بظاہر یہ زائد فقرہ خطبہ عید الاضحیٰ کے سلسلہ میں کسی اور حدیث کا تھا، مگر راوی کو وہم ہوا اور اس نے اس کو خطبہ حج میں ذکر کر دیا۔ یا یہ دو حدیثیں تھیں جو ایک دوسری میں ملا دی گئیں۔ امام مسلمؒ نے "الضحایا" میں حضرت انسؓ کی یہ حدیث بروایت ایوب و ہشام عن ابن سیرین روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کی نماز پڑھی، پھر خطبہ دیا، پس حکم دیا کہ جو لوگ نماز سے پہلے قربانی کر چکے ہیں۔ ان کی قربانی صحیح نہیں ہوئی اس لئے وہ دوبارہ قربانی کریں۔ اس حدیث کے آخر میں ہے "پھر آپ لوٹ کر گئے دو سیاہ و سفید مینڈھوں کی طرف الخ" پس یہی صحیح ہے اور اس سے اشکال رفع ہو جاتا ہے" انتہی۔

قوله: فلما اكمل نحره استدعى بالحلاق

ترجمہ: پس جب نحر کا عمل پورا کر لیا تو حلاق کو طلب فرمایا۔

کیا مسافر اور حاجی کے ذمہ قربانی واجب ہے؟

اور مسافر کی قربانی کا مسئلہ اختلافی ہے۔ چنانچہ لامع کے حاشیہ میں شیخ کہتے ہیں کہ کیا مسافر کے ذمہ بھی قربانی واجب ہے؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام شافعیؒ کا قول ہے کہ یہ سب لوگوں کے لئے سنت ہے۔ منیٰ میں حاجی پر بھی۔ اور امام مالکؒ کا قول ہے کہ اس کے ذمہ قربانی نہیں۔ اور سوائے منیٰ میں حج کرنے والے کے کسی کو اس کے ترک کرنے کا حکم نہیں کیا جائے گا۔ اور امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ مسافر پر قربانی واجب نہیں۔ انتہیٰ۔ موفقؒ کتاب المغنی میں کہتے ہیں کہ جب یوم النحر میں جمرہ عقبہ کی رمی سے فارغ ہو تو خطبہ نہیں، بلکہ وہ اپنی جگہ لوٹ آجائے۔ اب سب سے پہلے جو کام اسے کرنا ہے وہ ہدی کا نحر ہے۔ اگر اس کے ساتھ ہدی ہو خواہ واجب ہو یا نفل ہو۔ پس اگر ہدی ساتھ نہ ہو اور اس کے ذمہ ہدی واجب ہو تو خرید لے۔ اور اگر اس کے ذمہ واجب نہیں تو بہتر ہے کہ قربانی کا جانور خرید کر قربانی کرے۔

اونٹ اور گائے میں صحابہ کا اشتراک

اور صحابہؓ نے گائے اور اونٹوں میں شرکت کی۔ صحیح مسلم میں حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کیا پس ہم نے اونٹ کو سات آدمیوں کی جانب سے نحر کیا اور گائے بھی سات کی جانب سے ذبح کی۔ امام مسلمؒ نے اس مضمون کی متعدد روایتیں نقل کی ہیں۔

حلاق کے نام میں اختلاف

پس جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نحر کا عمل پورا کر دیا تو حلاق کو طلب فرمایا۔ شیخ ابن قیمؒ کی تصریح کے مطابق یہ معمر بن عبد اللہ بن نضلہ بن عوف تھے۔ اور بذل میں ہے کہ نوویؒ کہتے ہیں کہ حلاق کے نام میں اختلاف ہے پس صحیح اور مشہور یہ ہے کہ ان کا نام معمر بن عبد اللہ عدوی ہے۔ اور بخاری میں ہے کہ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ معمر بن عبد اللہ تھے۔ اور کہا گیا ہے کہ ان کا نام خراش بن امیہ بن ربیعہ الکلبی ہے۔ انتہیٰ۔ اور زرقانی نے شرح مواہب میں ان دونوں ناموں پر مفصل کلام کیا ہے۔ اور دونوں کے بارے میں روایات نقل کی ہیں۔ اور پہلا نام معمر بن عبد اللہ بن نضلہ ذکر کیا ہے۔ یعنی حنظلہ کے بجائے نضلہ۔ اور حافظؒ نے بھی فتح میں نضلہ ذکر کیا ہے۔ پس بذل المجہود میں حنظلہ کا لفظ تصحیف ہے اور زرقانی نے اس کو فتح نون اور سکون

فحلق رأسه و قسم شعره۔

ترجمہ: پس آپ نے آپ کا سر کا حلق کیا۔ اور اپنے کٹے مبارک تقسیم فرما دیئے۔

حماد کے ساتھ ضبط کیا ہے، اور لکھا ہے کہ یہ بڑی عمر کے صحابی تھے اور مہاجرین حبشہ میں شامل تھے۔ اور کہا گیا ہے ابن السکن کا بیان ہے کہ خراش بن امیہ صرف ایک حدیث کے راوی ہیں، اور وہ یہ کہ میں نے عمرۃ القضاء میں مروہ کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلق کیا تھا۔ ابن الکلبی کہتے ہیں کہ انہوں نے عمرۃ القضاء میں حلق کیا تھا یا عمرہ حدیبیہ میں۔ اھ اور حافظ فرماتے ہیں: حلاق کے نام میں اختلاف ہے صحیح یہ ہے کہ وہ معمر بن عبد اللہ تھے، جیسا کہ بخاری نے ذکر کیا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ خراش بن امیہ تھے۔ مگر صحیح یہ ہے کہ خراش نے عمرۂ حدیبیہ میں حلق کیا تھا۔ اھ اور ابن ہشام نے عمرۂ حدیبیہ کے بارے میں ابن اسحاق کا یہ قول نقل کیا ہے کہ میری اطلاع کے مطابق آپ کا حلق خراش بن امیہ بن الفضل الخزاعی نے کیا تھا۔ اھ ـــــــــ جس شخص نے آپ کے سر کا حلق کیا، اور ناخن تراشے اور لبوں کو تراشا، ان کے بال لئے۔ جیسا کہ طبقات ابن سعد میں ہے۔

موئے مبارک کی تقسیم: اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے موئے مبارک تقسیم فرما دیئے۔ جیسا کہ روایات میں معروف ہے اور طبقات میں ہے کہ آپ نے اپنے موئے مبارک اور ناخنوں کو دفن کرنے کا حکم فرمایا۔ اھ ممکن ہے پہلے آپ نے دفن کرنے کا حکم فرمایا ہو پھر جب صحابہؓ کا شدید اشتیاق دیکھا کہ وہ موئے مبارک حاصل کرنا چاہتے ہیں تو تقسیم کرنے کا حکم فرمایا۔ چنانچہ طبقات ہی میں ہے کہ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ حلاق آپ کا حلق کر رہا ہے اور آپ کے صحابہؓ آپ کے گرد جمع ہیں وہ چاہتے ہیں کہ جو بال بھی گرے کسی آدمی کے ہاتھ ہی میں گرے۔ الخ اور اگر تطبیق کے لئے یہ توجیہ نہ کی جائے تو صحیح بخاری کا بیان زیادہ صحیح ہے۔ رہی یہ بات کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اختلاف روایات کے مطابق ابو طلحہ کو دائیں یا بائیں جانب کے موئے مبارک عطا فرمائے۔ رہی یہ بات کہ اس امر میں روایات بہت ہی مختلف ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کونسی جانب ابو طلحہ کو مرحمت فرمائی اور کونسی جانب لوگوں میں تقسیم فرمائی۔ دوسری صورت اول خود ابو طلحہ کو عطا فرمائے یا ان کی اہلیہ ام سلیم کو؟ اس سلسلہ میں صحیحین وغیرہ کی روایات مختلف ہیں جیسا کہ شیخ ابن قیم صاحب البدایہ والنہایہ اور زرقانی نے شرح مواہب میں تفصیل سے ذکر کی ہیں۔

سرہٗ نے بذل میں شیخ ابن قیم کے کلام کا خلاصہ ذکر کیا ہے اور میں نے تلخیص بذل میں خلاصہ کا خلاصہ دیا ہے
جو بہت ہی مختصر ہے اور وہ اس مختصر کے مناسب ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: اس کا قول "و دابوطلحہ کو دیئے"
اور مسلم کی روایت میں ہے کہ ام سلیم کو دیئے۔ پس احتمال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ام سلیم کو دیئے
ہوں کہ وہ اپنے شوہر ابوطلحہ کو دے دیں۔ غالباً ابوطلحہ اس وقت وہاں موجود نہ ہوں گے۔ بلکہ موئے مبارک
کی تقسیم میں مشغول ہوں گے۔ شیخ قدس سرہٗ کا رجحان اسی طرف ہے اور یہ احتمال بھی ہے کہ آپ نے ابوطلحہ
کو دیئے ہوں تاکہ وہ ام سلیم کے سپرد کر دیں کہ ان کے پاس محفوظ رہیں۔ الخ ۔ باہمی کا اختلاف تو شیخ
ابن قیم نے اس کو مفصل لکھا ہے۔ ان کے بیان کا حاصل یہ ہے کہ قدس کا رجحان اس طرف ہے کہ ابوطلحہ
کو دائیں جانب عطا فرمائی۔ اور مقدس نے اس کو ابن عون کی روایت سے ترجیح دی ہے جو صحیح بخاری
میں ان الفاظ سے مروی ہے: ابوطلحہ پہلے شخص تھے جنہوں نے آپ کے موئے مبارک حاصل کئے۔ اور
حافظ ابن قیم کا رجحان یہ ہے کہ ابوطلحہ کو خود ان کی ذات کے لئے بائیں جانب عطا فرمائی تھی۔ اور وہ بخاری
کی روایت کی توجیہ اس طرح کرتے ہیں کہ ابوطلحہ کو دائیں جانب میں سے بھی حصہ ملا تھا۔ اور بائیں جانب
تو تمام ان ہی کے لئے مخصوص تھی۔ ابن قیم نے اپنے قول کی تائید میں متعدد روایات ذکر کی ہیں جن میں تصریح
ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دائیں جانب تقسیم فرمائی تھی۔ اور بائیں جانب ابوطلحہ کو ان کی ذات
کے لئے عنایت فرمائی تھی۔ اسی بنا پر ابن قیم کے نزدیک ابوداؤد کی روایت راجح ہے، جس میں حضرت
انس سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حلاق کو بلایا، اس نے آپ کے سر کی دائیں جانب
کے بال اتارے۔ پس آپ اردگرد لوگوں کے درمیان ایک ایک دو دو بال تقسیم فرمانے لگے۔ الخ اسی طرح
شیخ قدس سرہٗ نے بذل میں اس روایت کو اصل قرار دیا ہے۔ اور مسلم شریف کی وہ روایت جس کے الفاظ
یہ ہیں: آپ نے دائیں جانب حلاق کی طرف کی۔ اس نے دائیں جانب حلق کیا۔ آپ نے ابوطلحہ
کو بلا کر یہ بال ان کو دے دیئے۔ پھر حلاق کی طرف بائیں جانب کی اور اسے بال اتارنے کا حکم
فرمایا۔ اس نے بائیں جانب کے بال اتارے، وہ آپ نے ابوطلحہ کو دے کر فرمایا یہ لوگوں میں تقسیم
کر دو۔ شیخ نے اس کی یہ توجیہ فرمائی ہے کہ اس روایت میں تقدیم و تاخیر ہوئی ہے۔ یا یہ کہا
جائے کہ "اس کو تقسیم کر دو" میں ضمیر قریب کی طرف نہیں بلکہ بعید کی طرف راجع ہے۔ یعنی جو بال
پہلے اتارے گئے تھے ان کو تقسیم کرنے کا حکم فرمایا۔ ایسی غور کر لو۔ تلخیص بذل کا مضمون ختم ہوا۔

اور حافظؒ روایات کا کچھ اختلاف ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: "اور ان روایات میں تعارض نہیں، بلکہ ان میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ آپ نے دونوں جانب کے بال ابو طلحہؓ کو دیئے، دائیں جانب کے تو ابو طلحہؓ نے آپ کے حکم سے تقسیم کردیئے اور بائیں جانب کے انہوں نے آپ کے حکم سے اپنی بیوی ام سُلیمؓ کو دے دیئے۔ اور امام احمدؒ کی روایت میں یہ اضافہ ہے تاکہ وہ ان کو اپنی خوشبو میں شامل کیا کریں" اھ۔

آپ کے پسینہ مبارک کی خوشبو

میں کتابیں ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ام سلیم کو خوشبو میں موئے مبارک ڈالنے کا جو حکم فرمایا تھا اس کی وجہ وہ روایت ہے جو جمع الوسائل میں صحیح مسلم سے نقل کی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ ام سُلیمؓ کے ہاں آرام فرمارہے تھے، آپ کو پسینہ آیا، ام سُلیمؓ آپ کا پسینہ صاف کرکے شیشی میں جمع کرنے لگیں، آپ بیدار ہوئے تو دریافت فرمایا کہ یہ کیا کرتی ہو؟ ام سُلیمؓ نے عرض کیا کہ یہ آپ کا پسینہ مبارک ہے، ہم اس کو اپنی خوشبو میں ڈالیں گے۔ اور یہ سب سے عمدہ خوشبو ہے۔ اور جب آپ کے پسینہ کا یہ حال ہے تو آپ کے موئے مبارک کی عطر بیزی کا کیا پوچھنا!

موئے مبارک کی تقسیم کی حکمت اور ابو طلحہؓ کی تخصیص کی وجہ

اور زرقانیؒ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے موئے مبارک صحابہ کرامؓ کے درمیان اس لئے تقسیم فرمائے تاکہ ان کے لئے دائمی برکت کا باعث اور سامان تسلی ہو۔ گویا اس سے قرب اجل کی طرف اشارہ کرنا مقصود تھا۔ اور ابو طلحہؓ کو موئے مبارک کی تقسیم پر مامور فرمانے میں اسی مضمون کی طرف اشارہ تھا، کیونکہ ابو طلحہؓ ہی نے آپ کی قبر مبارک تیار کی اور بنائی، اور اس میں کچی اینٹوں کی چنائی کی۔ اور اس واقعہ سے معلوم ہوتا کہ امام کبیر بعض حضرات کو عطیات اور ہدیہ وغیرہ کی تقسیم پر مامور کرسکتا ہے۔ اور شیخ قدس سرہٗ کوکب میں فرماتے ہیں: "آپ نے موئے مبارک ابو طلحہؓ کو، جو ام سُلیمؓ والدہ انسؓ کے شوہر تھے، عطا فرمائے، اس سے ان حضرات کی فضیلت معلوم ہوتی ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا کہ اکابر کے بالوں کے ساتھ اور اسی طرح لباس وغیرہ کے ساتھ تبرک حاصل کرنا جائز ہے۔ اور یہاں سے یہ نکتہ بھی مستنبط کیا جاسکتا ہے کہ تقسیم کے معاملہ میں افاضل کی تقدیم ضروری نہیں، چنانچہ

وقسم اظفارہ

ترجمہ: اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ناخن تقسیم فرمائے۔

اس موقع پر حضرت ابوبکر، عمر اور دیگر اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم موجود تھے۔ مگر جس قدر موئے مبارک ابوطلحہ کو عطا فرمائے کسی دوسرے کو عطا نہیں فرمائے۔ البتہ اگر اس سے ان کی کبیدگی کا اندیشہ ہو تو ایسا کرنا مناسب نہیں ۱۲ اھ

حلق نسک ہے یا فقط ممنوع اشیاء کو مباح کرنے کا ذریعہ

پھر حلق نسک و عبادت ہے یا فقط ممنوع اشیاء کو مباح کرنے کے لئے ہے؟ یہ ایک مشہور اختلافی مسئلہ ہے جس کی تفصیل اوجز میں ہے۔ جمہور علماء پہلی رائے پر ہیں۔ اور امام بخاریؒ نے صحیح بخاری میں ایک باب کا عنوان قائم کیا ہے "باب الحلق والتقصیر عند الاحلال" حافظ فرماتے ہیں کہ امام بخاریؒ اس ترجمۃ الباب سے بتانا چاہتے ہیں کہ حلق عبادت ہے۔ کیونکہ انہوں نے حلال ہونے کے وقت "حلق وتقصیر" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یعنی حلق خود تحلل نہیں بلکہ حلال ہونے کے وقت کیا جاتا ہے۔ گویا انہوں نے اس مطلب پر اس طرح استدلال کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حلق کرانے والوں کے لئے دعا فرمائی۔ اور دعا ثواب کے کام پر ہوتی ہے۔ اور ثواب عبادت پر ہی ہوتا ہے۔ نہ کہ مباحات پر۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حلق کو قصر سے افضل قرار دینا بھی اسی طرف مشعر ہے کیونکہ مباحات میں باہمی تفاضل نہیں ہوتا ہے۔ اور جمہور حلق کے عبادت ہونے کے قائل ہیں۔ اور حنابلہ کے نزدیک بھی یہی صحیح ہے۔ اور نوویؒ شرح مہذب میں فرماتے ہیں کہ ابن منذر وغیرہ کے کلام سے یہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ حلق کے عبادت نہ ہونے کے صرف امام شافعیؒ قائل ہیں۔ اور امام احمد سے بھی ایک روایت ہے۔ اور امام ابو یوسف سے بھی نقل کیا گیا ہے۔ موفق کہتے ہیں امام احمد سے ایک روایت یہ ہے کہ یہ بال کاٹنا احرام کی ممانعت سے جو چیزیں ممنوع اور حرام تھیں ان کو مباح کرنا ہے جیسا کہ خوشبو وغیرہ۔ مختصراً

آپ کے ناخن کی تقسیم

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ناخن تقسیم فرمائے۔ اوجز المسالک میں مسند امام احمد کی روایت سے نقل کیا ہے کہ آپ نے اپنے سر کی بائیں جانب کے موئے مبارک ابوطلحہ کو دیئے۔ پھر ناخن ترشوائے اور ان کو لوگوں میں تقسیم فرمایا۔ اور ابن سعد کی روایت میں محمد بن زید سے مروی ہے کہ ان کے والد نے ان سے بیان کیا کہ وہ قربانی کے ایک آدمی کے ساتھ قربانگاہ

وقلت: ثم لبس ثيابه وتطيب (قال) ثم افاض الى مكة قبل الظهر راكبا (وقلت) على راحلته

ترجمہ: (رش) پھر آپ نے اپنے کپڑے پہنے اور خوشبو لگائی (رق) پھر آپ مکہ کی جانب روانہ ہوئے ظہر سے پہلے سوار ہو کر (رش) اپنی اونٹنی پر۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور آپ قربانی کے جانور تقسیم فرما رہے تھے، مگر ان کو کچھ نہ ملا۔ ان کے رفیق کو پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کپڑے میں سر کا حلق کرایا۔ پس وہ آپ کی خدمت آئے اور ان میں سے کچھ بال جھپا فوراً تقسیم فرمائے اور آپ نے اپنے ناخن اتارے پس وہ ان کے رفیق کو عطا فرمائے۔ انتہی۔

(رق) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حلق کرانے والوں کے لئے تین بار اور قصر کرنے والوں کے لئے ایک مرتبہ دعا فرمائی۔ اسے شیخ ابن قیمؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سعی پوری کرنے کے بعد مروہ کے پاس یہ دعا فرمانا پہلے گذر چکا ہے۔ اور اسی جگہ یہ بحث بھی گذر چکی ہے۔ کہ یہ قصہ حدیبیہ کا ہے یا حجۃ الوداع کا؟ اور بر تقدیر دوم مروہ کے پاس کا ہے یا منیٰ کا؟ اور یہ کہ محققین کے نزدیک راجح یہ ہے کہ یہ دعا دونوں موقعوں پر فرمائی۔ لیکن حجۃ الوداع میں مروہ کے پاس فرمائی یا منیٰ میں؟ تو ابن [illegible] کے نزدیک مروہ کے پاس ہونا اقرب ہے کیونکہ وہاں حلق کرا کر حلال ہونے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کا کمال اتباع تھا۔ لیکن منیٰ میں حلق کرانے والوں کی کوئی تخصیص نہ تھی کہ ان کے لئے تین بار دعا فرماتے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: لتدخلن المسجد الحرام ان شاء اللہ آمنین محلقين رؤسكم ومقصرين لا تخافون۔ پس ممکن ہے کہ تقصیر میں بھی ارشاد خداوندی: ومقصرین کی پیروی کی تھی۔

طواف افاضہ کیلئے تشریف لیجانا: (رش) پھر آپ نے اپنے کپڑے پہنے اور خوشبو لگائی۔ اس سلسلہ کی روایات صاحب البدایۃ والنہایۃ نے تفصیل سے ذکر کی ہیں۔ (رق) پھر آپ اسی دن بروز ہفتہ مکہ کی جانب روانہ ہوئے۔ اور اس پر گفتگو آگے آتی ہے کہ کیا آپ نے رات کے قریب تک طواف موخر کیا؟ ظہر سے پہلے اور اس پر گفتگو آگے آتی ہے کہ آپ نے ظہر مکہ میں پڑھی یا منیٰ میں؟ سوار ہو کر (رش) اپنی اونٹنی پر جیسا کہ البدایہ والنہایہ

ہیں متعدد روایات میں اس کی تصریح موجود ہے۔ اور ابوداؤد نے اپنی سند سے حضرت غرفہ بن حارث کندیؓ
سے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں حجۃ الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر تھا۔
آپ نے فرمایا کہ میرے پاس ابوالحسن (حضرت علیؓ) کو بلاؤ۔ بعد ازاں پوری حدیث ذکر کی جس میں آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علیؓ دونوں کا مل کر اونٹوں کا نحر کرنا مذکور ہے۔ اور اس کے آخر میں ہے۔
"پس جب فارغ ہوئے تو اپنی خچر پر سوار ہوئے اور حضرت علیؓ کو اپنے پیچھے سوار کیا"۔ صاحب البدایۃ والنہایہ
اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں "ابوداؤد اس کے ساتھ متفرد ہیں اور اس کی سند اور متن میں
غرابت ہے"۔ ابوداؤد کی اس حدیث پر یہ اشکال ہے کہ صحیح مسلم میں (ابوداؤد کی کتاب الحج) "باب فضیلۃ السقایۃ"
میں بکر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے ابن عباسؓ سے کہا کہ کیا قصہ ہے کہ اس گھرانے کے
لوگ نبیذ پلاتے ہیں! اس کا سبب بخل ہے یا احتیاج؟ ابن عباسؓ نے جواب دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ
وسلم اپنی اونٹنی پر ہمارے پاس تشریف لائے۔ آپ کے پیچھے اسامہ بن زیدؓ سوار تھے الخ۔ اس حدیث سے
اسامہ بن زیدؓ کا آپ کے پیچھے سوار ہونا ثابت ہے اس کی توجیہ یہ ہے کہ اسامہ کا پیچھے سوار ہونا فتح مکہ میں
تھا۔ چنانچہ صحیح بخاری کی روایت میں حضرت ابن عمرؓ سے اس کی تصریح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
فتح مکہ کے دن اعلیٰ مکہ سے اپنی اونٹنی پر تشریف لائے۔ اور اسامہ بن زید کو اپنے ساتھ سوار کیا تھا تو
یا یہ کہا جائے کہ ابوداؤد کی روایت میں غرابت ہے جیسا کہ صاحب البدایۃ والنہایہ نے کہا ہے۔

جن حضرات کو آپ کے ساتھ سوار ہونے کا شرف حاصل ہوا ان کے ناموں کی فہرست

صاحب نسیم الریاض نے شرح شفا میں ان حضرات کے ناموں کی فہرست ذکر کی ہے جنہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سوار ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اور
وہ یہ ہیں: اسامہ بن زیدؓ عرفہ سے واپسی میں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ سفر ہجرت میں۔ عثمانؓ، علیؓ حجۃ الوداع میں۔
عبداللہ بن جعفرؓ آپ کے نواسے جو ہاشم کے دو لڑکوں کے ساتھ[1]۔ حضرت عباسؓ کے تینوں صاحبزادے
قثمؓ، حسینؓ۔ معاویہؓ۔ معاذ بن جبلؓ۔ ابوذرؓ۔ زید بن حارثہؓ۔ ثابت بن ضحاکؓ۔ شرید بن سویدؓ۔ سلمہ بن اکوعؓ۔
زبیر بن سہیلؓ۔ ابوطلحہؓ۔ سہیل بن بیضاءؓ۔ آپ کے نواسے علی بن زینبؓ۔ عبداللہ بن زبیرؓ۔ عبدالمطلب کا ایک
لڑکا۔ اسامہ بن عمیرؓ۔ صفیہ بنت حییؓ۔ ابوالدرداءؓ۔ آمنہ بنت ابی الصلتؓ۔ ابوایاسؓ۔ ابوہریرہؓ۔ قیس بن سعدؓ

---

[1] کذا فی الاصل۔ وصحتہ مع غلامین من بنی ہاشم۔ مترجم۔

فطاف طواف الافاضة رملت راكباً۔

ترجمہ: پس طواف افاضہ کیا راکباً (سوار ہوکر)۔

حضرات ابن حبیب، جبریل علیہ السلام براق پر شب اسراء میں، ام حبیبہ بنت ..... ، زید بن ..... ، جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم، اور بعض متعدد نے بعض دیگر حضرات کا بھی اضافہ کیا ہے۔ انتہی مختصراً۔

طواف افاضہ

پس طواف افاضہ کیا۔ اس کو طواف زیارت اور طواف صدر بھی کہتے ہیں۔ کذا فی البدائع۔ اور مختصر خلیل میں ہے کہ مکروہ ہے یہ کہ کہا جائے طواف زیارت یا کہا جائے کہ زیارت کی ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کی۔ اور وجہ یہ لکھتے ہیں کہ کیونکہ زیارت کے لفظ سے استغنا مفہوم ہوتا ہے اور مقابلہ یہ کسی گذشتہ زمانے میں ہوگا۔ مگر آج کل یہ لفظ تعظیم کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اھ

راکباً (سواری پر) سواری پر طواف کرنے کی بحث طواف قدوم میں گذر چکی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ناقہ مسجد میں بول و براز سے محفوظ رہی

اور اسعاف ملا شہ میں حاجیوں کے شیخ المشائخ شاہ عبدالعزیز دہلوی قدس سرہ نے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: حج الوداع میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹنی پر سوار ہوکر طواف فرمایا تھا۔ جس سے مقصود تعلیم افعال طواف تھی اور لوگوں کے سوال کا جواب دینا اور اس حالت میں آپ کی اونٹنی نے نہ جگالی کی نہ مینگنیاں کیں۔ اور نہ پیشاب کیا۔ پس حرمت مسجد بھی محفوظ رہی اور مقصود تعلیم بھی حاصل ہوگیا۔ اھ اور حافظ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سواری پر طواف کرنا اس ضرورت کی بنا پر تھا کہ لوگ آپ سے مناسک سیکھ سکیں۔ اسی بنا پر بعض حضرات نے آپ کے خصائص کو جمع کیا ہے انہوں نے اس کو منجملہ خصوصیات ہونے کے شمار کیا ہے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس وقت آپ کی اونٹنی بطور آپ کی کرامت کے بول و براز سے محفوظ رہی ہو۔ اس لئے دوسرے مویشیوں کو اس پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ کی ناقہ سدھائی ہوئی تھی اس لئے اس کے چلنے کے دوران تلویث کا خطرہ نہیں تھا۔ مگر یہی حال ام سلمہ کے اونٹ کا بھی ہو۔" اھ

رق) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے علاوہ کوئی طواف نہیں کیا۔ اور اس طواف کے ساتھ سعی نہیں کی۔ یہ شیخ ابن قیم کے نزدیک یہی مذہب صحیح ہے۔ اور اس امر کی تین جماعتوں نے مخالفت کی ہے۔ اول تو وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ آپ نے دو طواف کئے، طواف قدوم اور طواف زیارت۔ دوم وہ جماعت

جو کہتی ہے کہ آپ نے اس طواف کے ساتھ سعی بھی کی کیونکہ آپ قارن تھے۔ سوم وہ جماعت جن کا خیال ہے کہ آپ نے اس دن طواف نہیں کیا بلکہ طواف کو رات تک مؤخر کیا۔ شیخ ابن قیم ان کے دلائل ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں: اور اس شخص کو وہم ہوا جس نے یہ کہا کہ آپ نے دو مرتبہ طواف افاضہ کیا، ایک بار دن میں اور ایک بار رات میں ازواج کے ساتھ۔ اس پر گفتگو عنقریب آتی ہے کیونکہ اس کا منشا بخاری کی روایت ہے۔

کیا آپ نے طواف افاضہ کے بعد سعی کی تھی؟

اور حنفیہ کا مسلک ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف کے بعد سعی نہیں کی تھی۔ کیونکہ ان کا مسلک یہ ہے کہ قارن کے ذمہ دو طواف اور دو سعی ہیں۔ اس کی تفصیل اول رسالہ میں گزر چکی ہے جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کی کیفیت میں احرام کا بیان آیا تھا۔ اور اکثر علماء کا قول ہے کہ قارن کے ذمہ صرف ایک طواف اور ایک سعی ہے۔ شیخ ابن قیم کا کلام اسی پر مبنی ہے۔ اور وہ اس کے خلاف کو وہم کہتے ہیں۔

ابن الہمامؒ نے فتح القدیر میں بحوالہ مسند احمد ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اونٹنی پر طواف کیا، آپ اپنی چھڑی سے حجر اسود کا استلام فرماتے تھے، طواف سے فارغ ہو چکے تو زمزم پر گئے، آپ کے لئے ... جو پانی کھینچ رہے تھے۔ آپ نے فرمایا مجھے دو۔ ڈول آپ کو دیا گیا، آپ نے نوش فرمایا، پھر نکلے پس صفا و مروہ کا طواف کیا۔ پس یہ حدیث اس باب میں صریح ہے کہ آپ نے طواف افاضہ کے بعد سعی کی کیونکہ طواف قدوم پیدل تھا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

کیا آپ نے طواف افاضہ رات تک مؤخر کیا تھا

ترمذیؒ اور ابوداؤد اور نسائی میں جو حدیث بروایت ابوالزبیر حضرت عائشہؓ اور حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم نحر کا طواف رات تک مؤخر کیا۔ یہ حدیث معلول ہے۔ اس کے علل کو ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں: "غالباً راوی سے طواف کے نام میں غلطی ہوئی ہے کیونکہ رات تک تاخیر کا قصہ طواف وداع کا ہے" بعد ازاں اس پر مفصل کلام کیا ہے۔ اور یہ جو حدیث عائشہ و جابرؓ کا لفظ آیا ہے یہ کاتب کی غلطی ہے۔ وہ ترمذی اور ابوداؤد میں ابوالزبیر کی حدیث حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے اور خود حافظ ابن قیم نے بھی حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے ابوالزبیر کے سماع پر بحث کی ہے۔ اور بحث میں حضرت جابرؓ کا ذکر نہیں آتا۔ اسی طرح امام بخاری نے صحیح میں تعلیقاً یوں ذکر کیا ہے: "ابوالزبیر نے عائشہؓ اور ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ آنحضرتؐ نے طواف زیارة

کو رات تک مؤخر کیا" اور علماء نے ابو الزبیر کی اس حدیث میں اختلاف کیا ہے اور حافظ ابن قیمؒ نے اسے ضعیف قرار دینے پر مفصل کلام کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: "یہ حدیث واضح طور پر غلط ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل معروف کے خلاف ہے جس میں آپ کے حج سے واقفیت رکھنے والوں کو ذرا بھی شک نہیں" اور امام ترمذی کا قول ہے جو ان کی کتاب العلل میں ہے، نقل کیا ہے کہ انہوں نے امام ترمذیؒ نے امام بخاریؒ سے دریافت کیا کہ ابو الزبیر کا سماع حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے ثابت ہے؟ امام بخاریؒ نے جواب دیا کہ ابن عباس سے تو ثابت ہے اور حضرت عائشہؓ سے ان کا سماع محل نظر ہے، اور ابن قطان کہتے ہیں کہ میرے نزدیک یہ حدیث صحیح نہیں ہے، یہی تفصیل ترمذیؒ کی کتاب العلل میں ہے۔ در حقیقت آخر میں شیخ ابن قیمؒ کہتے ہیں کہ دراصل غلطی طواف کے نام میں واقع ہوئی ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف وداع کو آخر شب تک مؤخر کیا تھا، جیسا کہ صحیحین میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے۔ پھر یہاں حضرت عائشہؓ کی طویل حدیث جس میں ان کے اپنے بھائی کے ساتھ عمرہ تنعیم کا ذکر ہے نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں: "بغیر کسی شک و شبہ کے ٹھیک طور پر یہی طواف ہے جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر شب تک مؤخر کیا تھا۔ پس ابو الزبیر نے یا ان سے روایت کنندہ نے غلطی سے یہ طواف وداع کے طواف زیارۃ کا لفظ ذکر کر دیا" انتہی مختصراً۔

اور صاحب البدایہ والنہایہ ان روایات کے طرق کو ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں: "اگر اس کی تاویل یہ کی جائے کہ آپ نے طواف زیارت کو بعد زوال تک مؤخر کیا، گویا رات سے مراد شام ہے تو یہ روایت صحیح ہے اور اگر رات سے مراد بعد غروب لیا جائے تو یہ بہت ہی بعید اور روایات صحیحہ کے مخالف ہے۔ اور جس طواف کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رات کو گئے تھے وہ طواف وداع ہے، بعض راوی اس کو بھی طواف زیارت سے تعبیر کر دیتے ہیں۔ یا اس سے مراد زیارت محضہ کا طواف ہے، جو طواف وداع سے قبل اور طواف صدر یعنی طواف فرض کے بعد ہو گا کیونکہ روایات میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ کی راتوں میں ہر رات زیارت بیت اللہ کے لئے آتے تھے۔ مگر یہ تاویل بھی بعید ہے" انتہی مختصراً۔

اور شیخ بذل میں فرماتے ہیں: "اس کی یہ تاویل ممکن ہے کہ حدیث کا اصل لفظ وہ تھا جو امام بخاری نے تعلیقاً ذکر کیا ہے یعنی "آپ نے مؤخر کیا زیارت کو رات تک" اور زیارت سے

اور طواف زیارۃ نہیں بلکہ زیارت بیت اللہ تھی۔ مگر کسی راوی نے اس سے یہ سمجھ کر کہ مراد طواف زیارت ہے۔ اس کو یوں روایت کر دیا کہ "مؤخر کیا طواف یوم النحر کو رات تک"۔ اور امام بخاریؒ نے بصیغہ "مریض" ذکر کیا ہے کہ "اور ذکر کیا جاتا ہے بواسطہ ابو حسان کے ابن عباسؓ سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ کے ایام میں بیت اللہ کی زیارت کیا کرتے تھے"۔ گویا امام بخاریؒ حدیث ابو الزبیر میں ذکر شدہ لفظ زیارت کو طواف زیارت پر نہیں بلکہ زیارت بیت اللہ پر محمول کرتے ہیں"۔ اھ اور دوسرے حاشیہ بذل میں ہے کہ "ابن حجرؒ نے شرح منہاج میں یہ تاویل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج مطہرات کا طواف مؤخر کیا، اور خود بھی ان کے ساتھ تشریف لے گئے"۔ اھ اور ملا علی قاریؒ نے ابن حجرؒ کی مذکورہ بالا توجیہ کو نوویؒ سے نقل کر کے لکھا ہے کہ "اس تاویل پر کوئی دلالت نہیں، نہ لفظاً نہ سیاقاً، نہ حقیقۃً نہ مجازاً۔ مزید آں یہ کہ اس کلام کے بین السطور یہ عجیب و غریب بات بھی پائی جاتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طواف زیارت کے لئے دوسری بار آئے، پس سب سے بہتر یہ توجیہ ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے رات تک تاخیر زیارت کو مطلقاً جائز رکھا ہے یا اپنی ازواج مطہرات کو رات تک طواف مؤخر کرنے کا حکم فرمایا۔ اور ابن حجرؒ کا یہ کہنا کہ "خود آپ بھی ان کے ساتھ تشریف لے گئے" صحیح نہیں، کیونکہ ازواج مطہرات کی معیت میں آپ کا دوبارہ جانا ثابت نہیں"۔ اھ لیکن شیخ ابن ہمام کا رجحان یہی ہے جیسا کہ ابھی آتا ہے، اور امام سرخسیؒ نے مبسوط میں اس زیارت کو نفل طواف پر محمول کیا ہے۔

اور شیخ قدس سرہ کوکب میں فرماتے ہیں: "قولہ: اخر طواف الزیارۃ الخ اگر اس سے مراد یہ ہے کہ خود آپ نے رات کے وقت طواف کیا تو مسلم نہیں، کیونکہ اہل علم متفق ہیں کہ آپ نے ظہر سے قبل طواف کیا تھا، اور اگر یہ مراد ہے کہ دوسروں کے لئے اس کے وقت کو رات تک مؤخر فرمایا یعنی رات تک طواف کو جائز قرار دیا، تو ظاہر ہے کہ طواف زیارت کو بارہ تاریخ تک مؤخر کرنا ہمارے نزدیک بلا کراہت اور بغیر وجوب دم کے جائز ہے۔ اور امام شافعیؒ کے نزدیک ۱۳ تاریخ تک۔ پس اس رات تک تاخیر کے کوئی معنی نہ ہوئے۔ اس لئے حدیث کا صحیح مطلب یہ ہے کہ طواف زیارت کے وقت مستحب کو رات تک مؤخر کیا۔ اس کے بعد وقت مستحب باقی نہیں رہتا"۔ اھ اور اس کے

(قال) ثم اتی زمزم

ترجمہ: (ق) پھر زمزم پر آئے۔

حاشیہ میں ذخیرہ تاریخ سے نقل کیا ہے کہ یوم نحر میں طواف کرنا افضل ہے۔ اور نحر باقی کے تین دنوں میں سے کسی دن کر لینا واجب ہے پس اگر ایام نحر اور ان راتوں سے مؤخر کر دیا تو مکروہ تحریمی ہے اور ترک واجب کی وجہ سے دم لازم ہوگا: انتہیٰ مختصرا۔

گذشتہ بالا بحث سے سات جواب نکل آئے۔ اوّل یہ کہ حدیث صحیح نہیں بلکہ معلول ہے یہ ابن قطان نے ذکر کیا ہے۔ دوم یہ کہ راوی سے طواف کے نام میں غلطی ہوئی۔ طواف وداع کے بجائے طواف زیارت کہہ دیا۔ یہ حافظ ابن قیمؒ نے ذکر کیا ہے۔ سوم یہ کہ رات سے مراد مابعد غروب نہیں بلکہ مابعد زوال ہے۔ چہارم یہ کہ بعض راوی طواف وداع کو طواف زیارت سے تعبیر کر دیتے ہیں گویا طواف زیارت طواف وداع کا غیر معروف نام ہے۔ پنجم یہ کہ اس سے طواف زیارت مراد نہیں بلکہ طواف محض اور طواف نفل مراد ہے یہ تینوں جواب ابن کثیرؒ نے ذکر کئے ہیں۔ اور آخری جواب امام بیہقیؒ کا مختار ہے۔ اور یہی امام بخاریؒ کے ترجمۃ الباب سے ظاہر ہے۔ ششم یہ کہ ازواج مطہرات کے طواف کی تاخیر مراد ہے۔ یہ جواب نوویؒ نے شرح مہذب میں اور ان کی اتباع میں ابن حجرؒ نے شرح منہاج میں ذکر کیا ہے۔ ہفتم یہ کہ طواف زیارت کی رات تک تاخیر کو جائز رکھنا مراد ہے۔

طواف فاضہ کے بعد زمزم پر تشریف لانا

(ق) پھر طواف ادا کرنے کے بعد زمزم پر آئے وہ لوگ پانی نکال رہے تھے پس فرمایا کہ

اگر یہ خطرہ نہ ہوتا کہ لوگ تم پر غالب آجائیں گے تو میں آکر تمہارے ساتھ پانی نکالتا۔ پھر انہوں نے آپ کو ڈول پکڑا دیا پس آپ نے نوش فرمایا۔ کذا فی الہدی۔ اور تخلیص بذل میں ہے کہ نوویؒ کہتے ہیں کہ آپ کا ارشاد: اگر یہ خطرہ نہ ہوتا کہ لوگ تم پر غالب آجائیں گے کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ میرے عمل کو دیکھ کر لوگ یہ اعتقاد کر بیٹھیں گے کہ یہ بھی منجملہ مناسک حج کے ہے پس اس کوشش میں تم پر بھیڑ ہو جائیگی۔ اور تمہیں پانی نکالنے سے ہٹا دیں گے تو میں بھی تمہارے ساتھ پانی کھینچتا۔

اور یہ واقعہ صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت جابرؓ کی طویل حدیث میں مذکور ہے اور اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ طبقات میں حضرت عطاءؒ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب طواف افاضہ

فشرب قائماً۔

تو پیا پس کھڑے ہو کر نوش فرمایا۔

کیا تو آپ نے خود ڈول نکالا، اس میں آپ کے ساتھ کوئی شریک نہیں تھا، پھر نوش فرما کر ڈول کا باقی ماندہ پانی کنویں میں ڈال دیا۔ اور ارشاد فرمایا اگر مجھ کو یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ لوگ اس کے نکالنے میں تم پر غالب آ جائیں گے تو میرے سوا کوئی اس سے پانی نہ نکالتا۔ اس حدیث سے صاحب ہدایہ نے استدلال کیا ہے کہ خود نکالنا مستحب ہے، اور اس کے حاشیہ میں بنایہ سے نقل کیا ہے کہ اس حدیث کو طبرانی و احمد اور ابن سعد نے روایت کیا ہے تو علامہ عینی نے تخریج میں اس کے طرق کو مفصل ذکر کیا ہے۔ شیخ ابن ہمام کہتے ہیں کہ ان دونوں میں تطبیق یہ ہے کہ ابن سعد کی روایت کا قصہ طواف وداع کے بعد کا ہے اور حضرت جابرؓ کی حدیث کا واقعہ طواف افاضہ کے بعد کا ہے، اور اس کے الفاظ اس سلسلہ میں بالکل واضح ہیں کہ پس آپ بیت اللہ گئے، ظہر کی نماز مکہ میں پڑھی پس بنی عبد المطلب کے پاس آئے وہ لوگ پانی نکال رہے تھے الخ اور آپ کا طواف وداع رات کے وقت ہوا تھا۔ اور حدیث پر ایک اشکال اس روایت سے بھی ہوتا ہے جو ازرقی نے تاریخ مکہ میں نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مستورات کی معیت میں رات کے وقت بیت اللہ پہنچے پس اپنی اونٹنی پر طواف کیا، ہاتھ کی چھڑی سے حجر اسود کا استلام فرماتے تھے، پھر زمزم پر آئے اور فرمایا کہ تم پانی نکالتے رہو اگر یہ اندیشہ ہوتا کہ تم مغلوب ہو جاؤ گے تو میں بھی تمہارے ساتھ پانی نکالتا، پھر آپ کے حکم سے پانی کا ڈول نکالا گیا، پس آپ نے نوش فرمایا۔ الخ الا یہ کہ اس روایت کو اس پر محمول کیا جائے کہ ازواج مطہرات طواف افاضہ کیلئے جو آپ شب تشریف لے گئیں تھیں، آپ بھی ان کے ہمراہ گئے تھے واللہ اعلم۔ انتہی۔

پس کھڑے ہو کر نوش فرمایا۔

کھڑے ہو کر پانی پینا

کھڑے ہو کر پانی پینے میں علماء کا بہت ہی اختلاف ہے اور اوجز میں اس پر بہت ہی بسط سے کلام کیا ہے۔ اور اس کی تلخیص حاشیہ لامع میں ذکر کی ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ علماء کے اس میں چند اقوال ہیں۔ اول یہ کہ نہی زمزم اور وضوء کے باقی ماندہ پانی کے علاوہ کے ساتھ مخصوص ہے، یہ ہمارے بعض احناف کے ہاں مختار ہے، مثلاً صاحب نیر۔ در مختار وغیرہ۔ دوم یہ کہ کھڑے ہو کر پانی پینا ضرورت کی بنا پر تھا کہ وہاں بیٹھنے کی مناسب جگہ نہ ہوگی۔ سوم یہ کہ جواز کی حدیث منسوخ ہے، ابن حزم کا رجحان اسی طرف ہے۔ چہارم یہ کہ نہی کی حدیث منسوخ ہے، اکثر اسی طرف مائل ہیں، اور نووی نے اس پر شدید رد کیا ہے۔ پنجم

ثم رجع الی منٰی۔

ترجمہ: پھر منٰی واپس آ گئے

یہ کہ نہی تنزیہ کے لئے ہے اور فعل جواز کے لئے یہ فرق ابن الہمام وغیرہ کا مختار ہے اور اکثر احناف نے
بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ حتیٰ کہ عینی نے اس پر اجماع نقل کیا ہے بشرطیکہ امام طحاوی نے اس کو اختیار
کیا ہے کہ نہی مغفرت کی بنا پر ہے لیکن یہ امر شرعی نہیں بلکہ ارشادی و طبی ہے۔ انتہیٰ۔

عینیؒ نے امام طحاویؒ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ اور یہی امام طحاوی کی معانی الآثار اور مشکل الآثار
میں مذکور ہے۔ اور حافظ ابن حجرؒ نے امام طحاویؒ سے جو نقل کیا ہے کہ نہی اس صورت پر محمول ہے جب کہ
پانی پیتے وقت بسم اللہ نہ پڑھے۔ تو یہ شاید ان دو کتابوں کے علاوہ کسی اور کتاب میں ہوگا۔ اور شیخ نور الحق
مرقاۃ میں فرماتے ہیں کہ نہی اس صورت میں ہے کہ کھڑے ہو کر پانی پینا نقصان دہ ہو لہٰذا زمزم مستثنیٰ ہیں،
کیونکہ اس میں ضرر کا شائبہ تک نہیں جو یہی وجہ ہے زمزم کھڑے ہو کر پینا جائز ہوا؟

آب زمزم کی فضیلت

اور لامع کے حاشیہ میں زمزم کی فضیلت کی روایات تفصیل سے ذکر
کی ہیں۔ من جملہ ان کے یہ ہے کہ جبریل علیہ السلام نے آپ کا سینہ مبارک آب
زمزم سے دھویا۔ اور اسی لیے کہا گیا ہے کہ زمزم کا پانی دنیا کے ہر پانی سے افضل ہے سوائے
اس پانی کے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی انگشتان مبارک کے درمیان سے پھوٹ نکلا تھا۔ رہا یہ سوال
کہ کیا آب زمزم آب کوثر سے بھی افضل ہے؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض کا قول نفی میں ہے"

مگر محققین اس طرف گئے ہیں کہ آب زمزم آب کوثر سے افضل ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ
شب معراج میں فرشتوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ مبارک آب زمزم سے دھویا تھا۔ اگر آب کوثر
افضل ہوتا تو یقیناً وہی لایا جاتا۔ پوری تفصیل اسی جگہ دیکھی جائے۔

آنحضرتؐ نے یوم نحر کی ظہر مکہ میں پڑھی یا منٰی میں؟

پھر آنحضرتؐ منٰی واپس آ گئے۔ اس میں اختلاف ہے کہ آپ
نے ظہر مکہ میں پڑھی یا منٰی میں واپس آ کر؟ چنانچہ صحیحین
میں ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے ظہر منٰی میں پڑھی۔ یہ حدیث ابن قیمؒ نے اسی طرح صحیحین
سے نقل کی ہے۔ مگر حافظ زیلعی نے نصب الرایہ میں اور حافظ ابن حجرؒ نے الدرایہ میں اور صاحب
مشکوٰۃ نے صرف مسلم کی طرف منسوب کی ہے۔ نیز بیہقی نے السنن اور المعرفۃ میں صرف مسلم کی طرف

منسوب کی ہے جیسا کہ زیلعی میں ہے۔ نیز ابن ہمام نے بھی صرف صحیح مسلم کی طرف منسوب کی ہے اور صحیح مسلم میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آپ نے ظہر مکہ میں پڑھی۔ اور یہی قول حضرت عائشہؓ کا ہے۔ اب ایک جماعت نے پہلی روایت کو ترجیح دی ہے اور ایک جماعت نے دوسری کو۔ اور شیخ ابن تیمیہؒ نے منیٰ میں ظہر پڑھنے کو راجح کہا ہے۔ اور مکہ میں ظہر پڑھنے کو وہم قرار دیا ہے۔ موصوف نے حسب عادت اس پر خوب بسط سے کلام کیا ہے اور فریقین کے دلائل اور ان کے وجوہ ترجیح کو تفصیل بیان کیا ہے۔ ابن حزم کہتے ہیں کہ یہ بہت ہی مشکل ہے کیونکہ دونوں روایتیں صحیح ہیں: اور ایک لامحالہ وہم ہے مگر یہ معلوم نہیں کہ صحیح کیا ہے" اھ اور عینی شرح ہدایہ میں کہتے ہیں کہ "ایک روایت وہم ہے مگر اس کی تعیین معلوم نہیں" اور اسی طرح ابن سید الناس نے بھی کہا ہے۔ جیسا کہ زیلعی نے نقل کیا ہے کہ ایک روایت لامحالہ وہم ہے نیز حافظؒ نے درایہ میں ابن حزم سے نقل کیا ہے کہ ایک روایت وہم ہے اور زیلعی نے ابن حزمؒ کے کلام میں یہ اضافہ کیا ہے کہ "ایک روایت وہم ہے البتہ جمہور کے نزدیک یہ ہے کہ آپؐ نے ظہر مکہ میں پڑھی"۔ یہاں اس کی وجوہ ذکر کیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ ممکن ہے کہ آپؐ نے مکہ میں ظہر پڑھی ہو اور بیان جواز کے لئے منیٰ میں دوبارہ پڑھی ہو۔ صاحب البدایہ والنہایہ نے یہی تطبیق ذکر کی ہے۔ مگر یہ شافعیہ کے مذہب پر صحیح ہے کیونکہ ان کے نزدیک فرض پڑھنے والے کا نفل پڑھنے والے کے پیچھے اقتدا کرنا صحیح ہے۔ اور مرقات میں ہے کہ نووی کہتے ہیں: ان دونوں روایتوں کے درمیان تطبیق یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زوال سے قبل طواف افاضہ کیا۔ پھر ظہر کی نماز اول وقت میں مکہ میں پڑھی۔ پھر منیٰ لوٹ کر صحابہ کرامؓ کی درخواست پر ان کے ساتھ دوبارہ پڑھی۔ گویا منیٰ میں آپ کی نماز نفل تھی: ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کو ایسی صورت پر محمول نہ کیا جائے جس کے جواز میں اختلاف ہو بلکہ یہ تاویل کی جائے کہ آپؐ نے مکہ میں دوگانہ طواف وقت ظہر میں ادا کیا اور منیٰ واپس آکر ظہر کی نماز پڑھی۔ یا یہ کہا جائے کہ دونوں روایتیں تعارض کی وجہ سے ساقط ہیں۔ پس ترجیح اس کو ہوگی کہ آپ نے مکہ میں ظہر پڑھی کیونکہ وہاں افضل تھی اور تنگی وقت اسکی مؤید ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طلوع آفتاب کے تھوڑی دیر بعد مزدلفہ سے چلے۔ منیٰ میں رمی کی۔ سو اونٹ نحر کئے۔ ان کا گوشت پکایا کھایا۔ پھر مکہ گئے۔ طواف اور سعی کی۔ ظاہر ہے کہ ظہر کا وقت مکہ ہی میں آیا ہوگا۔ اور یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ آپ بلا ضرورت اس کو مستحب وقت سے مؤخر کر دیتے۔

فبات بہا

ترجمہ: پس رات وہاں رہے۔

اور یہاں کوئی ضرورت نہیں تھی۔ واللہ اعلم۔ اخوادر اجزاء میں ہے کہ ہمارے شیخ المشائخ شاہ ولی اللہ دہلوی نے "حجۃ اللہ" میں مکہ میں نماز کو ترجیح دی ہے۔ اسی طرح ابن ہمام نے فتح میں اس کو راجح کہا ہے۔ اور صاحب ہدایہ اور مبسوط نے صرف آپ کے منیٰ میں نماز پڑھنے کا ذکر کیا ہے۔ اور مکہ میں نماز پڑھنے کی روایت ذکر نہیں کی۔ اور شارح لباب نے مکہ میں نماز پڑھنے کو ترجیح دی ہے۔ البتہ اس کے نسخوں میں جو ہمارے پاس ہیں طباعت کی غلطیاں بہت ہیں۔

حضرت ام سلمہؓ کا رات کو طواف کرنا

(ف) ابن حزم کہتے ہیں کہ مسلم کی روایت کے مطابق حضرت ام سلمہؓ نے اسی دن اپنے اونٹ پر طواف کیا کیونکہ وہ بیمار تھیں۔ مگر اس میں یہ اشکال ہے کہ اسی روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سورۂ طور کی قراءت کرنے کا ذکر ہے اور دن کے وقت ام سلمہؓ نے آپ کی قراءت کیسے سن لی؟ اس لئے یہ سمجھ ہے۔ صحیح یہ ہے کہ ام سلمہؓ کا یہ طواف طواف وداع تھا۔ جس کو شیخ ابن قیمؒ نے دلائل کے ساتھ خوب بسط سے بیان کیا ہے اور حافظؒ نے فتح میں اس کی تصریح کی ہے۔ اور نسائی کی روایت میں یہ مصرح ہے اور صاحب لباب والنہایہ نے بھی یہ جزم کیا ہے اور کہا ہے کہ یوم النحر کا لفظ راوی کی غلطی ہے مزید تفصیل اوجز میں۔

ایام تشریق کی راتیں منیٰ میں گذارنے کا حکم

(ف) پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ لوٹ گئے پس ایام تشریق کی راتیں منیٰ میں رہے۔ زوال آفتاب کے بعد جمرات کی رمی کرتے۔ کذا فی الزرقانی۔ "پس رات وہاں رہے"۔ جمہور کے قول کے مطابق منیٰ میں رہنا واجب ہے۔ اور امام شافعیؒ کا ایک قول اور امام احمد کی ایک روایت یہ ہے کہ یہ سنت ہے یہی حنفیہ کا مذہب ہے اور منیٰ کی شب گذاری ترک کرنے پر دم کا واجب ہونا یا نہ ہونا اسی اختلاف پر مبنی ہے۔ اور "فبات بہا" حجت ہوگا جب رات کا بیشتر حصہ وہاں رہے۔ کذا فی اللامع۔ اور اوجز میں ایک جگہ یہ تفصیل مذکور ہے کہ منیٰ کی شب گذارنے کے ترک پر دم واجب ہوگا یا صدقہ وغیرہ۔

فلما زاغت الشمس مشى الى الجمرات فبدا بالجمرة الاولى ثم رمى الثانية

ترجمہ: پس جب سورج ڈھل گیا تو جمرات کی طرف چلے، پس جمرۂ اولیٰ سے ابتدا کی پھر دوسرے کی رمی کی

ایام تشریق میں رمی کا وقت

(ف) پس جب گیارھویں تاریخ کی صبح ہوئی تو آپ نے زوال آفتاب کا انتظار فرمایا۔ وقتی اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ائمہ اربعہ کے نزدیک یوم النحر کے بعد کی رمی زوال سے پہلے جائز نہیں، اس کی تفصیل اوجز میں ہے۔ اور اس کی تلخیص حاشیہ لامع میں۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: ایام تشریق کی رمی کا وقت باتفاق ائمہ زوال آفتاب کے بعد ہے۔ البتہ ایام تشریق کے تیسرے دن کی رمی میں امام ابوحنیفہؒ کا اختلاف ہے وہ فرماتے ہیں کہ اس دن کی رمی بطور استحسان زوال سے قبل بھی صحیح ہے۔ امام اسحاق بھی اسی کے قائل ہیں، اور یہی ایک روایت امام احمد سے مروی ہے۔

رہا رمی کا آخری وقت، پس وہ باتفاق ایام تشریق کا آخری دن ہے۔ اگرچہ وقت مستحب اور وقت کراہت اور وقت جواز اور بصورت تاخیر وجوب دم میں اختلاف ہے جس کی تفصیل ان کی کتب فروع سے اوجز میں نقل کی گئی ہے۔ اور اس کا خلاصہ میرے حاشیہ بذل میں اس طرح ہے کہ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک ایام تشریق کی رمی زوال سے قبل بالکل جائز نہیں، البتہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک صرف یوم نفر ثانی اس سے مستثنیٰ ہے۔ پھر امام شافعیؒ، امام احمد اور صاحبین کے نزدیک چوتھے دن کے غروب تک رمی کر سکتا ہے، اس کے لئے نہ کوئی معین وقت ہے نہ دم واجب ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ہر دن کی رمی کا وقت مستحب غروب تک ہے، اس کے بعد طلوع فجر تک وقت اباحت ہے، بغیر عذر کے اس وقت رمی کرنا مکروہ ہے مگر دم واجب نہیں، اور طلوع فجر کے بعد چوتھے دن کے غروب تک قضا ہے جس میں دم واجب ہوگا۔ اور امام مالک کے نزدیک ہر دن کی رمی کا وقت ادا غروب تک ہے۔ اور اگر رات کو رمی کی تو دم واجب ہوگا انتہی۔ اور یوم نحر کی رمی کے وقت میں اختلاف اپنی جگہ گذر چکا ہے۔

پس جب زوال ہوا تو جمرات کی طرف پیدل چلے اور سوار نہیں ہوئے۔ قبل ازیں رمی جمرۂ عقبہ کے بیان میں یہ بحث گذر چکی ہے کہ پیدل رمی کرنا افضل ہے یا سوار ہو کر۔ پس جمرۂ اولیٰ سے ابتدا کی اور اس کے بعد دیر تک دعا فرماتے رہے۔ جو سورۂ بقرہ کی مقدار کے برابر تھی، پھر دوسرے کی رمی کی۔ یہاں بھی اسی طرح طویل دعا فرمائی جس طرح جمرۂ اولیٰ کے پاس کی تھی۔ اور سنت ثانی یہ ہے کہ جمرۂ اولیٰ اور جمرۂ ثانیہ کے پاس دیر تک ٹھہرے، البتہ پہلے کے پاس زیادہ ٹھہرے تھے اور ان دونوں جمروں کے

ثم رمی الثالثۃ.

پھر تیسرے کی رمی کی۔

چاہیں کتنی دیر ٹھہرے؟ اس میں سلف کا اختلاف ہے جس کی تفصیل حاشیہ لامع میں اوجز سے نقل کی گئی ہے۔ اور اس میں ہے کہ موفق کہتے ہیں: اگر توقف اور دعا کو ترک کر دیا تو سنت کو ترک کر دیا مگر اس کے ذمہ کوئی چیز لازم نہیں ہوگی۔ اس مسئلہ میں امام ثوریؒ کے علاوہ کسی کا اختلاف معلوم نہیں۔ اور امام ثوریؒ فرماتے ہیں کہ کچھ کھانا کھلا دے یا دم دیدے۔ اور اگر دم دیدے تو میرے نزدیک بہت ہی اچھا ہوگا۔ اور اوجز میں ہے کہ جمرۂ اولیٰ و ثانیہ کے پاس قیام کرنا بخاری شریف میں بروایت سالم بن عبداللہ عن ابیہ مرفوعاً آیا ہے۔ اور ابوداؤد میں حضرت عائشہؓ کی حدیث میں آیا ہے اور حافظؒ نے ابن قدامہ کے حوالے سے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ اور ائمہ اربعہ کی کتابوں میں پہلے دو جمروں کے پاس طویل قیام کی تصریح موجود ہے۔ جیسا کہ اوجز میں ائمہ اربعہ کی فقہی کتابوں سے عبارتیں نقل کی گئی ہیں۔

ان دو جمروں کے پاس دعا میں ہاتھ اٹھانا

اور یہاں ایک اور اختلافی مسئلہ ہے کہ ان دونوں جمروں کے پاس دعا کرتے وقت ہاتھ اٹھائے جائیں یا نہیں؟ اوجز میں اس پر بہت ہی تفصیل سے کلام کیا ہے۔ اور اس میں ہے کہ ابن منذر کہتے ہیں: مجھے معلوم نہیں کہ جمروں کے پاس ہاتھ اٹھانے سے کسی نے انکار کیا ہو۔ بجز اس کے جو ابن قاسم نے امام مالکؒ سے نقل کیا ہے۔ الخ یہ طویل بحث اوجز میں دیکھی جائے۔ اس میں یہ اختلاف بھی ذکر کیا ہے کہ اس موقعہ پر اسی طرح ہاتھ اٹھائے جائیں جس طرح دعا میں اٹھائے جاتے ہیں یا قبلہ کی طرف؟

کیا تینوں جمرات کی رمی میں ترتیب واجب ہے

پھر تیسرے کی رمی کی۔ تینوں جمرات کی رمی میں ترتیب واجب ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے چنانچہ موفق کہتے ہیں کہ ان جمرات میں ترتیب واجب ہے یہاں تک کہ اگر ترتیب الٹ دی اور پہلے جمرۂ عقبہ کی رمی کی پھر ثانیہ کی اور پھر اولیٰ کی تو صرف اولیٰ کی رمی صحیح ہوگی۔ امام احمدؒ نے اس کی تصریح کی ہے اور امام شافعیؒ اور امام مالکؒ بھی اسی کے قائل ہیں۔ اور حسن اور عطاء کہتے ہیں کہ ترتیب واجب نہیں۔ اور یہی امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ اگر ترتیب الٹ دی تو اعادہ کرے۔ اور اگر اعادہ نہیں کیا تب بھی رمی صحیح ہوگی۔

ولم یقف عندہا

ترجمہ: اور اس کے پاس نہیں ٹھہرے۔

جمرۂ عقبہ کے پاس نہ ٹھہرے

اور اس کے پاس نہیں ٹھہرے اور اس پر ائمہ اربعہ کا اجماع ہے جیسا کہ ابن جریر نے محلی سے نقل کیا ہے اور موفق کہتے ہیں: اس کے پاس ٹھہرنا مسنون نہیں کیونکہ ابن عمرؓ اور ابن عباسؓ نے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس نہیں ٹھہرے۔ اسی طرح ام جندبؓ اور عائشہؓ کی روایت میں بھی یہی مضمون آیا ہے۔ اور امام بخاری نے اپنی صحیح میں ترجمۃ الباب قائم کیا ہے: باب من رمی جمرۃ العقبۃ ولم یقف۔ (جمرہ عقبہ کی رمی کے بعد نہ ٹھہرنے کا بیان) حافظ فتح میں فرماتے ہیں: کہ اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اجماع کی حکایت مشکل ہے کیونکہ مصنف میں بروایت ابن ابی شیبہ حسن بصری سے مرفوعاً مروی ہے کہ تمام جمرات کے پاس ٹھہرے اور کسی کی تعیین نہ کرے۔ ہاں یہ کہا جائے کہ یہ قول شاذ ہے اس لئے علمائے کرام کے نزدیک لائق التفات نہیں۔ یا یہ کہا جائے کہ اس قول سے مراد وہ ہے جو ملا علی قاری نے شرح لباب میں ذکر کیا ہے کہ تمام ایام رمی میں جمرۂ عقبہ کے پاس دعا کے لئے نہ ٹھہرے بلکہ بغیر ٹھہرنے کے دعا کرے۔ اور محلی میں ہے کہ پہلے دو جمروں کے پاس ٹھہرے اور جمرۂ عقبہ کے پاس نہ ٹھہرنے میں حکمت یہ ہے کہ دعا وسط عبادت میں واقع ہو۔ اور بعض نے کہا ہے کہ چونکہ جمرۂ عقبہ لوگوں کی گذرگاہ میں واقع ہے اس لئے وہاں ٹھہرنے سے لوگوں کا راستہ بند ہو جائے گا۔ عموماً اہل علم نے دوسری وجہ کو اختیار کیا ہے۔ اور حافظ ابن قیمؒ اور صاحب بدایہ نے پہلی وجہ یعنی دعا کے وسط عبادت کے واقع ہونے کی حکمت کو جیسا کہ اوجز میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اور اسی میں ابن جماعہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جمرۂ عقبہ کے پاس نہ ٹھہرے دیوم نحر میں اور اس کے بعد کیونکہ اس کی جگہ تنگ ہے۔ ٹھہرنے سے دوسروں کو تکلیف ہوگی لیکن یہ تعلیل زمانہ گذشتہ کے اعتبار سے ہے البتہ اگر یہ علت ذکر کی جائے کہ اس سے فارغ ہو کر نہ ٹھہرنے میں قبولیت کی نیک فال ہے۔ تو بعید نہ ہوگا۔ اھ حاصل یہ کہ رمی عقبہ کے بعد نہ ٹھہرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت اور ائمہ اربعہ کے نزدیک اجماعی ہے۔ البتہ اس کے سبب میں اقوال مختلف ہیں بعض کے نزدیک دعا کا وسط عبادت میں واقع ہونا اس کا سبب ہے۔ بعض کے نزدیک جگہ کا تنگ ہونا۔ اور بعض کے نزدیک قبولیت کی نیک فال۔ کذا فی الاوجز۔

(قلت) وهل كان يأتي مكة كل ليلة۔

ترجمہ: (یعنی) اور کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (منیٰ سے) ہر رات مکہ آیا کرتے تھے؟۔

آنحضرت نماز ظہر سے پہلے رمی کرتے تھے یا بعد میں؟

(ق) آنحضرت نماز ظہر سے پہلے رمی کرتے تھے یا بعد میں؟ جواب ظاہر یہی ہے کہ ظہر سے قبل کرتے تھے۔ کذا فی البحر ——— اور ابن قیم نے اس کے وجوہ ترجیح کو بسط سے ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حج میں ٹھہر کر دعا کرنے کے چھ مواقع پیش آئے ——— اوّل: صفا پہ، دوم: مروہ پہ، سوم: عرفہ میں، چہارم: مزدلفہ میں، پنجم: جمرۂ اولیٰ کے پاس، ششم: جمرۂ ثانیہ کے پاس۔

منیٰ کی راتوں میں ہر رات مکہ آنا

(ق) اور کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (منیٰ سے) ہر رات مکہ آیا کرتے تھے؟ حافظ ابن قیم نے اس کا انکار کیا ہے۔ اور اس کو اوہام میں شمار کیا ہے۔ اور موفق کہتے ہیں: "بعض لوگ کہتے ہیں کہ ایام منیٰ میں ہر رات بیت اللہ کی زیارت کیا کرتے۔ اور بعض اس کو ترجیح دیتے ہیں کہ مکہ نہ آئے بلکہ منیٰ ہی میں مقیم رہے کیونکہ یہ منیٰ کے دن ہیں۔ اور ابو عبداللہ (امام احمد) نے ابن عباس کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر رات مکہ جایا کرتے تھے"۔ اور حضرت ابن عباس کی حدیث امام بخاری نے اپنی صحیح میں تعلیقاً "یذکر" (ذکر کیا جاتا ہے) کے لفظ سے ذکر کی ہے۔ حافظ کہتے ہیں کہ "اس کو طبرانی نے بسند متصل روایت کیا ہے"۔ اس کی تخریج پر مفصل کلام کرنے کے بعد فرماتے ہیں: "اور ایک مرسل روایت اس کی مؤید ہے جس کو ابن ابی شیبہ نے طاؤس کے واسطے سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر رات بیت اللہ جاتے تھے"۔ اور میں کہتا ہوں کہ امام سرخسی کا رجحان اسی کی طرف ہے اور حافظ کا بھی۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رات تک تاخیر طواف کی حدیث کے ذیل میں قریب ہی گزر چکا ہے۔

وسط ایام التشریق کا خطبہ

(ق) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منیٰ میں دو خطبے دیئے، ایک خطبہ یوم نحر کو، جو پہلے گزر چکا ہے، اور دوسرا خطبہ وسط ایام التشریق میں، جس کو کہا گیا ہے کہ یوم النحر سے اگلے دن تھا۔ اور یہی حنفیہ اور مالکیہ اس کے قائل ہیں، اور بعض نے کہا ہے کہ یہ بارہ تاریخ تھی جیسا کہ شافعیہ اور حنابلہ کا قول ہے۔ اور خطبات حج میں ائمہ کا اختلاف ساتویں تاریخ کے خطبہ کی بحث میں گزر چکا ہے اور حنفیہ اور ان کے موافقین نے [illegible] کے خطبے پر ابو داؤد کی حدیث سے

استدلال کیا ہے کہ سراء بنت نبہان کہتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم الرؤس کو خطبہ دیا" اور
حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ یوم الرؤس باتفاق یوم النحر سے اگلا دن ہے" اور زرقانی کہتے ہیں کہ یوم الرؤس بفتح راء
و ہمزہ۔ یہ گیارہ ذی الحجہ کا نام ہے کیونکہ لوگوں کا معمول تھا کہ یوم النحر کو قربانیاں کیا کرتے' اور اس رات
قربانی کے سروں کو پکاتے اور صبح سویرے اٹھ کر کھایا کرتے تھے" اور شرح خامک نووی میں بروایت
طبقات ابن سعد عمرو بن یثربی سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم النحر کے اگلے دن ظہر کے
بعد خطبہ دیا۔ جیسا کہ میرے حاشیہ بذل میں ہے۔ اور البدایہ والنہایہ میں یوم النحر کا ذکر کرنے کے بعد لکھا
ہے کہ اس کے بعد کا دن "یوم القر" کہلاتا ہے۔ کیونکہ وہ اس میں قرار پکڑتے تھے۔ اور اس کو "یوم الرؤس"
بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ اس میں قربانی کے سر پکانے کھانے کا معمول تھا۔ یہ ایام تشریق کا پہلا دن ہے اور
ایام تشریق کے دوسرے دن یعنی ۱۲ ذی الحجہ کو یوم النفر الاول کہتے ہیں کیونکہ اس دن منیٰ سے رخصت ہو جانا
اور بعض نے کہا ہے کہ اس دن کو یوم الاوسط کہا جاتا ہے۔ اھ میں کہتا ہوں کہ روایات میں جو آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم نے وسط ایام تشریق میں خطبہ دیا ہے اس سے ۱۱ ذی الحجہ مراد ہے کیونکہ سراء بنت نبہان کی روایت
میں جو بعض ابو داؤد کے حوالے سے قریب ہی گذری ہے یہ لفظ ہیں: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم
کو یوم الرؤس میں خطبہ دیا پس فرمایا کہ یہ کونسا دن ہے؟ ہم نے عرض کیا: اللہ ورسولہ اعلم۔ فرمایا کیا یہ
وسط ایام تشریق نہیں ہے؟" اور البدایہ والنہایہ میں ہے کہ ابن حزم کہتے ہیں: "روایت میں آتا ہے کہ آپ نے
یوم الرؤس کو خطبہ دیا۔ اور اہل مکہ سے بلا اختلاف منقول ہے کہ یہ یوم النحر سے اگلا دن ہے اور یہ بھی آتا
ہے کہ آپ نے وسط ایام تشریق میں خطبہ دیا پس احتمال ہے کہ اوسط بمعنی اشرف ہو جیسا کہ حق تعالیٰ
کا ارشاد ہے: وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا اھ انتہی۔

آنحضرت کا قربِ وصال کو محسوس کر لینا

نیز امام بیہقیؒ نے حضرت ابن عمرؓ سے ذکر کیا ہے کہ سورۃ إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم پر وسط ایام تشریق میں نازل ہوئی اور آپ نے جان لیا کہ یہ وداع کا پیغام ہے" اھ۔ اور البدایہ
والنہایہ میں ۱۱ھ کے حوادث میں ہے: "اس سال کا حادثہ عظمیٰ اور فاجعہ کبریٰ سید اولاد آدم صلی اللہ
علیہ وسلم کی وفات شریفہ ہے۔ اور اسی ذیل میں آیت کریمہ الیوم اکملت لکم دینکم الآیہ
عرفہ کی شام کو نازل ہوئی اور ہم نے بسند جید روایت کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت عمرؓ رو پڑے

(ق) قال: واستأذنه العباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان یبیت بمکۃ، واستأذنه رعاۃ الابل

ترجمہ: (ق) اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے آپ سے مکہ میں رات رہنے کی اجازت چاہی۔ اور اونٹ چرانے والوں نے بھی آپ سے اجازت چاہی۔

رونے کا سبب دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ کمال کے بعد صرف نقصان رہ جاتا ہے گویا ان کو محسوس ہو گیا کہ اس آیت میں وصال نبوی کی خبر ہے۔ اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی طرف اشارہ فرمایا۔ چنانچہ مسلم میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جمرۂ عقبہ کے پاس کھڑے ہوئے اور فرمایا: مجھ سے اپنے مناسک حاصل کر لو شاید میں اس سال کے بعد حج نہیں کروں گا۔ اور حافظ بزار اور حافظ بیہقی نے ابن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ جب یہ سورۃ اذا جاء نصر اللہ والفتح ایام تشریق میں نازل ہوئی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھا کہ یہ پیغام وداع ہے پس ناقہ قصواء کی تیاری کا حکم فرمایا۔ پس وہ تیار کی گئی۔ اس کے بعد ابن عمرؓ نے خطبہ کا ذکر کیا۔ اسی طرح جب حضرت عمر بن خطابؓ نے ابن عباسؓ سے اس سورۃ کی تفسیر دریافت کی تو انہوں نے بھی یہی جواب دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کی خبر ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں بھی اس سے یہی سمجھتا ہوں جو کچھ تم نے کہا ہے جیسا کہ بخاری کی متعدد روایات میں مروی ہے۔ تو میں کہتا ہوں کہ اس بارے میں روایات مختلف ہیں کہ یہ سورۃ کس وقت اور کس جگہ نازل ہوئی۔ جیسا کہ خطبہ یوم النحر میں گزر چکا۔

حضرت عباسؓ کو مکہ میں رات بسر کرنے کی اجازت کا ملنا

(ق) اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے سقایت زمزم کی خاطر آپ سے منیٰ کی راتوں میں مکہ میں رہنے کی اجازت چاہی۔ چنانچہ آپ نے ان کو اجازت دے دی۔ یہ اختلاف پہلے گزر چکا ہے کہ منیٰ میں رات رہنا واجب ہے یا سنت۔ اور حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ سنت ہے۔ اس لئے حضرت عباسؓ اور دیگر حضرات کے ترک سنت میں ان کے نزدیک کوئی اشکال نہیں۔ اور جو حضرات وجوب کے قائل ہیں ان کے مسلک پر اشکال لازم آتا ہے جس کا بیان آگے آتا ہے۔

اونٹوں کے چرواہوں کا منیٰ سے باہر رات گزارنے کی اجازت طلب کرنا

اور اونٹ چرانے والوں نے بھی آپ سے منیٰ سے باہر رات گزارنے کی اجازت چاہی۔ چنانچہ آپ نے ان کو بھی اجازت مرحمت فرمائی۔

کیا یہ اجازت تمام معذوروں کو شامل ہے

اور وجہ یہ ہے کہ یہ اختلاف تو پہلے گذر چکا ہے کہ منیٰ میں رات رہنا واجب ہے یا سنت لیکن اس پر اتفاق ہے کہ چرواہوں کو یہ معاف ہے البتہ اس میں اختلاف ہے کہ یہ معافی صرف چرواہوں اور زمزم پلانے والوں سے مخصوص ہے یا تمام اصحاب عذر کو شامل ہے؟ اور امام بخاری کا ایک ترجمۃ الباب یہ ہے "باب ہل یبیت اصحاب السقایۃ او غیرہم بمکۃ لیالی منیٰ" حافظ فرماتے ہیں کہ "او غیرہم" سے مقصود وہ لوگ ہیں جن کو مرض یا شغل کا عذر ہو مثلاً مکاری اور چرواہے۔ رہا یہ سوال کہ کیا سقایت کی اجازت حضرت عباسؓ کے ساتھ خاص ہے یا اس کا مدار ان اوصاف پر جو اس حکم میں معتبر ہیں؟ پس بعض کا قول ہے کہ یہ حکم صرف حضرت عباسؓ سے خاص ہے، یہ تو جمود ہے اور بعض کا قول ہے کہ اس حکم میں حضرت عباسؓ کے ساتھ ان کی آل، اور بقول بعض کی قوم بنو ہاشم بھی داخل ہیں۔ اور بعض کا قول ہے کہ ہر وہ شخص جو سقایت کا محتاج ہو اس کے لئے یہی حکم ہے۔ اور یہی صحیح ہے کہ حکم کو عام رکھا جائے اور اس کی علت بیٹھنے والوں کے لئے پانی جمع کرنا ہے۔ رہا یہ سوال کہ کیا یہ حکم صرف پانی کے ساتھ مخصوص ہے یا کھانا وغیرہ جو اس کے ہم معنی ہیں وہ بھی اس کے ساتھ ملحق ہیں۔ یہ محل احتمال ہے اور جمہور کا مسلک یہ ہے کہ صرف چرواہے اہل سقایت کے حکم میں ہیں۔ اور یہی امام احمدؒ کا قول ہے۔ اسی قول کو یعنی اس حکم کے اہل سقایت اور چرواہوں کے ساتھ مخصوص ہونے کو ابن منذر نے اختیار کیا ہے اور امام احمد سے معروف روایت یہ ہے کہ یہ حکم صرف حضرت عباسؓ کے لئے مخصوص ہے۔ اور مالکیہ کہتے ہیں کہ چرواہوں کے علاوہ باقی سب لوگوں پر دم واجب ہوگا۔ انتہی مختصراً من الاوجز۔

اور منیٰ میں رات بتانے کے مسئلہ میں مذاہب کا خلاصہ یہ ہے کہ شافعیہ، حنابلہ اور مالکیہ کے نزدیک چرواہوں اور زمزم نکالنے والوں کے لئے اس کا ترک جائز ہے۔ پھر مالکیہ کی ایک جماعت، دردیر وغیرہ کا قول یہ ہے کہ رخصت صرف اونٹوں کے چرواہوں کے ساتھ مخصوص ہے اور شافعیہ کی ایک جماعت مثلاً ابو اسحٰق کی المہذب اور امام غزالی کی الوجیز سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔ اور مالکیہ کی ایک جماعت مثلاً ابن شاش، ابن حاجب اور ابن عرفہ کا قول ہے کہ یہ اجازت چرواہوں کے علاوہ دوسروں کو بھی عام ہے۔ زرقانی نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ اور نیل

ولم یتعجل فی یومین

ترجمہ: اور آپ نے دو دن میں رک کر واپس آنے میں تعجیل نہیں کی۔

اعذار مثلاً مریض اور وہ شخص جس کے مال ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہو وغیرہ کا حکم بھی یہی ہے؟
اس میں شافعیہ کی دو روایتیں ہیں، دونوں میں صحیح تر روایت اثبات میں ہے۔ اور یہی حنابلہ کا قول ہے۔
اور دوسری کا جواب نفی میں ہے۔ اور یہی مالکیہ کا قول ہے۔ اور کیا یہ حکم حضرت عباسؓ کے ساتھ
خاص ہے؟ رافعی کہتے ہیں کہ اہل سقایت کی رخصت عباسیہ کے ساتھ خاص نہیں کیونکہ معنی علت
حکم ان کے ساتھ دوسروں کو بھی شامل ہے۔ اور امام مالک و ابو حنیفہؒ سے مروی ہے کہ یہ اولاد
عباس کے ساتھ خاص ہے۔ اور یہی ایک وجہ روایت ہمارے اصحاب کے لئے بھی ہے اور
بعض بنو ہاشم سے اختصاص کو نقل کرتے ہیں۔ کذا فی الاوجز مع زیادۃ من غیرہ۔

چرواہوں کو دو دن کی رمی جمع کرنے کی اجازت دی۔ اور آپ نے اونٹوں کے چرواہوں کو رخصت دی کہ وہ یوم نحر کی رمی کریں اور یوم نحر کے
بعد دو دن کی رمی ایک ہی دن کر لیا کریں۔ اوجز میں شیخ ابن قیم کے کلام سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ
چرواہوں کو اختیار تھا کہ چاہے دونوں دن کی رمی پہلے دن کر لیا کریں۔ یا دوسرے دن۔ یعنی جمع تقدیم اور
جمع تاخیر دونوں کا اختیار تھا۔ اس سلسلہ میں روایات حدیث مختلف ہیں۔ جیسا کہ ترمذی، ابوداؤد
موطا مالکؒ اور موطا محمدؒ میں ہے۔ اور بذل، کوکب اور اوجز میں ان روایات کی اور اقوال ائمہ کی
تفصیل سے ذکر کی گئی ہے۔ زیادہ تفصیل اوجز میں ہے۔ اور اس کا خلاصہ میرے حاشیۂ بذل میں یہ
ہے کہ ابن حزم وغیرہ کا قول ہے کہ انہیں جمع تقدیم و تاخیر دونوں کا اختیار ہے۔ اور ائمہ ثلاثہ کا اتفاق
ہے کہ جمع تقدیم جائز نہیں۔ اور جمع تاخیر کی صورت میں امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک دم لازم آئیگا۔
باقی چار ائمہ کے نزدیک نہیں۔ انتہٰی۔

آنحضرت نے ایام تشریق کے تیسرے دن کی رمی بھی فرمائی اور آپ نے دو دن میں رک کر واپس آنے میں
تعجیل نہیں کی بلکہ تیسرے دن تک تاخیر فرمائی،
یہاں تک کہ ایام تشریق کی رمی بھی پوری فرمائی۔ اور ائمہ کا اجماع ہے کہ جو شخص بارہ تاریخ کو منیٰ سے
واپس آنا چاہے آسکتا ہے کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے "پس جس نے دو دن میں رک کر آنے میں تعجیل کی اس

وافاض یوم الثلاثاء۔

ترجمہ: اور منگل کے دن منیٰ سے چلے۔

کے ذمہ کچھ گناہ نہیں۔ اور جس نے تیسرے دن تک تاخیر کی اس کے ذمہ بھی کچھ گناہ نہیں۔ الایہ۔ اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ بات پسند نہیں کہ امام جلدی آجائے۔ رہے امام کے علاوہ دوسرے لوگ تو آفاقی کیلئے جلدی آجانا جائز ہے اور اہل مکہ کے بارے میں امام مالکؒ کے اقوال مختلف ہیں: ایک قول یہ کہ اس کے لئے مناسب نہیں۔ اور ایک قول یہ کہ وہ آفاقی کی مثل ہے۔ اور اوجز میں ہے کہ موفق کہتے ہیں: اہل علم کا اجماع ہے کہ جو شخص منیٰ سے نکل کر حرم سے رخصت ہونا چاہے اور اسے مکہ میں نہ رہنا ہو وہ ایام تشریق کے دوسرے دن زوال کے بعد منیٰ سے جا سکتا ہے۔ اور اگر مکہ میں رہنا چاہئے تو امام احمد فرماتے ہیں کہ مجھے یہ بات پسند نہیں کہ جو شخص منیٰ سے بارہ تاریخ کو آجائے وہ مکہ میں ٹھہرے اور نوویؒ اپنے مناسک میں کہتے ہیں بارہ تاریخ کو منیٰ سے آجانا اگرچہ جائز ہے لیکن تیسرے دن تک تاخیر افضل ہے: ابن حجر مکیؒ اس کی شرح میں کہتے ہیں کہ تاخیر افضل ہے الایہ کہ کوئی عذر ہو اور اس میں امام اور غیر امام یکساں ہیں۔ اور احکام سلطانیہ میں ہے کہ امام کے لئے نفر اول جائز نہیں، کیونکہ وہ متبوع ہے اس کو مناسک پورے کرنے کے بعد ہی آنا ہوگا۔ اور ہدایہ میں ہے کہ پہلے دن (بارہ تاریخ کو) بھی آسکتا ہے مگر افضل یہ ہے کہ ۱۳ تک ٹھہرے۔ نیز اوجز میں ہے کہ موفق کہتے ہیں: اگر وہ ۱۲ تاریخ کو منیٰ سے نکلنے سے قبل آفتاب غروب ہو جائے تو نہ نکلے خواہ کوچ کر چکا تھا یا اپنی جگہ میں مقیم تھا۔ دونوں صورتوں میں اس کے لئے نکلنا جائز نہیں۔ یہی قول امام مالکؒ و امام شافعیؒ کا ہے۔ اور امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ تیسرے دن کی صبح صادق طلوع ہونے سے پہلے جا سکتا ہے۔

منیٰ سے محصب کی طرف روانگی

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تیسرے دن کی رمی کر کے منگل کے دن ظہر کے بعد منیٰ سے چلے الہدی میں اسی طرح ہے اور قسطلانی نے مواہب میں اس کی پیروی کی ہے۔ اور مراد اس سے زوال کے بعد اور نماز ظہر سے پہلے چلنا ہے۔ صحیح بخاری کا ترجمۃ الباب ہے۔ باب من صلی العصر یوم النفر بالابطح۔ امام بخاریؒ نے اس میں عبدالعزیز بن رفیع کی حدیث نقل کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت انسؓ سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم الترویہ (۸ ذی الحجہ) کی نماز ظہر کہاں پڑھی مجھ کو بتلائیں۔ میں نے پوچھا کہ منیٰ سے واپسی کے

الی المحصب

ترجمہ: اور محصب پہنچے۔

دن عصر کہاں پڑھی تھی؟ فرمایا ابطح میں۔ اور تم وہی کرو جو تمہارے امراء کریں۔ اس کے بعد حضرت انسؓ کی یہ حدیث روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر، عصر، مغرب، عشاء محصب میں پڑھیں اور تھوڑا سا سوئے بھی۔ اور البدایہ والنہایہ سے ظاہر ہے کہ ان دونوں روایتوں میں تعارض ہے؛ چنانچہ وہ کہتے ہیں منگل کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سوار ہوئے اور مسلمانوں کو ساتھ لے کر منیٰ سے چلے، محصب میں فروکش ہوئے اور وہاں عصر پڑھی، جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے جس کو یہاں پہلی حدیث ذکر کیا۔ اور یہ بھی مروی ہے کہ آپ نے یوم النفر کی نماز ظہر ابطح میں پڑھی، واللہ اعلم۔ یہاں دوسری حدیث کو ذکر کیا۔ اور حافظ فرماتے ہیں کہ راوی کا یہ بیان کہ آپ نے ظہر ابطح میں پڑھی اس امر کے منافی نہیں کہ آپ نے زوال کے بعد رمی کی۔ چنانچہ آپ نے رمی کی، پھر کوچ کیا، محصب پہنچے، پس یہاں ظہر پڑھی۔ اھ۔ اور محصب پہنچے۔ محصب بالضم میم، بر فتح حاء مہملہ و صاد مہملہ مشددہ و باے موحدہ۔ اس کو ابطح اور بطحاء بھی کہتے ہیں کما فی الاستذکار۔ اور معجم البلدان میں ہے کہ اس کو ابطح، بطحاء اور خیف بنی کنانہ کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ اھ اور نووی کہتے ہیں کہ محصب، حصباء، ابطح، بطحاء اور خیف بنی کنانہ ایک ہی جگہ کے نام ہیں۔ اھ اور اس میں اختلاف ہے کہ ذو طویٰ بھی محصب ہی کا نام ہے یا کسی اور جگہ کا؟ جیسا کہ حاشیہ لامع میں ہے۔ اور اس میں بعض سے نقل کیا ہے کہ یہ ایک وسیع جگہ کا نام ہے، جو مکہ اور منیٰ کے درمیان ہے، منیٰ سے زیادہ قریب ہے اور اس کے حدود دونوں پہاڑوں کے مابین مقبرہ تک ہیں۔

محصب میں اترنا سنت ہے یا نہیں؟

اس میں علماء کے دو قول ہیں کہ محصب میں اترنا سنت ہے یا یہ اتفاقی منزل تھی؟ اور حج میں اس کو خوب بسط سے بیان کیا ہے۔ ائمہ اربعہ اور جمہور نے پہلی شق کو اختیار کیا ہے، مگر پھر ان کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ یہ سنت ہے یا مستحب؟ اور امام مالکؒ مقتدیٰ اور غیر مقتدیٰ کے درمیان فرق کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک مقتدیٰ کے حق میں مؤکد ہے اور غیر مقتدیٰ کے حق میں غیر مؤکد۔ اور بعض سلف نے قول ثانی کو اختیار کیا ہے۔ ان کی دلیل مسند احمد میں حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے: اللہ کی قسم! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہاں صرف میری وجہ سے فروکش ہوئے تھے، یعنی حضرت عائشہؓ کے عمرہ کی خاطر۔ اور ایک روایت میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صرف اس لئے ٹھہرے کہ یہاں سے مدینہ کی واپسی آپ کے لئے آسان تھی۔

حدیث بخاری شریف باب المحصب میں ہے۔ اور تیسرے کی دلیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منیٰ سے
چلنے سے قبل ہی یہاں کے قیام کا ارادہ فرمایا تھا۔ چنانچہ اوجز میں ہے کہ صحاح ستہ میں حضرت اسامہؓ سے
روایت ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کل کہاں قیام ہوگا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کل
نحن نازلون غدا بخیف بنی کنانہ یعنی محصب میں اتریں گے جہاں کفار نے کفر کا عہد و پیمان کیا تھا۔ اس حدیث
سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہاں اترنا قصداً تھا اور پہلے ہی سے اس کی نیت تھی۔ اور حضرت
عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ان کے اپنے فہم پر مبنی ہے علاوہ ازیں اس جگہ کا واپسی کے لئے مناسب ہونا یا
حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے عمرہ کی مصلحت بھی اس امر کے منافی نہیں کہ کسی مستقل وجہ کی بناء پر آپ نے یہاں
اترنے کا قصد کیا ہو۔ اسی طرح حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی اس کے منافی نہیں کہ مجھے رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے محصب میں خیمہ لگانے کا حکم نہیں فرمایا تھا بلکہ میں نے از خود وہاں خیمہ لگا دیا اور آپ
صلی اللہ علیہ وسلم اس جگہ اتر گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قصد چونکہ یہاں اترنے کا تھا اس لئے یہی امر
حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ کے قلب پر وارد ہوا۔ یہ ایک ایسا امر ہے جو اہل حقائق سے مخفی نہیں۔ جس کا انکار
کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ یہ اہل قلوب کے ہاں معروف چیز ہے۔ مزید یہ کہ اگرچہ خیمہ آپ کے حکم سے نصب نہیں
کیا گیا۔ مگر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں نزول فرمایا تو یہاں کا نزول سنت ٹھہرا۔ بالخصوص جب
کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاء راشدین کا عمل بھی یہی رہا۔ جیسا کہ حاشیہ لامع میں ہے۔ اور اس میں
ہدایہ سے نقل کیا ہے کہ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نزول بالقصد تھا۔ یہی صحیح ہے لہٰذا یہاں اترنا سنت
ہوگا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا تھا کل ہم خیف بنی کنانہ میں فروکش
ہوں گے۔ تو یہیں معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں اس مقصد کے لئے نزول فرمایا تھا کہ آپ صلی اللہ
علیہ وسلم کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے لطف و احسان کا جو معاملہ فرمایا مشرکین کے سامنے اس کا اظہار کیا جائے۔
اس لئے رمل کی طرح یہ بھی سنت ہوا۔ امام نووی کہتے ہیں جمہور کا مذہب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
اور خلفاء راشدین کی اقتداء میں یہاں کا نزول مستحب ہے۔ اور اس پر اجماع ہے کہ اس کے ترک سے کچھ لازم
نہیں آتا۔ حضرت شیخ قدس سرہ کوکب میں فرماتے ہیں تحصیب کا نزول حج سے متعلق نہیں بلکہ ایک مستقل سنت ہے
اس لئے جو حضرات فرماتے ہیں کہ محصب میں اترنے کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ حج سے اس
کا کوئی تعلق نہیں۔ اور جہاں یہ کہا گیا ہے کہ یہ سنت ہے وہاں مراد یہ ہے کہ حج سے الگ ایک مستقل اور علیحدہ سنت

فنزل هناك. ثم نهض الى مكة فطاف للوداع

ترجمہ: پس وہاں فروکش ہوئے۔ پھر مکہ کی طرف چلے اور طواف وداع کیا۔

اور کوکب کے حاشیہ میں ہے کہ حافظ کہتے ہیں: "حاصل یہ کہ جن حضرات نے اس کے سنت ہونے کی نفی کی جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابن عباسؓ ان کی مراد یہ ہے کہ یہ مناسک میں سے نہیں۔ لہٰذا اس کے ترک سے کوئی چیز لازم نہیں۔ اور جن حضرات نے اس کو سنت کہا ہے جیسے ابن عمر رضی اللہ عنہ ان کی مراد یہ ہے کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال کی اقتداء کے عموم میں داخل ہے" اھ

پس وہاں بالوں کے بنے ہوئے خیمے میں فروکش ہوئے جیسا کہ زرقانی میں ہے۔ یہ خیمہ آپ کے آزاد کردہ غلام حضرت ابو رافعؓ نے نصب کیا تھا۔ ان کے نام میں دس قول ہیں ان میں سے "اسلم" زیادہ مشہور ہے۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامان کی نگرانی پر مامور تھے۔ یہ فرماتے ہیں کہ مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں خیمہ لگانے کا حکم نہیں فرمایا تھا الخ جیسا کہ امام مسلم اور ابوداؤد وغیرہ نے روایت کیا ہے۔

محصب میں چار نمازوں کا استحباب

یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر سے عشاء تک کی نماز پڑھیں اور تھوڑی دیر سے جستجو کی۔ ائمہ اربعہ کا اجماع ہے کہ یہاں چار نمازیں پڑھنا مستحب ہے۔ جیسا کہ اوجز میں مفصل ذکر کیا ہے لیکن دردیر کہتے ہیں: "چار نمازوں کا یہاں مستحب ہونا جب ہے جبکہ اسے جلدی نہ ہو۔ اور واپسی جمعہ کے دن نہ ہو ورنہ محصب میں آنا مستحب نہیں۔ اور یہاں ظہر کی نماز کے مندوب ہونے کا موقع اس وقت ہے جب کہ تنگیٔ وقت سے پہلے یہاں پہنچ جائے۔" اور شرح مناسک نووی میں ہے: "ظہر کی نماز منیٰ میں نہ پڑھے بلکہ محصب کی منزل میں یا کسی دوسری جگہ پڑھے۔ اور اگر منیٰ میں پڑھ لی تب بھی جائز ہے۔ مگر افضل کو ترک کر دیا" اھ اور اوجز میں علی سے نقل کیا ہے کہ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں: "اور ایک گھڑی کے لئے محصب میں آ جائے" اھ اور فتح القدیر میں ہے: "اور اسی جگہ ظہر سے عشاء تک کی نمازیں پڑھے۔ اور تھوڑی سی نیند کرے، پھر مکہ میں داخل ہو۔" اھ اس سے ظاہر ہوا کہ ایک گھڑی ٹھہرنے سے اصل سنت ادا ہو جائے گی۔ مگر کمال وہ ہے جو کمال ابن ہمام نے ذکر کیا ہے" اھ۔

حضورؐ کا طواف وداع کرنا

پھر مکہ کی طرف چلے اور رات کو سحری کے وقت طواف وداع کیا۔ قسطلانی کہتے ہیں کہ وداع بفتح واؤ اور اس کو طواف صدر بفتح صاد کا نام بھی دیا

جاتا ہے کہ اس میں بیت اللہ کی طرف واپسی ہوتی ہے اور اوجز میں ہے: الوداع بفتح واؤ، سلام اور کلام کے وقت پر تودیع (رخصت کرنے) کا نام ہے اور ابن نجیم کہتے ہیں کہ اس کے پانچ نام ہیں: طواف صدر، طواف وداع، طواف افاضہ، طواف واجب، طواف آخر عہد بالبیت۔ اور صدر کے معنی رجوع کے ہیں مگر اس رجوع سے کیا مراد ہے؟ اس میں اختلاف ہے۔ چنانچہ ہمارے نزدیک افعال حج سے رجوع مراد ہے۔ اور امام شافعی کے نزدیک اپنے گھر کی طرف رجوع مراد ہے۔ اس پر یہ مسئلہ مبنی ہے کہ اگر طواف صدر کے بعد کسی ضرورت کے لئے مکہ میں ٹھہر گیا تو ہمارے نزدیک اعادہ لازم نہیں۔ اور ان کے نزدیک لازم ہے۔ اور اس طواف کے حکم میں دو قول ہیں مشہور قول یہ ہے کہ واجب ہے۔ اور یہی ائمہ ثلاثہ کا قول ہے اور دوسرا قول یہ کہ یہ سنت ہے۔ یہ امام مالک اور داؤد ظاہری کا مسلک ہے۔ یہ بحث عنقریب آتی ہے کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز صبح مکہ میں پڑھی تھی؟

حضرت صفیہؓ کی ماہواری کا قصہ اور اس پر اشکال

(ق) اور حضرت صفیہؓ نے آپ کو بتایا کہ وہ حائضہ ہیں۔ آپ نے فرمایا کیا یہ ہمیں جانے سے روک لے گی؟ آپ کو بتایا گیا کہ یہ طواف افاضہ کر چکی ہیں۔ آپ نے فرمایا پھر کوئی حرج نہیں۔ پھر طواف وداع کے بغیر ہی واپس چلی گئیں اھ (ف) حضرت صفیہؓ منیٰ سے واپسی کی رات حائضہ ہوئی تھیں، اس لئے ابن عربی کی العارضہ میں اس موقع پر لیلۃ النحر کا لفظ کتابت کی غلطی ہے۔ لیلۃ النحر کے بجائے لیلۃ النفر صحیح ہے کیونکہ خود ابن عربی نے اس سے قبل لکھا ہے کہ حضرت صفیہؓ نے اس دن یعنی یوم نحر کو طواف افاضہ کیا۔ اور لیلۃ النفر کو حائضہ ہوئیں۔ اور اوجز میں ہے کہ وہ یوم النحر کا طواف کر چکنے کے بعد حائضہ ہوئیں۔ چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کیا۔ پس ہم نے یوم نحر کو طواف کیا۔ پھر صفیہؓ کو ایام شروع ہو گئے الخ اور ان کے حیض کی ابتداء لیلۃ النفر (منیٰ سے واپسی کی رات) تھی۔ چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ لیلۃ النفر کو صفیہؓ حائضہ ہوئیں۔ پس کہنے لگیں کہ میرا خیال ہے میری وجہ سے تمہیں ٹھہرنا پڑے گا الخ اور اوجز میں اس مسئلہ کی روایات کے اختلاف کو بہت ہی بسط کے ساتھ ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے حضرت صفیہ کے قصہ میں حضرت عائشہؓ کی اس روایت سے اشکال ہوتا ہے کہ ہم نے حج کیا پس یوم نحر

(قلت: وطافت ام سلمة رضی اللہ عنہا علی بعیرھا (قال) ورغبت عائشۃؓ عمرۃ۔

ترجمہ: اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے اپنے اونٹ پر طواف کیا۔ (ق) اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عمرہ کی خواہش ظاہر کی۔

کو طواف افاضہ کیا۔ پس صفیہ حائضہ ہو گئیں۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے مقاربت کا قصد کیا تو ہم نے کہا کہ یا رسول اللہ وہ تو حائضہ ہیں۔" الا یہ جو اشکال یہ ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو علم تھا کہ وہ طواف افاضہ کر چکی ہیں تو یہ کیسے فرمایا کہ "کیا یہ ہم کو روک رکھے گی؟" اور اگر معلوم نہیں تھا کہ انہوں نے طواف افاضہ کر لیا ہے تو محل نانی سے قبل مقاربت کا ارادہ کیسے فرما لیا؟ جواب یہ ہے کہ ازواج مطہرات آپ سے طواف افاضہ کی اجازت حاصل کر چکی تھیں۔ اور آپ انہیں اجازت دے چکے تھے۔ پس اس بنا پر مقاربت کا ارادہ فرمایا کہ وہ حلال ہو چکی ہیں۔ مگر جب آپ کو بتایا گیا کہ وہ حائضہ ہیں تو خیال فرمایا کہ شاید یہ عذر طواف افاضہ سے قبل ہی پیش آیا ہو اور اس کی وجہ سے وہ طواف افاضہ نہ کر سکی ہوں اس لئے اس کے بارے میں دریافت فرمایا۔ حضرت عائشہؓ نے آپ کو بتایا کہ یہ دیگر ازواج مطہرات کی معیت میں طواف افاضہ کر چکی ہیں۔ تو یہ اندیشہ زائل ہو گیا۔" اھ

حیض و نفاس والی عورتوں کے طواف وداع کا حکم

حیض و نفاس والی عورت کی طواف وداع سے قبل گھر کی طرف واپسی کا مسئلہ صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں مختلف فیہ تھا۔ بعد ازاں حضرت صفیہؓ کے قصے کے پیش نظر جمہور امت کا اس پر اجماع ہو گیا ہے کہ اس کے لئے واپسی جائز ہے۔ چنانچہ اوجز میں ہے کہ موفق لکھتے ہیں: "جب طواف وداع سے قبل عورت کو حیض شروع ہو جائے تو وہ جا سکتی ہے۔ اس کے ذمہ طواف وداع نہیں، نہ کچھ فدیہ لازم ہے۔ یہ عام فقہاء امصار کا قول ہے۔ اور حضرت عمرؓ اور ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ وہ ایسی عورت کو طواف وداع کے لئے ٹھہرنے کا حکم فرماتے تھے۔ اور حضرت زید بن ثابتؓ اسی کے قائل تھے۔ مگر انہوں نے اس سے رجوع کر لیا تھا۔" الخ۔

(ش) اور ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے اپنے اونٹ پر طواف کیا۔ اس کی تفصیل یوم نحر کے بیان میں گزر چکی ہے۔ اور وہاں ابن حزم کا وہم بھی گزر چکا ہے۔ اور صحیح یہ ہے کہ ان کا یہ طواف، طواف وداع تھا۔ جو ہم اور ذی الحجہ کی صبح کو کیا۔

حضرت عائشہؓ کا عمرۂ تنعیم

(ق) اور اس رات حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عمرہ کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بھائی عبد الرحمٰنؓ کو

حکم فرمایا کہ انہیں تنعیم سے عمرہ کرائیں۔ اور وہ رات ہی کو عمرہ سے فارغ ہو گئیں۔ ان کے اس عمرہ پر تفصیل بحث موضع سرف میں ان کے حائضہ ہونے کے قصے میں گذر چکی ہے۔ اور علامہ شیخ ابن قیم کا یہ قول بھی گذر چکا ہے کہ ان کے عمرے میں علماء کے چار مسلک ہیں۔ اور یہ بھی گذر چکا ہے کہ ان کا یہ عمرہ اس عمرہ کی قضا تھی جو حیض کی وجہ سے فسخ کرنا پڑا تھا۔ کیونکہ حنفیہ کے نزدیک ان کا حج مفرد تھا۔ بخلاف ائمہ ثلاثہ کے، کہ ان کے نزدیک انہوں نے عمرہ پر حج کا احرام باندھ کر قران کر لیا تھا جیسا کہ پہلے تفصیل سے گذر چکا ہے۔

(ق) پھر وہ عمرہ سے فارغ ہو کر اپنے بھائی کے ساتھ محصب پہنچ گئیں تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کیا تم فارغ ہو گئے؟" انہوں نے عرض کیا "جی ہاں" پس آپ نے کوچ کا اعلان فرمایا۔ بخاری میں اسی طرح ہے۔ "اھ" اوجز میں ہے: اس بارے میں روایات بہت ہی مختلف ہیں کہ حضرت عائشہؓ عمرہ سے فارغ ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کس جگہ پہنچیں؟ راستے میں؟ یا محصب میں؟ یا کسی اور جگہ؟ اور اس ناکارہ کے نزدیک اوجز میں یہ ہے کہ شیخ ابن قیم نے ذکر کیا کہ حضرت عائشہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محصب ہی میں جا کر ملی تھیں۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا "میں تم دونوں کا انتظار کرتا ہوں" اور واپسی پر فرمایا "کیا تم فارغ ہو گئے؟" اور جب حضرت عائشہؓ نے بتایا کہ وہ فارغ ہو چکے ہیں تو آپ نے کوچ کا اعلان کیا۔" اس کے علاوہ اور روایات بھی اسی پر دلالت کرتی ہیں۔ پس اوجز میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محصب میں ان کا انتظار فرمایا۔ تاہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ مگر ابھی تک محصب کی حدود سے نہیں نکلے تھے۔ پس جن حضرات نے یہ کہا کہ وہ آپ کی منزل ہی میں آپ سے آ کر ملی تھیں اس سے ان کی مراد خیمہ نہیں۔ بلکہ محصب ہے۔ کیونکہ آپ خیمہ سے نکل کر مکہ کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ اور جن حضرات نے یہ کہا کہ وہ راستہ میں ملیں ان کا قول اپنے ظاہر پر ہے۔ یعنی خیمہ سے نکل کر مکہ کی طرف کوچ کرنے کے راستہ میں۔ پھر جب حضرت عائشہؓ اور ان کے بھائی پہنچ گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوچ کا اعلان فرمایا تاکہ لوگ سامان وغیرہ باندھ کر تیار ہو جائیں۔ کہ ان افعال کا فی وقت اور کئی گھنٹوں میں ہو سکتے ہیں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نیز وہ حضرات جنہوں نے طواف وداع نہیں کیا تھا مکہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

(ر) اگر کہا جائے کہ اس حدیث کے درمیان اور حدیث اسود کے درمیان تطبیق کی کیا صورت

ہوگی۔ جو صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے ملے درآنحالیکہ
آپ چڑھ رہے تھے۔ اور میں اتر رہی تھی، یا میں چڑھ رہی تھی اور آپ اتر رہے تھے۔ چنانچہ اس حدیث
میں ہے کہ ملاقات راستہ میں ہوئی۔ شیخ ابن قیمؒ نے ان دونوں کے درمیان تطبیق کی دو صورتیں ذکر کی ہیں
اور ایک تیسری صورت شیخ ابو محمد بن حزمؒ سے نقل کی ہے جیسا کہ حاشیہ لامع میں بسط کے ساتھ مذکور
ہے۔ اور اس ناکارہ کے نزدیک وجیہ یہ ہے کہ اس شکل میں صحیح یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ
وسلم طواف وداع کے لئے محصب سے مکہ کی طرف اتر رہے تھے۔ اور حضرت عائشہؓ عمرہ سے فارغ
ہو کر مکہ سے محصب کی طرف چڑھ رہی تھیں۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی ملاقات محصب
میں اس وقت ہوئی جب کہ آپ خیمہ سے باہر تشریف لا چکے تھے جیسا کہ ابھی اوپر گذرا۔ اور یہ توجیہ
ناگزیر ہے۔ اور اس کا عکس میرے نزدیک واضح طور پر غلط ہے۔ اس کی متعدد وجوہ حاشیہ لامع
میں مذکور ہیں۔ من جملہ ان کے ایک یہ کہ یہ توجیہ تمام اعتراضات سے سالم ہے جو قاضی عیاضؒ اور
حافظ ابن حجرؒ وغیرہ نے اس قصہ کی روایات پر کئے ہیں جن کی تفصیل حاشیہ لامع میں ہے۔ من جملہ ان کے ایک
یہ کہ امام بخاریؒ نے "باب الادلاج من المحصب" کا عنوان قائم کیا ہے۔ اور ادلاج بسکون دال اول
حصہ شب میں چلنے کو کہتے ہیں۔ اور بتشدید دال رات کے آخری حصہ میں چلنے کو۔ اور امام بخاریؒ
نے اس باب میں حضرت عائشہؓ کی یہ حدیث ذکر کی ہے اور شارحین نے اس حدیث سے دونوں
ترجمے ثابت کئے ہیں۔ بسکون دال کا حضرت عائشہؓ کے فعل سے اور بتشدید دال کا آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کے فعل سے۔ من جملہ ان کے ایک یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رات کو صبح کی نماز
مکہ میں پڑھی اور اس میں سورۂ طور کی قرأت کی، جیسا کہ بہت سی روایات میں معروف ہے۔ اور ان
کا بیان آگے آ رہا ہے۔ پس یہ صورت بہت ہی بعید ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اول شب میں
مکہ آئے ہوں، پھر محصب واپس تشریف لے گئے ہوں، اور نماز صبح کے لئے پھر مکہ آئے ہوں۔
اور یہ ثابت نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس رات دو مرتبہ مکہ گئے۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ طواف
وداع سے فارغ ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم واپس محصب تشریف لے گئے ہوں۔ اور نہ اس کی کوئی
وجہ ہے کہ محصب سے دوبارہ مکہ جائیں جب کہ آپ طواف وداع سے فارغ ہو چکے تھے۔ من جملہ

وهل دخل رسول الله صلى الله عليه وسلم البيت في حجته أم لا.

ترجمہ: اور کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس حج میں بیت اللہ شریف کے اندر داخل ہوئے یا نہیں!

ان کے ایک یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ سے مدینہ کی طرف واپسی بالاتفاق اسفل مکہ سے براستہ کدیٰ ہوئی۔ پس یہ نہایت بعید ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طواف وداع سے فارغ ہوکر محصب چلے جائیں جو اعلیٰ مکہ میں ہے۔ اور پھر اسفل مکہ سے مدینہ کی طرف واپسی کے لئے دوبارہ آئیں۔ ان کے علاوہ اور وجوہ ہیں جو حاشیہ لامع میں مفصل مذکور ہیں۔ اور حافظ ابن قیمؒ کہتے ہیں کہ پانچواں نکتہ۔

حجۃ الوداع میں بیت اللہ کے اندر تشریف لے گئے یا نہیں

اول یہ کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس حج میں بیت اللہ شریف میں داخل ہوئے یا نہیں؟ بہت سے فقہاء کا خیال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ میں داخل ہوئے اور بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ بیت اللہ میں داخل ہونا سنن حج میں سے ہے کیونکہ ان کے خیال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حج میں بیت اللہ میں داخل ہوئے تھے۔ اور ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے موقعہ پر بیت اللہ میں داخل ہوئے حج یا عمرے میں نہیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں روایات میں صرف بیت اللہ میں داخل ہونے کا ذکر ہے۔ کذا فی الہدی مختصراً

رشی: حاصل یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمرۃ القضاء کے موقعہ پر بیت اللہ میں داخل نہ ہونا متفق علیہ ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر داخل ہوئے یا نہیں۔ شیخ ابن قیمؒ نے اس کا انکار کیا ہے۔ اسی طرح ان کے شیخ حافظ ابن تیمیہؒ اور شیخ نوویؒ بھی منکر ہیں۔ اور ابن سعدؒ نے حجۃ الوداع میں آپ کا داخل ہونا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح بیہقی بھی اسی طرف مائل ہیں۔ چنانچہ انہوں نے حضرت عائشہؓ کی حدیث کو جو آگے آتی ہے۔ حجۃ الوداع پر محمول کیا ہے۔ اور اس کے الفاظ یہ ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس سے نکلے درانحالیکہ آپ بہت ہی خوش تھے۔ پھر واپس تشریف لائے تو غمگین تھے۔ پھر ارشاد فرمایا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ شاید میں نے اپنی امت پر مشقت ڈال دی" اس حدیث کو ابوداؤد، ترمذی، ابن خزیمہ اور حاکم نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اس کو صحیح کہا ہے۔ اور ابن حبان بھی اسی طرف مائل ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حج کے موقعہ پر بیت اللہ میں داخل ہوئے۔ اور محب طبریؒ نے عبداللہ بن ابی اوفیٰ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حج میں اور فتح مکہ کے موقع پر کعبہ شریف میں داخل ہوئے اور علامہ سہیلیؒ اور ابن ہمامؒ
اسی طرف گئے ہیں کہ دونوں دفعہ کا داخلہ حجۃ الوداع ہی میں ہوا تھا۔ ایک مرتبہ یوم النحر کو داخل ہوئے مگر نماز نہیں
پڑھی۔ اور اس سے اگلے دن پھر داخل ہوئے اور نماز پڑھی۔ یہ حدیث دارقطنی نے اسناد حسن یا جید سے روایت
کی ہے۔ اور بیہقی نے بھی اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ اور مرقات میں ہے کہ میرک کہتے ہیں: متعدد مرتبہ داخل
ہونے کا احتمال مسلک جمہور کے خلاف ہے۔ میں کہتا ہوں۔ جن حضرات نے حجۃ الوداع میں آپ کے داخل
ہونے کا انکار کیا ہے وہ حضرت عائشہؓ کی مذکورہ بالا حدیث کو فتح مکہ پر محمول کرتے ہیں۔ اور یہ بات بھی
بعید ہے۔ کیونکہ بیت اللہ شریف میں داخل ہونے کا افسوس اس مرتبہ کا نہیں ہو سکتا کہ فتح مکہ اور دیگر
فتوحات سے فارغ ہونے کے بعد مدینہ منورہ میں اپنے گھر تشریف لانے تک باقی رہتا۔ یہاں تک کہ فتح
مکہ اور دیگر عظیم الشان فتوحات کی مسرت پر بھی غالب آجاتا۔ اور مدینہ منورہ تشریف لاتے ہی اس غم کا اتنا
غلبہ ہوتا کہ حضرت عائشہؓ دیکھتے ہی پہچان جاتیں۔ اور فوراً اس افسوس اور غم کی وجہ دریافت کرتیں جیسا
کہ ابن ماجہ کی روایت کے الفاظ اسی کی طرف مشیر ہیں۔ کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ جب میرے پاس
سے تشریف لے گئے تھے تو خوش وخرم تھے۔ اور واپس تشریف لائے تو غمگین ہیں۔ تاہم اس سے واضح تر
الفاظ وہ ہیں۔ جو ملا علی قاری نے نقل کئے ہیں یعنی "آج میں نے ایسا کام کیا کہ اگر مجھے پہلے خیال ہوتا۔ الخ اور
یہی لفظ ابن سعد کی روایت کے ہیں۔ پس یہ روایت اس امر میں گویا نص ہے کہ بیت اللہ میں داخل ہونے کے
بعد یہ واپسی اسی دن مکہ مکرمہ میں حضرت عائشہؓ کے گھر ہوئی تھی۔ کذا فی حاشیۃ اللامع۔

بیت اللہ میں داخل ہونے کا حکم

اور اس مسئلہ پر اوجز میں خوب بسط سے کلام کیا ہے اور اس کی تحقیق
حاشیہ لامع میں دو جگہ ذکر کی ہے۔ کتاب الحج میں۔ اور کتاب المغازی
میں۔ اس میں کتاب الحج میں ہے کہ ائمہ اربعہ کی فقہی کتابوں میں بیت اللہ شریف کے داخلے کو مندوبات
میں ذکر کیا ہے۔ جیسا کہ الموفق نے المغنی میں اور نوویؒ نے مناسک اور شرح مہذب میں اسی طرح شرح
لباب ابن ہمام، صاحب نہر، صاحب درمختار اور ابن عابدین نے اس کی تصریح کی ہے۔ انہوں نے یہ
بھی تصریح کی ہے کہ بیت اللہ میں داخل ہونا مناسک حج میں شامل نہیں۔ اور شرح لباب میں ہے کہ داخل
ہونے والوں سے اجرت لینا علماء امت کے نزدیک بالاتفاق حرام ہے۔ اور یہ بھی تصریح کی ہے کہ جس
چیز کا لینا حرام ہے بلا ضرورت اس کا دینا بھی حرام ہے۔ اور یہاں کوئی ضرورت نہیں کیونکہ یہ مناسک میں نہیں۔ اھ

وهل وقف صلى الله عليه وسلم في الملتزم أم لا

ترجمہ: مسئلہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ملتزم میں کھڑے ہوئے یا نہیں۔

العروۃ الوثقی

نووی اپنے مناسک میں فرماتے ہیں: جہلاء کی اس بدعت سے دھوکا مت کھانا جو بعض اہل ضلالت نے العروۃ الوثقی کے نام سے ایجاد کی ہے کہ بیت اللہ کے دروازے کے سامنے کی دیوار میں جو بلند سی جگہ ہے اس کا نام انہوں نے العروۃ الوثقی رکھ لیا اور خیال کیا کہ جو شخص اس کو پکڑے اس نے العروۃ الوثقی کو مضبوط پکڑ لیا۔

دنیا کی ناف

اور دوسری بدعت یہ کہ بیت اللہ کے اندر جو میخ ہے اس کا نام انہوں نے دنیا کی ناف رکھ لیا اور عوام کو اس پر آمادہ کیا کہ آدمی اپنی ناف ننگی کر کے اس پر پیٹ کے بل لیٹ جائے تاکہ وہ اپنی ناف کو دنیا کی ناف پر رکھے۔ ملا علی قاری اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ یہ دونوں باطل امر جو نووی نے ذکر کئے ہیں بحمد اللہ کعبہ شریف سے ہٹا دیئے گئے ہیں۔ آخر شیخ ابن ہمام کہتے ہیں: دیوار کعبہ کی بلندی میں جگہ کو "العروۃ الوثقی" کہنا جیسا کہ عوام میں مشہور ہے ایک بے اصل بدعت ہے۔ اور بیت اللہ شریف کے درمیان کی میخ کو جس کو دنیا کی ناف کہتے ہیں اور اپنی ناف کھول کر اس پر رکھتے ہیں یہ ایک ایسے شخص کا کام ہو سکتا ہے جو علم کیا عقل سے بھی محروم ہو۔ اسی طرح ہمارے بہت سے حضرات مثلاً صاحب نور الایضاح اور صاحب در مختار نے اس بدعت کا ذکر کیا ہے۔

ملتزم پر کھڑے ہونا

مسئلہ دوم: اور کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ملتزم میں کھڑے ہوئے یا نہیں؟ صریح روایت دلالت کرتی ہے کہ آپ کا ملتزم میں کھڑا ہونا فتح مکہ کا واقعہ ہے۔ چنانچہ ابو داؤد میں عبد الرحمن بن ابی صفوان سے روایت ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کیا تو میں گیا پس میں نے دیکھا کہ آپ اور آپ کے صحابہ بیت اللہ سے نکلے، اور دروازہ شریف سے حطیم تک استلام کیا اور اپنے رخسار بیت اللہ پر رکھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے درمیان میں تھے۔ نیز ابو داؤد نے عمرو بن شعیب سے باسناد جد روایت کی ہے کہ میں نے حضرت عبد اللہ کے ساتھ طواف کیا جب ختم طواف کے بعد حجر اسود کا استلام کیا تو حجر اسود اور دروازۂ بیت اللہ کے درمیان کھڑے ہوئے اور اپنا سینہ، چہرہ، کلائیاں اور ہتھیلیاں دیوار پر اس طرح کہ ان کو خوب پھیلا دیا اور فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح کرتے

دیکھا ہے" اس میں احتمال ہے کہ یہ عمل طواف وداع کے موقعہ کا ہو یا کسی دوسرے موقعہ کا۔ لیکن حضرت مجاہدؒ اور ان کے بعد امام شافعیؒ وغیرہ اس کے قائل ہیں کہ طواف وداع کے بعد ملتزم پر کھڑا ہونا مستحب ہے" انتہیٰ۔ اور امام اکبرؒ نے بلا غبار روایت کیا ہے کہ ابن عباسؓ فرمایا کرتے تھے کہ رکن و مقام کے مابین حصہ ملتزم ہے" الخ۔ میں اس روایت پر مفصل کلام کیا ہے۔ نیز اس میں مسند الہند شاہ ولی اللہ دہلوی کی روایت سے ملتزم کے پاس قبولیت دعا کی حدیث مسلسل ذکر کی ہے۔ اور موفقؒ کہتے ہیں: "حدیث ابوداؤد کی بنا پر طواف وداع کرنے والے کے لئے ملتزم میں کھڑا ہونا مستحب ہے۔ منصور کہتے ہیں کہ میں نے حضرت مجاہد سے دریافت کیا کہ جب بیت اللہ سے وداع کا ارادہ کروں تو مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ انہوں نے جواب دیا کہ طواف بیت اللہ کے سات پھیرے کرو، مقام ابراہیم کے پیچھے دو رکعت نماز پڑھو۔ پھر چاہ زمزم پر جا کر کھڑے ہو کر پانی پیو۔ پھر ملتزم پر آ کر اس کا استلام کرو۔ پھر دعا کرو۔ اور جو حاجتیں اللہ تعالیٰ سے مانگنی ہوں مانگو۔ پھر حجر اسود کا استلام کر کے واپس آ جاؤ" اھ۔ اور نوویؒ نے اپنے مناسک میں طواف وداع کے بعد ملتزم کی دعا کو مستحب کہا ہے۔ اور ملا علی قاریؒ شرح لباب میں فرماتے ہیں: "اور وداع کا طریقہ یہ ہے کہ مسجد میں داخل ہو کر سب سے پہلے حجر اسود کا استلام کرے۔ پھر طواف کے سات پھیرے کرے۔ پھر دوگانہ طواف ادا کرے۔ پھر زمزم پر آ کر پانی پیئے اور ہو سکے تو خود پانی نکالے۔ پھر ملتزم پر حاضر ہو اور باب کعبہ پر حاضر ہو کر اس کی دہلیز کو چومے اور دعا کرے۔ یہ ترتیب جو ذکر کی ہے روایات میں یہی مشہور ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ دوگانہ طواف کے بعد ملتزم پر جائے۔ وہاں سے فارغ ہو کر زمزم پر آئے۔ اور وہاں سے واپس ہو۔ اور پہلی ترتیب زیادہ صحیح ہے۔ جیسا کہ زیلعی اور کرمانی نے اس کی تصریح کی ہے" اور ہدایہ میں ہے: "پھر مکہ میں داخل ہو اور طواف بیت اللہ کے سات پھیرے کرے۔ ان میں رمل نہ کرے۔ یہ طواف صدر ہے۔ جسے طواف وداع کہتے ہیں۔ اور طواف کی دو رکعتیں پڑھے۔ پھر زمزم پر جا کر پانی پیئے کیونکہ روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس پانی نکال کر نوش فرمایا۔ پھر پانی ڈول کنوئیں میں ڈال دیا۔ اور مستحب ہے کہ بیت اللہ شریف کے دروازے پر حاضر ہو۔ اس کی دہلیز کو بوسہ دے۔ پھر ملتزم پر آئے۔ پس اپنا سینہ اور چہرہ اس پر رکھے اور کچھ دیر تک پردہ کعبہ کو پکڑے رہے۔ پھر اپنے گھر کی طرف لوٹ آئے" اسی طرح روایت کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ملتزم پر یہ عمل کیا تھا"

(قلت) ثم خرج من سكة من طريق كُدَى

(ش) پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم براستہ کدی مکہ سے نکلے

اور بخاری کی روایت میں "نماز صبح" کا لفظ دوسرے تمام احتمالات کی تردید کرتا ہے۔

(ش) حجۃ الوداع کے سلسلہ کی دو حدیثیں باقی رہ گئیں جن کے محل کی تحقیق مجھے ابھی تک نہیں ہو سکی، اگر تفتیش کر لی جائے۔ ایک تو ابو واقد اللیثی کی روایت اپنے باپ سے وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ حجۃ الوداع میں اپنی ازواج مطہراتؓ سے فرما رہے تھے "ھذہ ثم ظہور الحصر" یعنی بس تمہارا یہ حج ہو گیا، پھر چٹائی کی پشت سے چمٹے رہنا۔ یہ حدیث امام ابو داؤد نے کتاب الحج کے آغاز میں ذکر کی ہے اور شیخ قدس سرہ نے بذل میں اس حدیث کی تشریح اور روافض کی تردید خوب شرح و بسط سے کی ہے۔ اسی طرح حافظ ابن حجرؒ اور حافظ عینی نے بھی اس حدیث پر کلام کیا ہے، مگر مجھے ابھی تک یہ تحقیق نہیں ہو سکی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں کس جگہ یہ ارشاد فرمایا تھا۔

دوسری حدیث اس کو بھی ابو داؤد ہی نے "باب من یعطی الصدقۃ وحد الغنی" میں عبید اللہ بن عدی بن خیار کی روایت سے ذکر کیا ہے، ان کا بیان ہے کہ مجھے دو شخصوں نے بتایا کہ وہ دونوں حجۃ الوداع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ صدقات تقسیم فرما رہے تھے۔ انہوں نے بھی صدقہ کا سوال کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سر سے پاؤں تک دیکھ کر محسوس کیا کہ ہم قوی اور مضبوط ہیں، پس ارشاد فرمایا، تم چاہو تو تمہیں بھی دے دوں، مگر ان صدقات میں نہ غنی کا حق ہے نہ ایسے طاقتور کا جو کسب معاش پر قادر ہو۔ یہ حدیث امام احمد، بیہقی اور دارقطنی نے بھی روایت کی ہے، اس میں حجۃ الوداع کی تصریح ہے، نیز امام طحاوی، نسائی، اور ابن ابی شیبہ نے بھی اس کو روایت کیا ہے مگر ان میں سے کسی کتاب میں تصریح نہیں ملی کہ یہ دونوں صاحب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حجۃ الوداع میں کس جگہ حاضر ہوئے تھے۔ اور یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس جگہ صدقات تقسیم فرمائے تھے۔ اس کی تفتیش کر لی جائے ۔

(ش) پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم براستہ کدی مکہ سے نکلے کُدی۔

کُدی کے راستے سے واپسی

بضم کاف وبالف مقصورہ اسفل مکہ کا نام ہے، کدی سے نکلنا جیسا اور البدایہ والنہایہ میں ذکر کیا گیا ہے اور صحیحین وغیرہ کی روایات میں معروف ہے

راستہ تبدیلی کی حکمت

حافظ کہتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس حکمت کی بنا پر بوقت واپسی راستہ تبدیل فرمایا اس میں مختلف قول ہیں۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ اس کی

واستصحب معه من ماء زمزم شیئاً

ترجمہ: اور کسی قدر ماء زمزم بھی اپنے ساتھ لیا۔

حکمت: بعض کہتے ہیں کہ سامنے سے لوگ تو آپ کے راستہ میں آئیں، اس سے برکت حاصل کریں۔ لیکن یہاں بھی کچھ وہی توجیہیں ذکر کی گئی ہیں جو عید کے بیان میں ذکر ہو چکی ہیں۔ اور عید کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے میں اسے باستیعاب وہاں ذکر کر چکا ہوں۔ ان میں بعض امور یہاں اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس میں حکمت یہ تھی کہ داخلہ کے لئے بلندی کی جانب مناسب تھی کہ اس میں مکان کی تعظیم ہے۔ اور نکلنے کیلئے نشیب کی جانب مناسب تھی کہ اس میں فراق کی طرف اشارہ ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ چونکہ ابراہیم علیہ السلام مکہ میں اسی جانب سے داخل ہوئے تھے اس لئے یہ جانب اختیار کی۔ اور بعض نے کہا ہے کہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے موقع پر مکہ سے مخفی نکلے تھے اس لئے ارادہ فرمایا کہ بلندی کی جانب سے بکمال ظہور داخل ہوں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ جو شخص کداء کی طرف سے داخل ہو اس کو بیت اللہ کا استقبال حاصل ہوتا ہے اس لئے اس جہت کو اختیار فرمایا۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ میں اس جانب سے داخل ہوئے تھے۔ اسلئے وہی معمول برقرار رکھا۔ اور پوری تفصیل وہاں دیکھ لی جائے۔

آب زمزم ساتھ لے جانا

اور البدایہ والنہایہ میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے واپسی پر کسی قدر آب زمزم بھی اپنے ساتھ لیا۔ چنانچہ ترمذی نے اپنی سند سے حضرت عائشہؓ کا یہ معمول نقل کیا ہے کہ وہ اپنے ساتھ آب زمزم لے جاتی تھیں اور فرماتی تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسے لے جاتے تھے۔ شیخ قدس سرہ کتاب میں فرماتے ہیں کہ اس میں آب زمزم لیجانے کے جواز کی دلیل ہے مگر دوسری چیزوں کو جو لے جانے سے کم ہو جاتی ہیں، وہ اس میں مکہ کا نقصان ہے۔ اس پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً مٹی کہ مٹی لے جانے میں وہاں کے مقامات میں نقص واقع ہوگا۔ اور گڑھے بن جائیں گے۔ انتہی شیخ قدس سرہ نے جو فرمایا ہے وہ بالکل واضح ہے کہ آب زمزم لے جانے سے کم نہیں ہوتا۔ چنانچہ مشاہدہ ہے کہ لاکھوں انسان اسے رات دن پیتے ہیں اور ہزاروں ڈرم ساتھ لے جاتے ہیں مگر وہ ذرا بھی کم نہیں ہوتا۔ اور دردیر نے آب زمزم بکثرت پینے اور اپنے ساتھ وطن لے جانے کو مستحبات میں ذکر کیا ہے۔ اور شرح لباب میں ہے کہ آب زمزم

(وقال: ثم ارتحل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم راجعا الی المدینة (قلت): فلما
وصل غدیر خم خطب صلی اللہ علیہ وسلم وذکر فیها فضل علی رضی اللہ عنہ

ترجمہ: (رق) پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کی طرف واپسی کے لئے روانہ ہوئے (رش) پس
جب غدیر خم پہنچے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اور اس میں حضرت علیؓ کی فضیلت بیان فرمائی۔

کا وطن لے جانا مستحب ہے، تاکہ بندگان خدا اس سے برکت حاصل کریں۔ اس پر ترمذی کی مذکورہ بالا
روایت دلیل میں پیش کی ہے۔ اور غیر ترمذی میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کو ساتھ لے جاتے
تھے، مریضوں کو پلاتے اور ان پر چھڑکتے تھے اور حسن و حسین کی تحنیک بھی اسی کے ساتھ فرمائی تھی۔
میں کہتا ہوں کہ روایات میں یہ بھی آتا ہے، جیسا کہ کنز العمال میں ہے کہ آپ نے زمزم کا ہدیہ مانگنے کا حکم فرمایا۔
اور یہ بحث طواف زیارۃ کے بیان میں گذر چکی ہے کہ آب زمزم تمام پانیوں سے افضل ہے۔

خطبۂ غدیر خم

(رق) پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۱۸ ذی الحجہ چہارشنبہ (بدھ) کی صبح کو مدینہ
کی طرف واپسی کے لئے روانہ ہوئے (رش) پس جب غدیر خم پہنچے۔ حموی کہتے ہیں:
غدیر بفتح اول وکسر ثانی۔ اور غدیر خم مکہ اور مدینہ کے درمیان ہے۔ اس کے اور جحفہ کے درمیان دو میل
کا فاصلہ ہے۔ اور خم کے بیان میں کہتے ہیں: زمخشری کا قول ہے کہ خم دراصل ایک رنگریز آدمی کا نام
تھا، اس کی طرف یہ تالاب منسوب ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ وہ جحفہ سے تین میل پر ہے۔ اور صاحب مشارق
کہتے ہیں: اور خم ایک جگہ ہے جہاں چشمہ بہتا ہے۔ تالاب اور چشمے کے درمیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کی مسجد ہے۔ اور حازمی کہتے ہیں: خم مکہ اور مدینہ کے مابین جحفہ کے پاس ایک وادی کا نام ہے جہاں ایک
تالاب ہے، اس کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا تھا۔ اور حموی نے غدیر اور خم کی وجہ تسمیہ
میں اقوال بسط سے ذکر کئے ہیں۔ اور شیخ الحسین بن عبد الحمید عباسی نے "لمعۃ الانجاد" میں ذکر کیا ہے کہ اسدی
کہتے ہیں: جحفہ سے تین میل پر راستے کی بائیں جانب چشمے کے برابر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد ہے۔
اور اس کے پاس ہی ایک بن ہے، یہی غدیر خم ہے۔ اور یہ جحفہ سے چار میل ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہی قصہ ہے
جس کے نیچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منزل کی، اور وہاں درخت کے نیچے ظہر کی نماز پڑھی اور حضرت
علیؓ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: اے اللہ جس کا میں دوست ہوں علی بھی اس کے دوست ہیں۔ الخ۔ اھ۔
تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اور اس میں حضرت علیؓ کی فضیلت بیان فرمائی۔ صاحب الہدایہ

والنہایہ کہتے ہیں: "فصل: اس حدیث کے ذکر میں جو حضرت علیؓ کی فضیلت پر دلالت کرتی ہے: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع سے واپسی پر مکہ اور مدینہ کے درمیان جحفہ کے قریب ایک جگہ میں - جو غدیر خم کہلاتی ہے خطبہ دیا، اس میں حضرت علیؓ کی فضیلت بیان فرمائی اور بعض اہل یمن جو آپ کے ساتھ تھے ان کے اعتراضات سے ان کی برأت ظاہر فرمائی۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ حضرت علیؓ نے ان سے عدل و انصاف کا معاملہ کیا تھا جس کو ان میں بعض نے ظلم، تنگی اور بخل سمجھا، حالانکہ اس معاملہ میں علیؓ حق بجانب تھے۔ اس سبب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہاں مناسک سے فارغ اور مدینہ کی طرف واپس ہوتے ہوئے راستہ میں اس کو بیان فرمایا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بروز اتوار ۱۸ ذی الحجہ ۱۰ھ کو غدیر خم میں ایک درخت کے نیچے ایک عظیم الشان خطبہ دیا جس میں بہت سی چیزیں ذکر فرمائیں۔ اور حضرت علیؓ کے فضل کمال، حسن و انصاف اور آپ سے ان کی قرابت کو بیان فرمایا۔ جس سے بہت سے لوگوں کے دل میں جو شکوک و شبہات تھے وہ زائل ہو گئے۔ ہم یہاں ان منتخب احادیث کو ذکر کرتے ہیں جو اس سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں۔ اور یہ بھی بیان کریں گے کہ ان میں کون سی صحیح ہے اور کونسی ضعیف۔ نیز یہ بتائیں گے کہ شیعہ کے لئے ان میں کوئی حصہ نہیں، نہ ان کے باطل مدعا پر کوئی دلیل و حجت ہے۔" اس کے بعد صاحب البدایہ والنہایہ نے ان روایات کو ذکر کیا ہے۔ اور ان میں سے بیشتر روایات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے: "من کنت مولاہ فعلیؓ مولاہ" (جس کا میں دوست ہوں علیؓ بھی اس کے دوست ہیں)

اور مشکوٰۃ میں بروایت احمد براء بن عازبؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب غدیر خم میں اترے تو حضرت علیؓ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: کیا تمہیں علم نہیں کہ مجھے اہل ایمان سے ان کی جانوں سے بھی زیادہ قرب و تعلق ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا: بے شک۔ اس پر آپ نے فرمایا: اے اللہ! جس کا میں دوست ہوں علیؓ بھی اس کے دوست ہیں۔ اے اللہ! جو شخص علیؓ کو دوست رکھے تو اس کو دوست رکھ، اور جو شخص اس سے دشمنی کرے تو اس سے دشمنی کر۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حضرت علیؓ سے ملاقات ہوئی تو ان سے فرمایا: اے ابن ابی طالب! تمہیں مبارک ہو کہ تم صبح و شام یعنی ہر وقت و ہر حال ہر مومن مرد و عورت کے محبوب اور دوست ہو گئے۔" اھ

ملا علی قاری کہتے ہیں: "شیعہ نے اس سے استدلال کیا ہے کہ یہ حدیث حضرت علیؓ کی خلافت پر نص صریح ہے، چنانچہ ان کا کہنا ہے کہ یہاں مولیٰ کے معنی اولیٰ بالامامت یعنی خلافت کا سب سے زیادہ مستحق کے ہیں۔

دوسرے لوگوں کو اس طرح جمع کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اور یہ ان کے خیال میں ان کا سب سے قوی استدلال ہے۔
علمائے اہلسنت نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ مولیٰ بمعنی محبوب ہے۔ بلاشبہ حضرت علیؓ ہمارے آقا اور محبوب
ہیں۔ اور مولیٰ کے کئی معنی ہیں۔ اور ان میں جملہ ناصر وغیرہ ہیں۔ لہٰذا یہ حدیث ان کے مدعا پر نص بھی نہیں ہو چہ جائیکہ
اسے نص صریح کہا جائے۔ اگر بالفرض اس کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہاں مولیٰ کے معنی اولیٰ بالامامت ہیں تو اس سے
مراد فی الحال نہیں بلکہ فی المآل ہے۔ ورنہ لازم آئے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں بھی امام وہی ہوں۔
اس سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ حدیث سے مقصود یہ ہے کہ جب ان کی خلافت کے لئے عقد بیعت ہوگا اس وقت
وہ سب سے احق ہوں گے۔ لہٰذا یہ خلفائے ثلاثہ کی تقدیم کے منافی نہیں۔ کیا ان کی تقدیم پر تمام قابل ذکر لوگوں کا
حتیٰ کہ خود حضرت علیؓ کا بھی اجماع ہے۔ مزید برآں یہ کہ حضرت علیؓ نے اپنے دور خلافت تک کبھی اس حدیث
سے استدلال نہیں فرمایا۔ آپ کی خاموشی ہر صاحب علم و عقل کے آدمی کے نزدیک بھی اس امر میں فیصلہ کن ہے کہ
حضرت علیؓ کے نزدیک یہ حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کی خلافت بلافصل پر نص نہیں جیسا کہ
خود حضرت علیؓ تصریح فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ ان کی خلافت کی تصریح فرمائی نہ کسی دوسرے کی۔
علاوہ ازیں یہ کہ یہ حدیث خبر واحد ہے اور پھر اس کی صحت میں مختلف فیہ ہے لہٰذا جب شیعوں کا اس اصول پر اتفاق
ہے کہ احادیث امامت میں تواتر شرط ہے تو انہیں اپنے اصول کے خلاف اس حدیث سے استدلال کی جرأت کیسے
ہوئی! اس کو نص صریح اور کلام قطعی کے سوا اور کیا نام دیا جاتا ہے۔ اھ۔

اور مختصر التحفۃ میں مسلمانوں کی اعیاد کے بیان میں عید فطر اور عید الاضحیٰ کو ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اور
شیعہ نے ایک تیسری عید اختراع کر رکھی ہے جس کو وہ عید الغدیر کا نام دیتے ہیں جس کا سبب آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کا غدیر خم میں حضرت علیؓ سے مؤاخات قائم کرنا ہے۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
حجۃ الوداع سے واپس ہوئے تو غدیر خم میں اترے اور صحابہ کرام کے درمیان مؤاخات قائم کی مگر حضرت علیؓ کے
ساتھ کسی صحابی کی مؤاخات قائم نہیں کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محسوس فرمایا کہ ان میں اس کی وجہ سے
شکستگی پائی جاتی ہے۔ تو انہیں اپنے ساتھ ملایا۔ اور فرمایا کیا تم اس پر راضی نہیں کہ تم کو مجھ سے وہی
مرتبہ ہو جو ہارون علیہ السلام کا موسیٰ علیہ السلام سے تھا۔ مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ اور آپ نے صحابہ کی طرف
متوجہ ہو کر فرمایا جس کا میں دوست ہوں اس کا علیؓ دوست ہے۔ یہ واقعہ ماہ ذی الحجہ کی اٹھارہ تاریخ کا ہے۔ شیعہ اس عید
کو ساری رات نماز پڑھتے اور اس کی صبح کو زوال سے قبل دو رکعتیں پڑھتے ہیں۔ اور اس عید میں کپڑے

ہمیشہ غلام آزاد کرنا۔ بکرے یا اونٹ ذبح کرنا اور اپنے پرائے سب سے الفت و اکرام سے پیش آنا ان کا شعار ہے۔ اور شعراء وغیرہ ان کے حجروں کو عید کی مبارک باد دیتے ہیں" انتہیٰ۔

میں کہتا ہوں کہ صاحب صبح الاعشیٰ نے اس عید کا سبب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ کرام کے درمیان مواخات قائم کرنا جو ذکر کیا ہے میں اس کے سمجھنے سے قاصر ہوں۔ کیونکہ مواخات کا واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دو مرتبہ پیش آیا۔ اول مکہ میں، جب کہ صرف مہاجرین کے درمیان حق و غم خواری کے لئے مواخات قائم فرمائی۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے درمیان اور حضرت علیؓ اور خود اپنی ذات کے درمیان مواخات فرمائی۔ اسی طرح قسطلانی نے کچھ اور مہاجرین کے نام بھی ذکر کئے ہیں، جن کے درمیان مواخات فرمائی۔ دوم: ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں۔ قسطلانی کہتے ہیں: "جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو حضرت انس بن مالکؓ کے گھر میں مہاجرین و انصار کے درمیان ہمدردی و غم خواری کے لئے مواخات قائم کی۔ اور وہ دو شخص ہیں اس مواخات کی بنا پر ایک دوسرے کے وارث ہوتے تھے" جیسا کہ حاشیہ بخاری میں قسطلانی سے نقل کیا ہے۔ میرے نزدیک اس خطبہ کا سبب یہ ہے کہ بعض صحابہؓ خصوصاً اہل یمن نے حضرت علیؓ سے بے التفاتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ چنانچہ امام بخاری نے "بعث علی الی الیمن قبل حجۃ الوداع" کے ذیل میں حضرت بریدہؓ کی یہ حدیث روایت کی ہے کہ: "میں حضرت علیؓ سے بغض رکھتا تھا۔ ایک بار انہوں نے غسل کیا تو میں نے از راہ اعتراض حضرت خالدؓ سے کہا: ان کو دیکھتے ہو؟ پس جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو میں نے آپ سے اس کا تذکرہ کیا" الحدیث۔ اور البدایہ والنہایہ میں حضرت بریدہؓ سے مروی ہے کہ میں حضرت علیؓ کے ساتھ جہاد کے لئے یمن گیا، پس میں نے ان سے کچھ بے وفائی و جفا محسوس کی۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو تنقیص کے انداز میں حضرت علیؓ کا ذکر کیا۔ میں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ انور متغیر ہو گیا۔ آپ نے ارشاد فرمایا: اے بریدہ! کیا مجھے تمام مومنوں سے ان کی جان سے بھی زیادہ تعلق نہیں؟ میں نے عرض کیا: بے شک۔ آپ نے فرمایا: جس کا میں دوست اور محبوب ہوں علیؓ بھی اس کے دوست اور محبوب ہیں۔" یہ حدیث نسائی نے ابو داؤد حرانی سے اسی طرح روایت کی ہے۔" اور شیخ ابن حجر مکیؒ نے "الصواعق المحرقہ" میں شیعہ کے استدلال پر جو انہوں نے امام المرتضیٰ والمناقب امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی خلافت بلا فصل پر اس حدیث سے کیا ہے، خوب رد کیا ہے اور اس کا کچھ حصہ مشکوٰۃ کے اردو ترجمہ کے

فاخرجت امرأة من محفتها صبیا لها فقالت الهذا حج فقال نعم ولك اجره

ترجمہ: پس ایک عورت نے اپنے ہودج سے اپنا بچہ نکالا اور عرض کیا کہ کیا اس کا بھی حج ہو سکتا ہے؟ فرمایا: ہاں، اور ثواب تجھے ہوگا۔

بعید ہے۔ کیونکہ بظاہر یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج میں شرکت کے بعد واپس آ رہے ہوں گے الا یہ کہ کہا جائے کہ انہوں نے اس سال حج ہی نہیں کیا تھا۔ بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حج سے واپسی پر آپ سے ملے تھے۔ پس ایک عورت نے اپنے ہودج سے اپنا بچہ نکالا اور عرض کیا کیا اس کا بھی حج ہو سکتا ہے؟ فرمایا ہاں، اور ثواب تجھ کو ہوگا۔ مخفی نہ رہے کہ عورتوں کا مرکب ہودج کی طرح ہوتا ہے مگر اس پر قبہ نہیں ہوتا۔ کذا فی البذل۔

بچے کے حج کے مسائل: اوجز میں اس حدیث کے ذیل میں بچے کے حج کے مسائل بڑی تفصیل سے ذکر کئے ہیں اس کا خلاصہ حاشیہ لامع میں ان الفاظ میں مذکور ہے: "اس میں چند فصول میں کلام ہے۔ اول: بچوں کے ساتھ حج کرنا مشروع ہے۔ ائمہ اربعہ اور جمہور اسی کے قائل ہیں۔ قاضی عیاض کہتے ہیں علماء کے درمیان اس کے جواز میں کوئی اختلاف نہیں۔ اس کو صرف اہل بدعت کے ایک ناقابل التفات گروہ نے ممنوع کہا ہے۔ ان کا یہ قول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل، صحابہ کے عمل اور اجماع امت سے مردود ہے۔"

دوم: اس کا حج منعقد ہوتا ہے یا نہیں؟ اور کیا اس پر احکام حج جاری ہوتے ہیں یا نہیں؟ جمہور کا قول ہے بچے کے ذمہ فدیہ اور دم جبر لازم ہے۔ اور اس پر بالغ کے تمام احکام جاری ہوتے ہیں۔ اس میں امام ابو حنیفہؒ کا اختلاف ہے وہ فرماتے ہیں کہ ممنوعات احرام میں کوئی جزا اس پر لازم نہیں آتی۔ اور اسی سے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ حنفیہ کے نزدیک بچے کا حج منعقد ہی نہیں ہوتا۔ صحیح یہ ہے کہ ان کے نزدیک اس کا حج نفل منعقد ہوتا ہے۔

سوم: کیا اس کے ذمہ جزا اور کفارات لازم ہیں؟ ابن بطال کہتے ہیں کہ اس کے ذمہ جزا، فدیہ اور کفارات لازم ہیں، یہ ائمہ ثلاثہ اور جمہور کا قول ہے۔ اور حنفیہ کو اس سے اختلاف ہے۔ میں کہتا ہوں کہ صحیح یہ ہے کہ کفارات کے ساقط کرنے میں حنفیہ متفرد نہیں بلکہ بعض حالات میں ائمہ ثلاثہ اور ابن حزم بھی اپنی ظاہریت کے باوصف ان سے موافقت کرتے ہیں۔

(وقلت) وأناخ راحلته بالبطحاء فبات بها وصلى بها۔

ترجمہ: (رش) اور آپ نے بطحاء میں اپنی اونٹنی بٹھائی پس وہاں رات رہے اور نماز پڑھی۔

چہارم: ائمہ اربعہ کے نزدیک بچے کو اسکے حج اور دیگر حسنات پر ثواب ہوتا ہے۔ اس میں کسی ایسے شخص کا اختلاف نہیں جس کا قول قابل اتباع ہو۔ البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ اس کی حسنات صرف اسی کے لئے ہوتی ہیں۔ ماں باپ کو ان میں سے کچھ نہیں ملتا؟ یا یہ کہ ماں باپ کو پورا ثواب ملتا ہے۔ اور بچے کے اجر میں بھی کمی نہیں کی جاتی۔

پنجم: کیا اس کا حج، حج فرض کی جگہ کفایت کرے گا؟ ائمہ اربعہ کا اجماع ہے کہ کفایت نہیں کرے گا۔ بلکہ بالغ ہونے کے بعد اسے حج کرنا ہوگا۔ ظاہریہ کا قول ہے کہ یہی کافی ہے۔

ششم: بچے کی طرف سے کون سا ولی احرام باندھے؟ اس میں وسیع اختلاف ہے۔

ہفتم: اگر بچہ دوران حج بالغ ہو جائے تو کیا کرے؟ اور کیا اس کا حج فرض ادا ہو جائے گا؟ اس میں بھی طویل کلام ہے۔ جو اوجز میں مفصل مذکور ہے۔ حاشیہ لامع کا خلاصہ ختم ہوا۔

بطحاء میں رات گذارنا

(رش) اور آپ نے بطحاء ذی الحلیفہ میں اپنی اونٹنی بٹھائی۔ پس وہاں رات رہے اور نماز پڑھی۔ اور موطا میں ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطحاء ذی الحلیفہ میں پڑاؤ کیا پس وہاں نماز پڑھی۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ حج سے واپسی میں کسی کے لئے مناسب نہیں کہ اس منزل میں نماز پڑھے بغیر یہاں سے تجاوز کرے۔ الخ۔ اور اوجز میں ہے کہ راوی کا قول "پس نماز پڑھی" یعنی جب اپنے حج سے واپس ہوئے۔ باجیؒ کہتے ہیں کہ واپسی کی تخصیص اس بنا پر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف واپسی میں یہاں پڑاؤ کیا تھا۔ اھ۔

میں کہتا ہوں کہ بخاری میں حدیث المساجد میں ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب عمرہ کے لئے تشریف لے جاتے تو ذی الحلیفہ میں فروکش ہوتے۔ اور جب حج کیا تب بھی ذی الحلیفہ میں ٹھہر گئے۔ اور جب کسی غزوہ سے واپس آتے [اور ذوالحلیفہ راستے میں واقع ہوتا] یا حج و عمرہ سے واپس آتے تو وہاں بطن وادی میں اترتے۔ اور جب وادی کے نشیب سے اوپر چڑھتے تو اس بطحاء میں جو وادی کے مشرقی کنارے پر واقع ہے، رات کو پڑاؤ کرتے اور صبح تک وہاں قیام کرتے۔ الی آخر الحدیث۔ اور بخاری شریف میں کتاب الحج کے آخر میں ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ کیطرف

(قال) ودخل صلى الله عليه وسلم المدينة من طريق المعرس (قلت) فلما طلع له أحد

فقال هذا أجبل يحبنا ونحبه

ترجمہ (ق) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں براہ معرس داخل ہوئے (ش) پس جب جبل احد آپ

کے لئے نمودار ہوا تو فرمایا: یہ وہ پہاڑ ہے جسے ہم سے محبت ہے اور ہمیں اس سے محبت ہے۔

تشریف لے جاتے تو مسجد شجرہ میں نماز پڑھتے اور جب واپس آتے تو ذوالحلیفہ میں بطن وادی میں نماز پڑھتے،
اور وہاں صبح تک رات رہتے" اور اوجز میں ہے کہ قاضی کہتے ہیں کہ حج سے واپسی میں بطحا ذوالحلیفہ
میں اترنا مناسک حج میں سے نہیں، اہل مدینہ میں سے جو حضرات اس پر عامل تھے ان کا مقصد محض آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار سے برکت حاصل کرنا تھا اور اس لئے بھی کہ یہ بطحا بابرکت ہے۔ اور امام مالک
نے یہاں اترنے اور نماز پڑھنے کو مستحب قرار دیا ہے کہ بغیر نماز پڑھے آگے نہ بڑھے۔ اور اگر نماز کا وقت
نہ ہو تو یہاں ٹھہرے یہاں تک کہ نماز کا وقت داخل ہو جائے۔ اور کہا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے یہاں اس لئے منزل کی تھی تاکہ لوگ اپنے گھروں میں رات کو اچانک نہ جائیں جیسا کہ احادیث مشہورہ
میں اس سے صراحۃً ممانعت آئی ہے۔ یہ نووی نے کہا ہے" امام احمد اور امام نسائی کے انداز سے معلوم
ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ قصہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ جانے کا ہے، واپسی کا نہیں کیونکہ انہوں نے یہ
حدیث مبادی احرام میں ذکر کی ہے۔

مدینہ میں براہ معرس داخلہ

(ق) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں براہ معرس واپسی کے وقت
داخل ہوئے۔ مُعَرَّس بضم میم فتح راء بتشدید دو جملتین۔ یہ مکہ سے مدینہ
آنے والے راستہ پر ایک معروف جگہ ہے، جو ذی الحلیفہ سے نیچے اور اس کی نسبت مدینہ سے قریب تر
ہے۔ کذا فی الزرقانی۔

جبل احد سے محبت

(ش) پس جب جبل احد آپ کے سامنے نمودار ہوا تو فرمایا: یہ وہ پہاڑ ہے
جو ہم سے محبت رکھتا ہے اور ہم اس سے محبت رکھتے ہیں۔ اوجز میں ہے کہ
زرقانی کہتے ہیں "یعنی جب خیبر سے نکلے تو یہ ارشاد فرمایا"۔ میں کہتا ہوں کہ روایات میں بھی معروف ہے
جو کہ زرقانی نے کہا، اور حافظ کہتے ہیں کہ بخاری کی ایک روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم نے یہ ارشاد اس وقت فرمایا تھا جب کہ حج سے واپسی میں اس پر نظر پڑی۔ اور ابو حمید کی حدیث

(وقال قد خل صلی اللہ علیہ وسلم قائلا آئبون تائبون عابدون ساجدون لربنا

حامدون صدق اللہ وعدہ ونصر عبدہ وہزم الاحزاب وحدہ .....

ترجمہ: (ق) اور پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا پڑھتے ہوئے داخل ہوئے: آئبون، تائبون، عابدون،

ساجدون، لربنا حامدون صدق اللہ وعدہ ونصر عبدہ وہزم الاحزاب وحدہ

میں ہے کہ آپ نے یہ ارشاد غزوۂ تبوک سے واپسی پر فرمایا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ارشاد کئی بار فرمایا۔ اھ
یہ حدیث امام مالک نے موطا میں تحریم المدینہ میں ذکر کی ہے۔ امام نووی کہتے ہیں ارشاد نبوی "اس کو ہم سے
محبت ہے" حقیقت پر محمول ہے جیسا کہ ایک جماعت نے اس کو راجح کہا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے اس کو اسی طرح خطاب فرمایا جس طرح ذی عقل سے کیا جاتا ہے، چنانچہ فرمایا: "اے احد! ٹھہر جا"
پس اللہ تعالیٰ نے اس میں محبت ودیعت فرمائی جس طرح داؤد علیہ السلام کے ساتھ پہاڑوں میں
تسبیح پیدا فرمائی۔ اور جس طرح ان پتھروں میں خشیت پیدا فرمائی جن کے بارے میں ارشاد ہے "اور
بے شک بعض پتھر گر جاتے ہیں اللہ کے خوف سے" اور جس طرح اسطوانہ میں بچے کی طرح رونے کی
تخلیق فرمائی، وغیرہ ذالک۔ اور ارشاد نبوی "ہم اس سے محبت رکھتے ہیں" بھی حقیقت پر محمول ہے۔
کیونکہ جو محبت کرے اس کی جزا یہی ہے کہ اس سے محبت کی جائے۔ نیز اس لئے کہ وہ جنت کے پہاڑوں
میں سے ہے جیسا کہ مسند احمد کی روایت میں ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ یہاں مضاف محذوف ہے یعنی
اہل احد انصار ہم سے محبت کرتے ہیں۔ احد جبل کے ہمسایے تھے۔ انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے
محبت تھی۔ اور آپ کو ان سے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سفر سے واپس تشریف
لاتے تو چونکہ جبل احد بزبان حال آپ کو قرب اہل کی بشارت دیتا تھا پس آپ اس کو دیکھتے ہی سفر سے
واپسی اور اہل کے قرب سے مسرور ہو جاتے۔ اس کو محبت سے تعبیر فرمایا۔ پھر او حد میں جبل احد جبل
رحمت (؟) ہو ... جبل ابی قبیس اور جبل طور جس پر موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہوئے۔

کے ... تفصیل پر مختصر سا کلام کیا ہے۔ (ق) پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا پڑھتے ہوئے مدینہ

مدینہ میں داخل ہو گئے دوبار | جیسے ہیں داخل ہوئے!

آئبون، تائبون، عابدون، ساجدون	ہم رجوع کرنے والے توبہ کرنے والے عبادت کرنے والے سجدہ کرنے والے
لربنا حامدون، صدق اللہ وعدہ	اور اپنے رب کی حمد کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ
ونصر عبدہ، وہزم الاحزاب وحدہ	سچا کر دکھایا، اپنے بندے کی مدد فرمائی۔ اور تمام لشکروں

لشکروں کو تنہا شکست دے دی۔

ان عمرة فی رمضان تعدل حجة معی۔

ترجمہ: کہ رمضان میں عمرہ کرنا میرے ساتھ حج کرنے کے مساوی ہے۔

کرنے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس کی روایت میں اضطراب ہے اور اس کا اس کے نزدیک یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ یہ قصہ دو اشخاص میں پیش آیا۔ اھ

میں کہتا ہوں کہ ابوداؤد نے ام معقل کا قصہ مختلف طرق اور روایات سے ذکر کیا ہے اور شیخ نے بذل میں اس موقعہ پر لکھا ہے کہ اس حدیث میں بہت ہی اضطراب ہے۔ اور اضطراب کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ میں نے نہیں دیکھا کہ کسی نے اس اشکال کو رفع کرنے سے تعرض کیا ہو۔ بجز اس کے جو مولانا محمد یحییٰ مرحوم نے اپنے شیخ کے افادات سے نقل کیا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں: "قصہ ام معقل کی روایات متعدد ہیں۔ ان روایات میں تطبیق یوں ہو سکتی ہے کہ ابو معقل کے پاس ایک اونٹ سواری کے لئے تھا اور ایک زراعت کے لئے۔ الخ" پوری تفصیل بذل میں دیکھ لی جائے۔ اور حافظؒ ام سنانؓ کا قصہ ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اسی نوعیت کا قصہ ام معقل کا بھی ہے جو نسائی اور ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ دو قصے الگ الگ ہیں۔ یہ دو عورتوں کو پیش آئے۔ اور اسی قسم کا ایک قصہ ام طلیق کا ہے جو ابن السکن اور ابن مندہ نے نقل کیا ہے۔ ابن عبدالبر کا خیال ہے کہ ام معقل اور ام طلیق ایک ہی عورت کے دو نام ہیں۔ مگر ان کا خیال محل نظر ہے کیونکہ ابو معقل کا انتقال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوا اور ابو طلیق آپؐ کے بعد مدت تک زندہ رہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں عورتیں جدا جدا ہیں۔ نیز دونوں روایتوں کے سیاق کا مختلف ہونا بھی ان کے تغایر پر دلالت کرتا ہے۔ اور بخاری میں حضرت ابن عباسؓ کی حدیث میں انصار کی ایک عورت کا جو لفظ مبہم واقع ہوا ہے اس کی تفسیر ام سنان یا ام سلیم ہی کے ساتھ کرنا ناگزیر ہے۔ کیونکہ حدیث ابن عباسؓ کا قصہ دوسری احادیث کے قصہ سے مختلف ہے۔ نیز ابن عباسؓ کی حدیث میں اس عورت کو "انصاریہ" کہا گیا ہے۔ جبکہ ام معقل کا تعلق بنو اسد سے ہے۔ اور یہی واقعہ ہیثم کو بھی پیش آیا۔ واللہ اعلم۔ انتہی۔

رمضان کا عمرہ حج کے برابر ہے

ارشاد نبوی کہ "رمضان میں عمرہ کرنا میرے ساتھ حج کرنے کے مساوی ہے" یعنی "میرے ساتھ" کا لفظ بعض روایات میں نہیں۔ مگر ابوداؤد کی روایت میں موجود ہے۔ اور امام بخاری نے بھی باب حج النساء میں یہ لفظ ذکر کئے ہیں! ...

"تقضی حجۃ او حجۃ معی" یعنی بدل ہے حج کا یا فرمایا میرے ساتھ کے حج کا۔ اور ابن حجرؒ کی شرح مناسک نووی میں رمضان کے عمرہ کی فضیلت میں ابن حبان وغیرہ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ "رمضان میں عمرہ کرنا میرے ساتھ حج کرنے کے برابر ہے۔" اور اوجز حاشیہ لامع میں ہے کہ کرمانی کہتے ہیں: "اگر تم کہو کہ حدیث کا تقاضا بظاہر یہ ہے کہ جو عمرہ رمضان میں ادا کیا جائے وہ حجۃ الاسلام (حج فرض) کے قائم مقام ہے۔ تو کیا واقعی رمضان کے عمرہ سے حج فرض ادا ہو جاتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ حدیث کے معنی یہ ہیں کہ ثواب میں حجۃ الاسلام کی مثل ہے اور قائم مقام نہ ہونے کا قرینہ اجماع ہے۔ اور ترمذیؒ نے اسحاق بن راہویہؒ سے نقل کیا ہے کہ اس حدیث کا مضمون اس حدیث کی نظیر ہے جس میں آتا ہے کہ قل ھو اللہ احد یعنی سورۂ اخلاص تہائی قرآن کے برابر ہے۔" ابن عربی کہتے ہیں: "فضیلت عمرہ کی حدیث اللہ تعالیٰ کا فضل و انعام ہے۔ پس عمرہ کے ساتھ رمضان مبارک مل جائے تو وہ حج کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔" ابن جوزیؒ کہتے ہیں: "یہ حدیث اس امر کی دلیل ہے کہ عمل میں شرف وقت کے شامل ہونے سے اس کے ثواب میں اضافہ ہو جاتا ہے، جس طرح حضور قلب اور خلوص نیت سے اضافہ ہوتا ہے۔" ابن التینؒ کہتے ہیں کہ "عمرہ کے حج کی مثل ہونے میں احتمال ہے کہ وہ اپنے باپ پر ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ رمضان کی برکت سے ہو۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ شرف صرف اس عورت کے ساتھ مخصوص ہو، جیسا کہ بعض سلف سے منقول ہے۔ چنانچہ سعید بن جبیرؒ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہم تو اس فضیلت کو صرف اسی خاتون کے ساتھ مخصوص سمجھتے ہیں۔" اور سنن ابوداؤد میں ام معقلؓ سے روایت ہے کہ "حج ہے اور عمرہ ہے، لیکن میں نہیں جانتی کہ یہ صرف میرے لئے ہے یا سب لوگوں کے لئے؟" مگر ظاہر یہی ہے کہ اسے عموم پر محمول کیا جائے۔" اور علامہ عینیؒ نے تفصیل سے ان حضرات صحابہؓ کے اسماء گرامی ذکر کئے ہیں جن سے یہ حدیث مروی ہے۔ چنانچہ اس حدیث کو بروایت ترمذی شریف ام معقلؓ سے نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں اور اس باب میں ابن عباسؓ، جابرؓ، ابوہریرہؓ، انسؓ اور وہب بن خنبشؓ سے احادیث مروی ہیں (یہ نام تو امام ترمذیؒ نے ذکر کئے ہیں) اور علامہ عینیؒ نے اس پر یوسف بن عبداللہ، ابو طلیقؓ اور ام طلیقؓ کے ناموں کا اضافہ کیا ہے۔ اور عینیؒ نے ان روایات کی تخریج تو بسط سے کی ہے۔ اور ان میں سے بہت سی روایات میں کسی مخصوص عورت کا ذکر کئے بغیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے کہ رمضان کا عمرہ

حج کے برابر ہے۔ حافظ کہتے ہیں: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنے عمرے کئے اشہر حج میں کئے،
اور حدیث الباب سے رمضان کے عمرہ کی فضیلت ثابت ہوتی ہے پس ان دونوں میں سے افضل
کونسا ہوا؟ (اشہر حج کا عمرہ یا رمضان کا) بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دوسروں کے لئے تو رمضان ہی
کا عمرہ افضل ہے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں وہی افضل تھا جو آپ نے کیا کیونکہ اہل جاہلیت
کے نزدیک اشہر حج میں عمرہ ممنوع تھا۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قولاً و عملاً ان کی تردید کا
قصد کیا۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل اس کے بیان جواز کے لئے تھا۔ بنا بریں اگر دوسروں کیلئے
مکروہ بھی ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں وہی افضل تھا۔ حاشیہ لامع کا مضمون ختم ہوا۔

خاتمۂ رسالہ

میں نے ان چند اوراق میں جن مضامین کے ذکر کرنے کا ارادہ کیا تھا یہاں ان کا اختتام ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی حمد و توفیق سے
بروز جمعہ ۱۰/ ماہ مبارک ربیع الاول کی صبح کو اسی سال اس سے فراغت ہوئی، جو آغاز رسالہ
میں ذکر کیا گیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہی رشد و صواب کی طرف راہنمائی کرنے والا ہے۔ پس اللہ سبحانہ و
تعالیٰ کی حمد اور حسن توفیق سے ایک دن رات اور نصف رات میں یہ رسالہ مکمل ہوا۔ البتہ حواشی کا اضافہ
متفرق اوقات میں ہوتا رہا۔ اس رسالہ کی تالیف جیسا کہ آغاز رسالہ میں ذکر کیا جا چکا ہے ۱۳۲۱ھ
میں ہوئی تھی، پس جب کبھی ماخذ و مراجع کی ضرورت پیش آتی تو متقدمین کی شروح حدیث اور کتب
مشہورہ مثلاً فتح الباری، عینی وغیرہ کا حوالہ دے دیتا تھا۔ اور طویل عبارتوں کو نقل کرنے کی بجائے صرف
حوالہ پر کفایت کرتا۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے مجھے اوجز المسالک، الکوکب الدری اور لامع الدراری کی
تالیف کی توفیق عطا فرمائی اور ان میں یہ عبارات اور نقول سب جمع ہو گئیں تو اس رسالہ میں صرف ان کے
حوالے اور اقتباس پر اکتفا کیا تاکہ مراجعت میں سہولت ہو۔ اور جب بعض احباب کے اصرار پر اس
رسالہ کی طباعت کا ارادہ ہوا تو چونکہ ضعف بصر کی بنا پر خود مراجعت سے معذور تھا۔ اس لئے عزیزان
مولوی محمد عاقل استاذ حدیث مظاہر العلوم سہارنپور اور عزیز زادہ مولوی محمد سلمان مدرس مدرسہ
مظاہر العلوم نے اس کو پڑھا، رسالہ کے بین السطور اور حاشیہ میں جن احادیث و عبارات کی طرف اشارات
تھے میں نے ان دونوں عزیزوں سے ان کے نقل کرنے کی فرمائش کی چنانچہ ایک پڑھتا رہا اور دوسرا نقل
کرتا رہا۔ اور میں سنتا رہا، پس میں نے تنقیح اور اختصار کے ساتھ ان عبارات کو لیا۔ اور جہاں جہاں اشارات

اس رسالہ میں مختصر تھے اور جو مباحث کتابوں میں مبسوط اور بہت سے فقہی فوائد پر مشتمل تھے وہاں بقدر ضرورت میں اشارات کی وضاحت کردی اور ناظرین کے لئے جزء اور صفحہ وغیرہ کتابوں کا حوالہ دے دیا۔

اور عزیز مولوی محمد یوسف جونپوری سلمہٗ استاذ حدیث مدرسہ مظاہر علوم نے اس رسالہ کو گہری نظر سے دیکھا اور بعض مقامات میں کچھ اضافے بھی کئے، اللہ تعالیٰ ان عزیزوں کی مساعی کو قبول فرمائے، اور جن لوگوں نے اس رسالہ میں اور میری دوسری تالیفات میں اعانت کی اللہ تعالیٰ ان کو بہت ہی جزائے خیر عطا فرمائے۔

والحمد للہ اولاً و آخراً، والصلوٰۃ والسلام

الاتمان الاکملان علیٰ سید الانس

والجان صلوٰۃ وسلاماً دائمین

متلازمین الیٰ یوم

الدین ۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حامداً ومصلیاً ومسلماً۔ وبعد: جب میں حجۃ الوداع کے لکھنے سے فارغ ہوا اور اس کی تبییض بھی ربیع الآخر کی آخری جمعرات کی صبح کو پوری ہو چکی تو میں نے جمادی الاولیٰ کی پہلی شب کو دیوبند کے جلسے میں یہ خواب دیکھا کہ ایک شخص مجھ کو کہہ رہا ہے کہ یہ حجۃ الوداع کی تکمیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمروں کے بیان سے کرو۔ اور اس نے کہا کہ حجۃ الوداع کی تکمیل کے لئے آپ کے عمروں کی تفصیل ضروری ہے۔ اسی خواب ہی میں میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی، اور کاغذ قلم لے کر اپنے قلم سے لکھنے لگا اس وقت گویا مجھے ذرا بھی تکلیف نہیں ہے۔ مشکل کا احساس ہے۔ اور میں نے خواب ہی میں حدیث جعرانہ کے دونوں طرق کی شرح لکھ دی جو جامع الطرق لی طرق الحدیث ہے۔ اور دوسرا جملہ فاصبح بمکۃ کبائت۔ اس کے بعد میں خواب ہی میں ایک مجلس اجتماع کے لئے گیا۔ آگے بڑا طویل خواب ہے جو اس وقت دیکھا تھا۔ خواب سے بیدار ہوا تو مجھے اس خواب پر بہت ہی حیرت ہوئی کیونکہ آئی بہت سے امراض کے علاوہ جو اس زمانہ میں مجھے عارض ہیں ایک جھٹکے سے آنکھ کی بھی شدید تکلیف ہے جیسا کہ دو ہفتے تک اس سلسلہ میں متحیر اور متأمل رہا کبھی اس کام کا ارادہ کر لیتا اور کبھی توڑ دیتا۔ مگر اس زمانہ کے مشائخ خصوصاً مولانا الحاج انعام الحسن کاندھلوی امیر تبلیغ اور مولانا الحاج ابوالحسن علی ندوی شیخ التفسیر و ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور مولانا الحاج مفتی محمود حسن گنگوہی مفتی دارالعلوم دیوبند وغیرہ نے اس خواب کی تعمیل پر بہت ہی اصرار فرمایا بہت سی دعائیں دیں۔

یعنی میں نے فلاں جگہ اقامت اختیار کی"۔ اور عمدۃ القاری میں ہے کہ "عمرہ نام ہے احرام، طواف، سعی اور حلق یا قصر کرنے
کا، جس میں احرام شرط ہے اور طواف کا بیشتر حصہ رکن ہے اور باقی چیزیں واجب ہیں" اور اسی میں قول مذہب میں یہ صحیح ہے
جیسا کہ ملا علی قاری نے شرح لباب میں تفصیل سے لکھا ہے اور ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ سعی رکن ہے اور کہا ہے کہ قول
مذہب میں یہ غیر مشہور ہے ــــــ اور علامہ دردیر (مالکی) لکھتے ہیں "اور ان دونوں یعنی حج اور عمرہ کے رکن تین ہیں۔
(۱) احرام (۲) طواف (۳) سعی، اور حج ایک چوتھے رکن کے ساتھ مختص ہے اور وہ ہے "وقوفِ عرفہ" ــــــ
انتہی مختصراً۔

دوسرا فائدہ: <u>عمرہ کے حکم میں</u>: لامع کے حاشیے میں ہے کہ ائمہ کا مسلک نقل کرنے میں ناقلین مذاہب نے اختلاف
کیا ہے اور غالباً یہ اختلاف اس بنا پر پیدا ہوا کہ ائمہ سے روایات مختلف ہوں گی۔ ابن رشد لکھتے ہیں کہ "ایک قوم
نے کہا ہے کہ عمرہ واجب ہے۔ امام شافعی، امام احمد، امام ثوریؒ اور امام اوزاعیؒ اسی کے قائل ہیں اور صحابہ میں سے
حضرت ابن عباسؓ کا اور تابعین کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ امام مالکؒ اور ایک جماعت کا قول یہ ہے کہ وہ سنت
ہے اور امام ابو حنیفہؒ تو اسے تطوع کہتے ہیں یہ قول ہے۔ ابو ثور اور داؤد ظاہری اس کے قائل ہیں"۔ اور ابن قدامہ لکھتے ہیں:
"جس شخص پر حج واجب ہے اس پر عمرہ بھی واجب ہے۔ یہ امام احمدؒ کی ایک روایت ہے اور دوسری روایت
یہ ہے کہ وہ واجب نہیں"۔ اور فقہ حنبلی کی کتابیں نیل المآرب اور الروض المربع وغیرہ میں پہلی روایت کو مختار قرار دیا
ہے اور علامہ عینیؒ لکھتے ہیں کہ جمہور اصحاب شافعیہ نے اسی پر جزم کیا ہے اور ان سے یعنی امام شافعیؒ سے ایک قول
یہ ہے کہ وہ سنت ہے۔ سو شافعیہ کا مسلک تو ان کی عام کتابوں میں یہ ہے کہ اظہر روایت میں فرض ہے
اور امام ترمذیؒ نے امام شافعیؒ سے نقل کیا ہے کہ سنت ہے اور شافعیہ نے اس قول کی تاویل یہ کی ہے کہ سنت
بمعنی واجب مراد ہے۔ رہا مالکیہ کا مسلک تو دردیر لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ عمرہ کرنا ہر شخص کے لئے سنت ہے۔
اور دسوقی لکھتے ہیں کہ یہ سنت مؤکدہ ہے اور یہی قول مذہب مالکی میں مشہور ہے۔ رہا ہمارے حنفیہ کا مسلک
تو شرح لباب میں ہے کہ عمرہ مختار قول کے مطابق سنت مؤکدہ ہے اور ایک قول یہ ہے کہ واجب ہے تاتارخانیہ
میں اسی کو صحیح کہا ہے اور صاحب بدائع نے اسی پر جزم کیا ہے اور ہمارے بعض اصحاب سے مروی ہے کہ
وہ فرض کفایہ ہے ــــ انتہی مختصراً من اللامع۔ اور اوجز میں ائمہ کے مذاہب و دلائل کو خوب تفصیل سے لکھا ہے۔
اور حافظ ابن تیمیہؒ نے اپنے فتاویٰ میں لکھا ہے کہ عمرہ کے وجوب میں علماء کے دو مشہور قول ہیں اور یہ دونوں
امام شافعیؒ کے قول اور امام احمدؒ کی دو روایتیں ہیں اور ان دونوں کے اصحاب مذہب کے یہاں وجوب

کا قول مشہور ہے۔ لیکن عدم وجوب بعض اکثر علماء شافعی امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے اور یہ قول
بعض صحابہ سے منقول ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ عمرہ واجب نہیں۔ بعد ازاں انہوں نے استدلال میں طویل کلام
کیا ہے۔ ایک مقام پر حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ ”یہ عدم وجوب کا قول زیادہ راجح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے
اپنے ارشاد: وللہ علی الناس حج البیت میں حج کو واجب کیا ہے عمرہ کو واجب نہیں ٹھہرایا۔ البتہ جو شخص
حج و عمرہ شروع کرے اس کے ذمہ ان کے پورا کرنے کو واجب ٹھہرایا ہے اور ابتداء میں صرف حج کو واجب کیا
ہے۔ اسی طرح تمام احادیث صحیحہ میں صرف وجوب حج کا ذکر آیا ہے۔“

<u>تیسرا فائدہ: تکرار عمرہ کے حکم میں</u> بعض مجتہدین جاننا چاہیے کہ امام شافعیؒ اس طرف گئے ہیں کہ ایک ہی سال میں کئی
مرتبہ عمرہ کا تکرار مستحب ہے۔ اور امام مالکؒ اور ان کے اصحاب کہتے ہیں کہ ایک سال میں ایک سے زیادہ عمرے کا
مکروہ ہے اور بعض متأخرین کہتے ہیں کہ دوسرے لوگوں کا قول ہے کہ ایک مہینے میں ایک سے زیادہ عمرے نہ کرے اور امام
ابوحنیفہؒ کا قول ہے کہ پانچ دنوں میں عمرہ مکروہ ہے یعنی یوم عرفہ، یوم النحر اور ایام تشریق۔ اور امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں
کہ یوم عرفہ اور ایام تشریق میں چار دنوں میں مکروہ ہے۔ اور اہل موفق کہتے ہیں کہ کوئی مضائقہ نہیں کہ آدمی سال میں
کئی مرتبہ عمرہ کرے لیکن زیادہ عمرے کرنا سلف کے ظاہر قول میں مستحب نہیں اور احمد سے بعض اصحاب نے کہا
ہے کہ زیادہ عمرے کرنا مستحب ہے۔ اھ اور مؤطا میں ہے کہ امام مالکؒ نے فرمایا: میں کسی کے لئے مناسب
نہیں سمجھتا کہ سال میں کئی مرتبہ عمرہ کرے۔ اھ اور اقتضاء میں ہے کہ یہاں حج کا اطلاق بالفرض اس عمرہ پر ہے جس پر
مرتبہ ایک سے زیادہ عمرہ کا کرنا مکروہ ہوگا۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نکل جانے کے بعد ہر سال میں الگ عمرہ
کیا۔ باوجودیکہ آپ ایک سال میں کئی کئی عمرے کر سکتے تھے۔ اور اگر اس کے عمل کو شروع کر دیا تو اس کا ایک الگ
ہوگا کیونکہ عبادات کی جنس سے ہے۔ اور بہت علماء اور بہت سے کہتے ہیں کہ تکرار عمرہ کو بلا کراہت جائز کہا ہے کیونکہ
کہ حدیث میں ہے کہ ایک عمرہ دوسرے عمرہ تک درمیان کے گناہوں کے لئے کفارہ ہے۔ یہاں تک کہ
ابن عبد البرؒ نے مبالغہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ میں نہیں جانتا کہ جو شخص اس کو مکروہ کہتا ہے اس کے پاس کتاب و سنت
میں سے کوئی دلیل ہے جس کا تسلیم کرنا واجب ہو۔ یہ بات تنقیح سے لی ہے اور اس کی تفصیل تو موجود ہے
اور شرح مہذب میں ہے کہ ”ہمارا مذہب یہ ہے کہ سال میں کئی بار عمرہ کرنا مکروہ نہیں بلکہ سنت ہے۔ امام ابوحنیفہؒ
امام احمدؒ اور سلف و خلف کے جمہور علماء اسی کے قائل ہیں۔ الحسن بصریؒ ابن سیرینؒ اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ سال
میں ایک سے زیادہ مرتبہ عمرہ کرنا مکروہ ہے۔ اور شرح لباب میں ہے کہ پورے سال میں کثرت سے عمرے کرنا کثر

شیخ ابوبکر جصاص کے قول کے مطابق مستحب ہے البتہ امام مالکؒ کے نزدیک مکروہ ہے۔“ اھ

چوتھا نکتہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمروں کی تعداد کے بیان میں: اس سلسلہ میں روایات میں بہت ہی اختلاف ہے، معروف، معتمد اور مرجح علماء کے نزدیک وہ ہے جو [illegible] حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چار عمرے کئے، عمرۂ حدیبیہ، دوسرا عمرہ جب کہ اگلے سال آئندہ سال آپ نے عمرہ کی قضا کی، تیسرا جعرانہ سے اور چوتھا وہ جو آپ نے اپنے حج کے ساتھ کیا۔“ یہ روایت امام بخاری نے حضرت انسؓ سے بالفاظ مختلف نقل کی ہے اور ترمذی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چار عمرے کئے چنانچہ صحیحین میں حضرت ہمام اور ابن ماجہ اور ابو داؤد میں حضرت قتادہ (تابعی) سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت انسؓ سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنے حج کئے؟ فرمایا ایک اور آپ نے عمرے چار کئے۔“ الحدیث اھ۔ اور علامہ ابن قیم کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد چار عمرے کئے جو سب کے سب ذیقعدہ میں ہوئے۔ پہلا عمرۂ حدیبیہ [illegible] یہ سب سے پہلا عمرہ تھا جو سنہ ۶ ہجری میں ہوا مگر مشرکین نے آپ کو مقام حدیبیہ میں آگے جانے سے روک دیا اس لئے آپ نے اسی مقام پر قربانی کے اونٹ ذبح کئے اور سر منڈائے دوم عمرۃ القضیہ جو اگلے سال ہوا چنانچہ آپ مکہ میں داخل ہوئے وہاں تین دن قیام فرمایا اور عمرہ پورا کر کے واپس لوٹ آئے۔ سوم وہ عمرہ جو آپ نے حج کے ساتھ ادا کیا کیونکہ آپ قارن تھے چہارم وہ عمرہ جو جعرانہ سے ادا فرمایا جب کہ آپ حنین تشریف لے گئے تھے چنانچہ آپ وہاں سے مکہ کی جانب واپس آئے تو بھی جعرانہ سے عمرہ کیا چنانچہ صحیحین میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چار عمرے کئے جو سب کے سب ذیقعدہ میں ہوئے سوائے اس عمرہ کے جو آپ نے حج کے ساتھ ادا فرمایا۔“ الخ اور اس روایت کے دوسری روایت منافی نہیں جو صحیحین میں حضرت براء بن عازبؓ سے مروی ہے کہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج سے قبل ذیقعدہ میں دو عمرے کئے“ کیونکہ حضرت براء بن عازبؓ کی مراد یہ ہے کہ ذیقعدہ میں مستقل عمرے دو کئے جو پورے بھی ہوئے اور کوئی شک نہیں کہ وہ دو ہی تھے کیونکہ عمرۂ قران مستقل نہیں تھا اور عمرۂ حدیبیہ پورا نہیں ہو سکا بلکہ آپ کو اس سے روک دیا گیا تھا اور ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار عمرے کئے۔“ الحدیث۔ یہ حدیث امام احمدؒ نے روایت کی ہے اور حضرت انسؓ کے اس قول کے درمیان کہ ”سب عمرے ذیقعدہ میں ہوئے سوائے عمرۂ قران کے“ اور حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ کے اس قول کے درمیان کہ ”رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے کوئی عمرہ نہیں کیا مگر ذیقعدہ میں۔ کوئی تناقض نہیں کیونکہ عمرۂ قران کی ابتداء ذیقعدہ میں ہوئی تھی اور انتہا
ذوالحجہ میں اس وقت ہوئی جب کہ آپ کا حج پورا ہو گیا۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ نے ابتداء کی خبر دی
اور حضرت انسؓ نے انتہا کی۔ لیکن ابن عمرؓ کا یہ قول کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چار عمرے کئے ان میں سے ایک
رجب میں ہوا۔ یہ ان کو وہم ہے (رضی اللہ عنہ) حضرت عائشہؓ کو جب ابن عمرؓ کے اس قول کی اطلاع ہوئی تو فرمایا
کہ اللہ تعالیٰ ابوعبدالرحمن پر رحم کرے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عمرہ بھی کیا وہ (ابن عمرؓ) اس موقع پر موجود تھے۔
مگر آپ نے کبھی رجب میں عمرہ نہیں کیا۔ باقی رہی وہ روایت جو دارقطنی نے حضرت عائشہؓ سے نقل کی ہے کہ میں
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رمضان میں عمرہ کے لئے نکلی، میں نے روزہ رکھا اور آپ نے افطار کیا اور آپ
نے نماز قصر کی اور میں نے پوری پڑھی۔ میں نے عرض کیا کہ میرے ماں باپ قربان ہوں آپ نے افطار کیا اور
میں نے روزہ رکھا، آپ نے قصر کیا اور میں نے نماز پوری پڑھی۔ آپ نے فرمایا: عائشہ! تم نے اچھا کیا۔ لیکن یہ حدیث
غلط ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی رمضان میں عمرہ نہیں کیا، اور آپ کے عمروں کی تعداد اور اوقات
دونوں منضبط چیزیں ہیں۔ اور حدیث کے جواب میں ہم یہی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ام المؤمنینؓ پر رحم فرمائے حضور صلی اللہ
علیہ وسلم نے رمضان المبارک میں کبھی عمرہ نہیں کیا اور خود عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ نے صرف ذیقعدہ ہی میں
عمرہ کیا۔ ابن ماجہ وغیرہ نے نقل کیا ہے اور اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں کہ آپ کے عمرے چار سے زائد
نہیں تھے۔ اب اگر رجب کا عمرہ بھی ہو تو پانچ ہو گئے اور اگر رمضان المبارک میں بھی کیا تو چھ ہو گئے اور یہ کہنا کہ بعض عمرے رجب
اور بعض رمضان میں اور بعض ذیقعدہ میں ہوئے خلاف واقعہ ہوگا جب کہ واقعہ یہی ہے کہ آپ کے عمرے ذیقعدہ
کے ہی ہوئے جیسا کہ حضرت انسؓ، ابن عباسؓ اور عائشہؓ نے بیان فرمایا۔ امام مالکؒ مؤطا میں نقل فرماتے ہیں کہ انہیں
یہ بات پہنچی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین عمرے کئے ہیں۔ حدیبیہ والے سال، قضا والے سال، جعرانہ والے سال۔
علامہ زرقانی کہتے ہیں کہ امام مالکؒ کا تین عمرے بتلانا ان کے اپنے مذہب کے موافق ہے اور جو لوگ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم
نے حج قران ادا فرمایا تھا وہ چار عمرے شمار کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ امام مالکؒ نے حج والا عمرہ اس لئے ذکر نہیں
کیا کہ وہ حج ہی میں داخل ہے۔ حاصل یہ کہ جو حضرات چار عمروں کے قائل ہیں وہ حدیبیہ والا عمرہ بھی شمار کرتے ہیں،
کیونکہ اس میں عمرے کے بہت سے احکام مثلاً احرام، قربانی، خوشبو، سلے ہوئے لباس اور اسباب فدیہ ذبح، حلق، قصر
اور نحر وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ علامہ باجیؒ کہتے ہیں کہ اسے عمرہ کہنا اس لئے کہ قضا کرنا ہے۔ یہ امام مالکؒ کے نزدیک
حکم بجا ساقط ہو گیا اس میں بیت اللہ شریف سے روکے ہی دیا گیا۔ ایسے شخص پر قضا نہیں ہوتی جسے بیت اللہ شریف

سے روک دیا گیا ہو۔ حافظ لکھتے ہیں کہ ان باتوں سے فرماتے ہیں کہ لوگوں کو عمرۂ حدیبیہ کا شمار کرنا جس میں کہ بیت اللہ شریف سے
روک دیا گیا تھا اس کے کامل عمرہ ہونے کی دلیل ہے اور اس میں جمہور کے اس قول کی صحت کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ جو
شخص بیت اللہ شریف سے روک دیا گیا ہو اس پر قضا واجب نہیں اور یہ قول احناف کے خلاف ہے۔ میں کہتا ہوں
کہ اس بحث کی تفصیل عمرۃ القضاء کے بیان میں آئے گی اور اسی طرح حضرات علماء نے عمروں کی فہرست میں آپ کا وہ
عمرہ بھی شامل کر لیا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کے ساتھ کیا تھا اس لئے کہ ان میں صحیح یہ ہے کہ حج قران کیا کہ آپ نے
ادا کیا ہے اور جو حضرات آپ کے تین عمرے بتاتے ہیں ممکن ہے کہ وہ حج والے عمرے کو اسی میں داخل اور تابع
کر شمار نہ کرتے ہوں یا جعرانہ والے عمرے کو شمار نہ کرتے ہوں کیونکہ رات میں ہونے کی وجہ سے مخفی رہا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم
جعرانہ میں رات کے وقت پہنچے ہی تھے کہ رات ہی میں عمرہ کر لیا تھا یا حدیبیہ والے عمرے کو شمار نہ کرتے ہوں گے کہ وہ پورا ادا
نہ ہو سکا تھا اور جو حضرات کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف دو بار عمرہ کیا تو انہوں نے عمرۃ الحج کو داخل حج اور
عمرۃ الحدیبیہ کو نا تمام سمجھ کر شمار نہیں کیا بلکہ صرف ان دو عمروں کو شمار کیا جو مستقل اور کامل واقع ہوئے جیسا کہ حافظ ابن حجر
کے کلام میں گزرا اور ممکن ہے کہ انہوں نے حدیبیہ اور قضاء والے عمروں کو شمار کیا ہو اور جعرانہ والا ان پر مخفی رہا ہو جیسا کہ ابن حجر
حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس حدیث میں ہے جس میں ہے کہ آپ نے صرف دو بار عمرہ کیا۔ کیونکہ حضرت عائشہ
فرماتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ابو عبد الرحمن پر رحم فرمائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عمرہ بھی کیا ان کی موجودگی میں کیا اور یہ کہ
آپ نے چار عمرے کئے۔" الخ جیسا کہ ابن حجر کے حاشیہ میں امام احمد اور ابوداؤد رحمہما اللہ کی روایت سے منقول ہے۔
پس ظاہر یہی ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے اس حدیث میں صرف ان دو عمروں کو شمار کیا ہے جو مستقل طور پر پورے ادا
کئے گئے یعنی عمرۃ القضاء اور عمرۂ جعرانہ۔

فصل دوم، عمرۂ حدیبیہ کے بیان میں

<u>حدیبیہ کا کچھ حصہ حرم میں شامل ہے</u>: یہ عمرہ مقام حدیبیہ کی جانب منسوب ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی
جگہ بیت اللہ شریف سے روکا گیا تھا اور اسی جگہ صلح، بیعت رضوان واقع ہوئی اور مکہ وغیرہ بہت سے امور واقع ہوئے۔
حدیبیہ بحاء مہملہ کے ضمہ، دال کے فتح، یائے تحتانیہ کے سکون اور با کے کسرہ کے ساتھ۔ اہل عراق اسے تشدید کے
ساتھ پڑھتے ہیں اور اہل حجاز بغیر تشدید کے۔ یہ دراصل ایک کنویں کا نام تھا جیسا کہ صحیح بخاری میں حضرت براء سے
منقول ہے۔ اسی کنویں کے نام پر اس جگہ کو حدیبیہ کہا گیا اور ایک قول یہ ہے کہ یہ درخت کا نام تھا

محب طبریؒ کہتے ہیں: "یہ ایک بستی ہے جو زیادہ بڑی نہیں۔ مکہ مکرمہ سے ایک مرحلہ پر واقع ہے اس کا بیشتر حصہ حرم میں ہے اور باقی حل میں اور یہ مکہ مکرمہ سے نو میل کے فاصلہ پر واقع ہے"۔ تنبیہ: پوری تفصیل اوپر آچکی ہے اس میں ہے کہ امام مالکؒ کے نزدیک یہ سب حرم میں داخل ہے" جواہر میں اور بدائع میں ہے کہ حدیبیہ کا کچھ حصہ حرم میں داخل ہے۔

کشاف میں زمخشری نے بھی اسی طرح ذکر کیا ہے اور کتاب الام میں امام شافعیؒ فرماتے ہیں "حدیبیہ کا کچھ حصہ حل میں ہے اور کچھ حرم میں" اور یہی بخاری میں ہے کہ "حدیبیہ حرم سے خارج ہے"۔ عینیؒ کہتے ہیں: "اس کا جواب یہ ہے کہ یہ مجمع علیہ نہیں، چنانچہ امام طحاویؒ نے حضرت مسورؓ سے نقل کیا ہے کہ حدیبیہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خیمہ حل میں تھا اور آپ کی نماز حرم میں تھی" اھ۔ وجیز میں ہے کہ ابن ابی شیبہؒ نے امام عطاءؒ کا قول نقل کیا ہے کہ "حدیبیہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فرودگاہ حرم میں تھی" اور ابن قیمؒ حدیث کے فوائد میں لکھتے ہیں "اور اس میں ایک طرح کی دلالت ہے اس امر پر کہ مکہ مکرمہ میں نماز کے مضاعف ہونے (یعنی ایک نماز پر ایک لاکھ نمازوں کا ثواب ملنے) کا مسئلہ تمام حرم سے متعلق ہے، صرف مسجد حرام کے ساتھ جو کہ طواف کی جگہ ہے، خاص نہیں، اور قِرَی میں ہے کہ "وہاں مسجد شجرہ ہے" اور حدیبیہ اور مدینہ کے درمیان نو مرحلوں کا فاصلہ ہے اور حدیبیہ اور مکہ کے درمیان ایک مرحلہ کا۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ حرم میں داخل ہے اور ایک قول یہ ہے کہ اس کا بعض حصہ حرم میں شامل ہے۔ اور شفاء الغرام میں ہے کہ "مسجد شجرہ حدیبیہ میں ہے اور جس شجرہ کی طرف یہ منسوب ہے یہ وہی شجرہ ہے جس کے نیچے بیعت رضوان ہوئی تھی، یہ کیکر کا درخت تھا جو لوگوں میں معروف تھا، یہ مسجد جدہ کے راستہ میں داہنی جانب واقع ہے اور یہ وہی مسجد ہے جس کے بارے میں لوگوں کا خیال ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے یہاں نماز پڑھی تھی اور وہاں ایک اور مسجد ہے مگر یہ دونوں مسجدیں اور خود حدیبیہ آج کل معروف نہیں" اھ۔ نووی نے امام شافعیؒ سے نقل کیا ہے کہ "صحیح اور درست یہ ہے کہ حدیبیہ کو تخفیف سے اور جعرانہ کو بغیر تشدید کے پڑھا جائے"۔

غزوہ حدیبیہ کا سبب: صاحب خمیس کہتے ہیں: "اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس غزوہ کے لئے اس طرح کے لئے جس کا نام غزوہ حدیبیہ ہوا، نکلنے کا سبب یہ ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کی طرف نکلنے سے پہلے مدینہ میں یہ خواب دیکھا کہ آپ اور آپ کے صحابہؓ مسجد حرام میں داخل ہوئے اور آپ نے بیت اللہ شریف کی کنجی اپنے دست مبارک میں لی اور سب نے طواف و عمرہ کیا۔ پھر بعض نے حلق کرایا اور بعض نے

قصر" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خواب صحابہ کرامؓ سے بیان فرمایا تو وہ بہت خوش ہوئے اور یہ سمجھے کہ اسی سال مکہ میں داخل ہوں گے پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے عمرے کے ارادے کا اظہار فرمایا اس پر انھوں نے سفر کی تیاری شروع کر دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے قبائل اور گردو پیش کی بستیوں کے اعراب کو ساتھ چلنے کے لئے فرمایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جنگ و قتال کا ارادہ نہیں رکھتے تھے لیکن آپ کو قریش کی جانب سے یہ اندیشہ ضرور تھا کہ وہ آپ سے قتال کے لئے آمادہ ہوں گے یا آپ کو بیت اللہ شریف سے روکنے کی کوشش کریں گے اور بہت سے بدویوں نے آپ کے حکم کی تعمیل میں تاخیر کی

تفسیر جلالین میں آیت کریمہ "لقد صدق اللہ رسولہ الرؤیا الآیۃ" کے تحت لکھا ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے سال کوچ سے پہلے خواب دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ مکہ میں امن و حفاظت سے داخل ہو رہے ہیں اور حلق اور قصر کرا رہے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خواب صحابہ کرام سے ذکر کیا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ نکلے تو کفار نے انہیں حدیبیہ میں روک دیا اور انہیں عمرہ کئے بغیر لوٹنا پڑا تو انہیں نہایت شاق گزرا اور بعض منافقوں نے شکوک و شبہات پھیلانے شروع کئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی" اھ

زرقانی کہتے ہیں "فریابی، عبد بن حمید اور بیہقی نے دلائل میں حضرت مجاہد سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کہ آپ حدیبیہ میں فروکش تھے، یہ خواب دیکھا کہ آپ اور آپ کے صحابہؓ بے خوف و خطر مکہ میں داخل ہو رہے ہیں اور سروں کا حلق اور قصر کرا رہے ہیں۔ لیکن جب حدیبیہ ہی میں ہدی کے جانور ذبح کرنے پڑے تو صحابہؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ آپ کا خواب کیا ہوا؟ اس پر یہ آیت: "لقد صدق اللہ رسولہ الرؤیا الآیۃ" نازل ہوئی۔ اس روایت میں جس خواب کا ذکر ہے یہ دوسرا خواب ہے جو آپ نے حدیبیہ میں دیکھا تھا اور جس میں حق تعالیٰ کی جانب سے دوبارہ بشارت دی گئی تھی۔ اس کو آپ کے مدینہ سے چلے جانے کا سبب قرار دینا صحیح نہیں ہوگا۔" اھ

میں کہتا ہوں اول کی تائید ترمذی کی اس روایت سے ہوتی ہے جو حضرت عمرؓ کے اس قول "اولیس کنت تحدثنا الخ" (کیا آپ ہم سے یہ نہیں فرماتے تھے الخ) کے ذیل میں ذکر کی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ —
"ترمذی کی روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ کے لئے چلنے سے پہلے یہ خواب دیکھا کہ آپ اور آپ کے صحابہؓ بیت اللہ میں داخل ہوئے۔ پھر جب ان حضرات نے اس امر میں تاخیر دیکھی تو انہیں

نہایت شاق گزرا۔

مدینہ طیبہ سے روانگی: صاحب خمیس کہتے ہیں جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل فرمایا، لباس زیب تن کیا، اور اپنی اونٹنی قصواء پر سوار ہو کر چلے اور مدینہ میں ابن ام مکتوم کو اپنی جگہ قائم مقام مقرر فرمایا۔ خمیس اور زرقانی میں اسی طرح ہے اور زرقانی نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ بعض لوگوں نے ابو رہم کلثوم بن حصین کا نام بھی ذکر کیا ہے۔ بلاذری نے یہ دونوں قول نقل کئے ہیں اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ ان دونوں کو مقرر فرمایا تھا اور ابن ام مکتوم نماز پڑھاتے تھے۔ ابن ہشام اور ان کے متبعین نے کہا ہے کہ نمیلہ بن عبد اللہ لیثی کو مقرر کیا تھا اس لئے ممکن ہے کہ نمیلہؓ اور کلثومؓ دونوں کو امیر عامہ پر مقرر فرمایا ہو اور ابن ام مکتومؓ کو امام مقرر کیا ہو۔

اور آپ یکم ذیقعدہ ۶ھ کو جیسا کہ حدیبیہ کا سال کہلاتا ہے پیر کے دن مدینہ طیبہ سے روانہ ہوئے۔ زرقانی کہتے ہیں کہ "جمہور علماء مثلاً امام زہری، قتادہ، موسیٰ بن عقبہ، ابن اسحٰق، ابن سعد وغیرہ نے اسی طرح نقل کیا ہے اور فتح میں کہا ہے کہ ہشام بن عروہ نے اپنے والد سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں عمرہ کے لئے نکلے اور شوال میں عمرہ کیا۔ مگر یہ قول شاذ ہے اور ابو الاسود نے عروہ سے جمہور کے موافق روایت نقل کی ہے۔" اور البدایہ والنہایہ میں —— شوال میں عمرہ کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھا ہے: "یہ عروہ سے بہت غریب روایت ہے۔" اور ابن قیم کہتے ہیں "یہ روایت وہم ہے اور عروہ کا قول صحیح روایت سے یہی ہے کہ عمرہ ذی قعدہ میں ہوا، چنانچہ صحیحین میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چار عمرے کئے جو سب کے سب ذیقعدہ میں ہوئے۔ ان میں عمرہ حدیبیہ کا بھی ذکر ہے۔" اور آپ نے اپنی زوجہ مطہرہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو بھی ساتھ لیا۔

شرکاء حدیبیہ کی تعداد: اور آپ کے ساتھ چودہ سو حضرات تھے جیسا کہ صحیحین میں حضرت براءؓ کی حدیث میں بروایت اسرائیل عن ابی اسحٰق —— مروی ہے اور کہا جاتا ہے کہ آپ کے ساتھ پندرہ سو افراد تھے۔ یہ روایت بھی صحیحین ہی میں سعید بن مسیب کی سند سے حضرت جابرؓ سے مروی ہے اور کہا گیا ہے کہ ان کی تعداد تیرہ سو تھی یہ روایت بھی صحیحین ہی میں حضرت عبد اللہ بن ابی اوفیٰ سے مروی ہے اور ان مختلف روایات میں تطبیق، جیسا کہ فتح میں کہا ہے، یہ ہے کہ چودہ سو سے زائد تھے، پس جس نے زائد کا اعتبار کیا پندرہ سو کہا اور جس نے شمار نہیں کیا اس نے چودہ سو کہا۔ اس کی تائید بخاری کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ حضرت براءؓ فرماتے ہیں کہ ہم چودہ سو یا اس سے زیادہ تھے، یہاں "یا" سے مراد یہ ہے کہ چودہ سو کچھ

اس سے زیادہ تھے۔ اس سے وجہ تطبیق واضح ہو جاتی ہے اور نوویؒ نے اسی تطبیق پر اعتماد کیا ہے کیونکہ
کہ روایات سب صحیح ہیں۔ اور بیہقیؒ کا میلان ترجیح کی طرف ہے وہ کہتے ہیں کہ چودہ سو کی روایت زیادہ صحیح
ہے کیونکہ حضرت براءؓ، جابرؓ، سلمہ بن اکوعؓ، معقل بن یسار اور مسیّب بن حزن اسی پر متفق ہیں۔ ابن قیمؒ
کہتے ہیں کہ اہل علم کا رجحان زیادہ تر اسی طرف ہے۔ رہی تیرہ سو والی روایت، سو وہ وہم کی طرح پر محمول
ہے۔ دوسرے حضرات کہتے ہیں کہ دو سو زائد کی الفاظ ہوں جن پر پہنچے راوی کو ذہول ہوئی اور زیادتی ثقہ کی
مقبول ہوتی ہے۔ لہٰذا کم نقل کرنے والے کی روایت اس کے معارض نہیں۔" اور بعض نے اس پر یہ اضافہ
کیا ہے کہ "یا یہ کہا جائے کہ جو تعداد اس نے (تیرہ سو کے راوی نے) ذکر کی ہے یہ تو مدینہ سے روانگی کے
وقت تھی اور زائد وہ تھے جو بعد میں شامل ہوتے گئے یا یہ کہ اس نے صرف مقاتلین کی تعداد ذکر کی
ہے اور زائد حشم و خدم، نابالغ بچے اور عورتیں تھیں اور ابن اسحٰقؒ کا یہ قول کہ سات سو تھے کسی نے اس
کی تائید و موافقت نہیں کی۔ دراصل موصوف نے یہ بات حضرت جابرؓ کے اس قول سے استنباط کی ہے
کہ "ہم نے ایک ایک اونٹ دس دس آدمیوں کی جانب سے ذبح کیا تھا اور اونٹوں کی تعداد
ستر تھی"

حالانکہ یہ اس امر کی دلیل نہیں کہ انہوں نے اونٹوں کے علاوہ گائے، بکری ذبح نہیں کئے تھے
مزید برآں یہ کہ بعض حضرات نے سرے سے احرام ہی نہیں باندھا تھا۔ موسیٰ بن عقبہؒ نے اس پر جزم
کیا ہے کہ ان کی تعداد سولہ سو تھی۔ ابن ابی شیبہ کی روایت میں حضرت سلمہ بن اکوعؓ کی حدیث میں
سترہ سو کی تعداد مذکور ہے اور ابن سعد کی روایت میں ہے کہ وہ ایک ہزار پانچ سو پچیس نفر تھے۔
حافظؒ کہتے ہیں: "اس سلسلہ کی روایت اگر ثابت ہو تو اس میں تحریر بالغ سے کام لیا گیا ہے (یعنی ٹھیک
ٹھیک پوری تعداد بیان کی گئی ہے۔) بعد ازاں ابن دحیہ کی تحریر ہے۔ یہ تعداد مجھے بروایت ابن عباسؓ
سولہ سو بھی دستیاب ہوئی ہے" اھ مختصراً

بیہقی میں بروایت صحیحین حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ سے نقل کیا ہے کہ ہم تیرہ سو تھے۔ قتادہ کہتے
ہیں کہ "میں نے سعید بن مسیّب سے دریافت کیا کہ بیعت رضوان میں شریک ہونے والوں کی تعداد
کتنی تھی؟ فرمایا پندرہ سو۔ میں نے کہا کہ حضرت جابرؓ تو چودہ سو بتاتے ہیں! فرمایا: اللہ تعالیٰ ان
پر رحم فرمائے! انہیں سہو ہوا، خود انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ پندرہ سو تھے" اھ۔ اور حنفیہ کے

پندرہ سو کی تعداد ہی راجح ہے، جیسا کہ ابو داؤد، کتاب الجہاد، "باب من اسہم لہ سہماً" میں اس کی تصریح
موجود ہے۔ چنانچہ اس میں حضرت مجمع بن جاریہ انصاریؓ سے جو ان قاریوں میں سے ایک تھے جنہوں نے
قرآن کریم یاد کیا، روایت ہے، وہ فرماتے ہیں: "ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حدیبیہ میں
حاضر ہوئے جب وہاں سے واپس ہوئے تو لوگ اونٹ دوڑانے لگے، آگے حدیث میں سورۂ فتح کے نزول
کا قصہ مذکور ہے اور اس روایت کے آخر میں ہے کہ خیبر کا مال غنیمت اہل حدیبیہ پر تقسیم کیا گیا، چنانچہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے اٹھارہ حصے کئے، پندرہ سو کا لشکر تھا، ان میں سے تین سو سوار
تھے پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شہسوار کو دوہرا اور پیادہ کو اکہرا حصہ دیا۔" اس کی تائید نقل کے
گزشتہ بالا کلام سے بھی ہوتی ہے کہ یہی (پندرہ سو کی تعداد) صحیحین میں بروایت سعید بن مسیبؒ حضرت
جابرؓ سے منقول نہیں ہے اور حضرت مجمعؓ کی یہ حدیث اس بنا پر بھی راجح ہے کہ اس میں سواروں اور
پیادوں کی الگ الگ تفصیل بھی دی گئی ہے۔ امام بخاریؒ، قتادہؒ سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا میں نے
سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے کہا کہ مجھے خبر ملی ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ وہ چودہ سو
تھے۔ سعیدؒ نے ——— کہا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے خود مجھ سے فرمایا کہ جن حضرات نے حدیبیہ میں
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی تھی ان کی تعداد پندرہ سو تھی۔" شیخ بذل میں فرماتے ہیں: "حضرت جابرؓ
سے جو تعداد سالمؒ اور سعید بن مسیبؒ نے نقل کی ہے وہ باقی روایات کی نسبت اقرب الی التحقیق ہے، کیونکہ
کہ اس کو جن حضرات نے حدیبیہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی تھی کے شمار کے ساتھ موکد کیا
ہے، پھر یہ روایت حضرت مجمعؓ کی روایت سے موید ہے۔" اھ اور سہیلیؒ نے "روض الانف" میں "قصہ بیعۃ الرضوان"
کے تحت بروایت عبد بن حمید و ابن جریر حضرت قتادہؒ سے نقل کیا ہے کہ یہ کیکر کا درخت تھا جس کے نیچے
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے بیعت لی تھی، اور ان کی تعداد اس دن پندرہ سو تھی۔" اھ

ابو جہل کے اونٹ کا قصہ: اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھ ہدی کے ستر اونٹ لے گئے
تھے جن میں ابوجہل کا وہ اونٹ بھی شامل تھا جو جنگ بدر کی غنیمت میں ہاتھ آیا تھا، یہ کہا اصل میں [illegible]
اور ترمذی شریف میں جو مروی ہے کہ وہ حجۃ الوداع کے اونٹوں میں شامل تھا یہ وہم ہے جیسا کہ اس کی تفصیل
حجۃ الوداع میں گزر چکی ہے اور اس اونٹ کی ناک میں کڑا تھا، ابو داؤد میں ابن عباسؓ سے روایت
ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے موقع پر اپنی قربانیوں میں ابوجہل کا وہ اونٹ بھی قربان کیا جس کے

مصر میں جو ناک میں چاندی کا کڑا (حلقہ) تھا۔ ابن حبان لکھتے ہیں کہ کڑا سونے کا تھا۔ بیہقی کہتے ہیں کہ اس سے
مشرکین کو چڑانا منظور تھا۔ حضرت شیخؒ بذل میں فرماتے ہیں کہ "راوی کا قول: اس کے سر میں" اور "گلے میں" کا معنی قریب
ہیں۔ "راوی کا قول کہ سونے کا کڑا تھا" اور دوسری روایت میں ہے کہ چاندی کا کڑا تھا، ممکن ہے کہ دو
مختلف کے لئے دو کڑے ہوں"۔ اوجز میں ہے کہ ابوداؤد کی اس حدیث کو کئی طرح سے ترجیح حاصل ہے
ایک یہ ہے کہ روایات میں ہے کہ کفار کو چڑانا اور غصہ دلانا مقصود تھا اور یہ بات حجۃ الوداع کے ساتھ
جوڑ نہیں رکھتی اس لئے کہ اس وقت مکہ میں کوئی کافر نہیں تھا۔ دوسرے یہ کتب سیر کے موافق ہے۔ تیسرے
یہ کہ ترمذی کی روایت میں ضعف ہے۔ چنانچہ خود امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ "یہ حدیث غریب ہے، سفیان
کی حدیث صرف زید بن حباب کے ذریعہ ہی جانی جاتی ہے"۔ یہ کل تفصیل اوجز میں ہے۔ اور جزء حجۃ الوداع
میں حدیبیہ کے ہدایا ابوجہل کے اونٹ کے بھاگ جانے کا قصہ گزر چکا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ
بھاگنا بھی اسی چیز کی تکمیل کے لئے تھا کہ اگر وہ اونٹ یونہی ذبح کر دیا جاتا تو مکہ کے عام لوگوں
کو اس کا علم نہ ہوتا اور اس کے بھاگ جانے کی وجہ سے اس کا معاملہ ایسا شہرہ ہوا کہ قریب و بعید کے
تمام لوگوں کو معلوم ہو گیا۔ رہا یہ سوال کہ اونٹ تو بے عقل جانور ہے کفار کو چڑانے والے مقصد کی تکمیل کے
لئے اس کا بھاگ نکلنا کیوں کر ہوا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بطور معجزہ کے ہے اور اس قسم کے بہت سے
معجزات ہیں جن کا انکار ممکن نہیں۔ منجملہ ان کے ابوداؤد کی حدیث کا یہ واقعہ ہے کہ قربانی کے اونٹ آپ
کی طرف لپکتے تھے کہ دیکھئے کس سے ذبح کی ابتداء ہو۔ اسی طرح آپ کی ناقہ قصواء کے بیٹھنے کا قصہ، اور لوگوں
کا کہنا کہ قصواء اڑ گئی، عنقریب آ رہا ہے (ذکرہ)۔ اور آپ نے ہدی کے اونٹوں پر ناجیہ بن جندب اسلمی کو مقرر
فرمایا اور معالم التنزیل میں ان کا نام ناجیہ بن عمیر نقل کیا ہے۔ اور تحقیق میں بھی اسی طرح ہے۔ اور ان دونوں
باتوں میں کوئی اختلاف نہیں اس لئے کہ ان کے والد کا نام جندب اور دادا کا نام عمیر ہے۔ البتہ یہاں ایک اختلاف
ہے کہ آیا یہ اسلمی ہے یا خزاعی؟ اور یہ کہ کیا ناجیہ اسلمی اور ناجیہ خزاعی دو شخص ہیں یا ایک ہی شخص ہے، تلقیح
میں اس پر مفصل کلام کیا ہے۔ اور آپ کے ساتھ مالدار صحابہؓ نے بھی ہدی کے جانور ہانکے۔ اور آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم نے بجز میان میں بند تلواروں کے جو مسافر کا ہتھیار ہے، اور کوئی ہتھیار اپنے ساتھ نہیں لیا۔
میں کہتا ہوں کہ آپ کے ساتھ تین گھوڑ سوار تھے، جیسا کہ ابوداؤد کی روایت اوجز میں گزر چکی ہے اور زرقانی کی
ہے کہ آپ کے ساتھ دو گھوڑ سوار تھے مگر ابوداؤد کی روایت راجح ہے۔

پس آپ نے نماز ظہر ذی الحلیفہ میں ادا فرمائی اور قربانی کے جانوروں کو قلادے پہنائے اور ان کا اشعار کیا۔ بعض جانوروں کو خود نفس نفیس قلادے پہنائے اور باقیوں کے لیے ناجیہ کو حکم فرمایا۔ خمیس میں اسی طرح ہے۔ زرقانی فرماتے ہیں کہ "ایک روایت کے مطابق آپ نے دو رکعت نماز پڑھنے کے بعد ذوالحلیفہ سے احرام باندھا اور ذوالحلیفہ کی مسجد کے دروازے سے سوار ہوئے اور آپ کی سواری جب آپ کو لے کر قبلہ کی طرف چلنے لگی تو آپ نے عمرہ کا احرام باندھا یعنی اس کا اظہار فرمایا تاکہ معلوم ہو جائے کہ آپ لڑائی کے لیے تشریف نہیں لے جا رہے۔" اور خمیس میں ہے کہ "پھر آپ نے ذوالحلیفہ سے احرام باندھا اور تلبیہ پڑھا اور آپ کی اقتدا میں بہت سے صحابہؓ نے بھی وہیں سے احرام باندھا اور بعض نے جحفہ سے احرام باندھا۔"

میں کہتا ہوں کہ تقلید اور اشعار کی بحث جزو اول میں گزر چکی ہے اور اس فائدہ کے نزدیک اوجہ یہ ہے کہ میقات کی مشروعیت کی ابتدا عمرۃ الحدیبیہ سے ہوئی اور علامہ شرنبلالی کی حجۃ الوداع سے ذکر فرماتے ہیں جیسا کہ امام احمدؒ نے بھی اس کی تصریح فرمائی ہے۔ مگر اس پر اشکال ہوگا کہ تمام حضرات محدثین واسطہ سے حضرت ابو قتادہؓ کے میقات سے بغیر احرام گزر جانے کی تاویلات کرتے ہیں۔ حالانکہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ میقات کی تعیین حجۃ الوداع میں ہوئی تو ان توجیہات قریبہ و بعیدہ کی حاجت ہی نہیں پڑتی۔ اوجز میں اسی طرح ہے اور جو راستہ میں نے اختیار کیا ہے اس کی تائید حافظ ابن قیمؒ کے اس کلام سے ہوتی ہے جو موصوف نے حدیبیہ کے فوائد میں ذکر کیا ہے کہ "عمرہ کا احرام میقات سے باندھنا افضل ہے جیسا کہ حج کا۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حج و عمرہ دونوں کا احرام ذوالحلیفہ سے باندھا تھا۔"

ذوالحلیفہ سے جاسوس بھیجنا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ذوالحلیفہ ہی سے خزاعہ کا ایک جاسوس بھیجا جس کے مطابق اس کا نام بسر تھا۔ زاد المعاد کے شیخ زرقانی نے سکون کے ساتھ جیسا کہ حافظ نے کہا ہے اور ابن اسحاق اور ابن عبدالبر نے بھی اسی پر جزم کیا ہے۔ البتہ ابن اسحاق کی روایت میں بسر "بسر" باء کے کسرہ اور شین معجمہ کے ساتھ واقع ہوا ہے اور ابن ہشام نے اس کی تردید کی ہے۔ اور ابن شیبہ کی تفسیر میں جاسوس کا نام "ناجیہ" ذکر کیا ہے۔ حافظ فرماتے ہیں کہ "یہ ناجیہ وہ ہے کہ ناجیہ اس شخص کا نام ہے جس کے ساتھ قربانی کے جانور بھیجے تھے جیسا کہ ابن اسحاق وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔" اور آپ نے اس بسر بن سفیان بن عمرو کو بطور جاسوس بھیجنے کے لیے اس لیے منتخب فرمایا کیونکہ یہ تازہ تازہ اسلام لائے تھے چنانچہ وہ شوال میں اسلام لائے تھے اور چونکہ ان کا اسلام زیادہ مشہور نہیں تھا اس لیے انہیں دیکھنے والا جاسوس سمجھ کر ایذا کا سبب

نہیں ہوگا۔ فتح الباری میں اسی طرح ہے۔ حافظ ابن قیمؒ "زاد المعاد" میں فرماتے ہیں کہ "آپ نے ذو الحلیفہ سے اپنے
آگے آگے ایک خزاعی کو بحیثیت جاسوس کے بھیجا" اور حدیث کے فوائد میں فرماتے ہیں کہ "جہاد میں مقابل لشکر
مشرک سے بوقت ضرورت خدمت لینا جائز ہے۔ اس لئے بنی خزاعی کو جب جاسوس مقرر کیا گیا وہ کافر تھا اور
اس میں مصلحت یہ تھی کہ اس کے لئے دشمن میں گھل مل کر ان کی خبریں معلوم کرنا آسان تھا۔ نیز فرماتے ہیں "امیر لشکر کو
چاہئے کہ اپنے آگے دشمن کی جانب جاسوس بھیجے"۔ اھ اور آپ کا یہ جاسوس "غدیر اشطاط" نامی جگہ واپس آیا
جیسا کہ آگے آتا ہے۔ ابن قیمؒ لکھتے ہیں "پس جب آپ ذو الحلیفہ پہنچے تو قبیلہ خزاعہ کے ایک جاسوس کو اپنے آگے
بھیجا تاکہ وہ قریش کی خبریں آپ کو لا کر دے، یہاں تک کہ جب وادی عسفان کے قریب پہنچے تو آپ کا یہ جاسوس واپس
آیا اور اس نے بتایا کہ میں کعب بن لوی (یعنی قریش) کو اس حال میں چھوڑ کر آیا ہوں کہ انہوں نے آپ کے مقابلہ کے
لئے احابیش میں مختلف قبائل کو جمع کر رکھا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ لیا اور فرمایا
کہ تم کیا رائے دیتے ہو کہ ہم ان لوگوں کے اہل وعیال کا رخ کریں؟" الخ مختصراً اور مشورہ کا تذکرہ اپنے موقع پر آئے گا۔
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ناجیہ اسلمیؓ کو ہدی کے جانوروں کے ساتھ آگے بھیجا اور خود ان کے پیچھے روانہ ہوئے
اور عباد بن بشرؓ کو مہاجرین وانصار کے بیس سواروں کی جمعیت میں مقدمۃ الجیش پر مقرر فرمایا۔

حضرت ابو قتادہؓ کی آمد اور جاسوس کی واپسی : اور حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کی خدمت میں اس وقت پہنچے جب کہ آپ موضع "سقیا" میں پڑاؤ کر رہے تھے۔ حافظ لکھتے ہیں: "السقیا"
سین مہملہ کے ضمہ اور قاف کے سکون کے ساتھ اور اس کے ساتھ یائے مقصورہ۔ مکہ اور مدینہ کے درمیان
ایک جامع بستی ہے" اھ۔ اور معجم میں ہے کہ "فرع" کے مضافات میں ایک قصبہ ہے۔ اس کے اور "فرع"
کے درمیان جحفہ کی جانب انتیس میل کا فاصلہ ہے"۔ اھ

بخاری ومسلم میں عبد اللہ بن ابی قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میرے والد (حضرت ابو قتادہؓ)
بھی حدیبیہ کے سال گئے تھے۔ پس ان کے رفقاء نے احرام باندھ لیا، مگر انہوں نے نہیں باندھا۔ اور آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا کہ "غیقہ" نامی جگہ میں دشمن چھپے ہیں، وہ آپ سے لڑیں گے۔ پس آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم چلے۔ پس اسی اثناء میں کہ میرے والد اپنے رفقاء کے ساتھ تھے، وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر
ہنسنے لگے۔ (میرے والد فرماتے ہیں کہ) میں نے دیکھا کہ ایک جنگلی گدھا ہے، میں نے نیزے سے اس پر حملہ کیا
پس اس کو وہیں ڈھیر کر دیا۔ میں نے اپنے رفقاء سے مدد چاہی مگر انہوں نے میری مدد کرنے سے انکار کر

دیا۔ بہرحال میں نے خود بھی اس کا گوشت کھایا اور ہم نے اس کا گوشت کھایا۔ اور مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقاء سے کٹ کر پیچھے نہ رہ جائیں۔ اس لئے میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تلاش کیا۔ میں کبھی گھوڑا تیز دوڑاتا اور کبھی عام رفتار سے چلتا۔ آدھی رات کو مجھے بنو غفار کا ایک شخص ملا۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کہاں چھوڑا تھا۔ اس نے بتایا کہ میں نے آپ کو "تعہن" نامی جگہ چھوڑا ہے۔ اور آپ دوپہر کو "سقیا" جا پہنچیں گے۔ چنانچہ میں "سقیا" میں آپ سے آملا۔ اور میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ کے خدام آپ کو سلام عرض کرتے ہیں اور انہیں اندیشہ ہے کہ کہیں آپ سے کٹ کر پیچھے نہ رہ جائیں۔ پس ان کا انتظار کر لیجئے۔ پھر عرض کیا: یا رسول اللہ! میں نے جنگلی گدھے کا شکار کیا تھا اور اس کا کچھ بقیہ میرے پاس ہے۔ آپ نے رفقاء سے فرمایا کہ کھاؤ۔ یہ حضرات احرام میں تھے۔

اس قصہ میں بہت سی فقہی بحثیں ہیں، مثلاً ابو قتادہ کے خروج کا سبب کیا تھا؟ انہوں نے میقات سے احرام کیوں نہ باندھا؟ حالانکہ میقات سے بلا احرام گزرنے کے وجوہ و اسباب کیا تھے؟ شروح بخاری وغیرہ مطولات میں ان سب پر تفصیل سے کلام کیا ہے اور ان کا خلاصہ اوجز اور حاشیہ لامع میں مذکور ہے اور محرم کے شکار کے ـــــ مسائل پر بحث "حجۃ الوداع" میں گزر چکی ہے۔

آپ کے روکنے کے بارے میں مشرکین مکہ کا مشورہ: اور جب مشرکین مکہ کو یہ خبر پہنچی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ تشریف لا رہے ہیں تو انہوں نے اس بارے میں مشورہ کیا۔ صلاح مشورہ کے بعد یہ قرار پایا کہ آپ کو بیت اللہ شریف آنے سے روکا جائے۔ اہل مکہ نے عرب قبائل اور جماعت احابیش سے بھی مدد طلب کی۔

احابیش: حافظ سہیلی، [illegible] کی تصریح ہے کہ بنو الہون بن خزیمہ، بنو حارث بن عبد مناة اور بنو المصطلق جو خزاعہ کی ایک شاخ ہے، کا لقب ہے۔ کہا گیا ہے کہ ان لوگوں نے قریش کے ساتھ حبشی نامی پہاڑ کے نیچے، جو اسفل مکہ میں واقع ہے، عہد و پیمان کیا تھا، اسی بنا پر ان کا نام "احابیش" ہوا۔ اور بعض نے کہا کہ تحبش کے معنی اجتماع کے ہیں، ان کے تحبش یعنی اجتماع کی وجہ سے ان کا یہ لقب پڑا۔

جاسوسی کے لئے خالد کے لشکر کی آمد: بہرحال احابیش نے قریش کی دعوت کو لبیک کیا اور یہ سب نکل آیا۔ یہ لوگ مکہ سے نکلے اور "بلدح" نامی جگہ میں ان کا لشکر جمع ہوا اور خالد بن ولید اور عکرمہ بن ابی جہل کو دو سو سوار کی معیت میں خبر رسانی کے لئے مقرر کیا۔ میں کہتا ہوں کہ بخاری کی حدیث میں ہے کہ: ـــــ قریب آپ

نقشہ متعلقہ حاشیہ صفحہ ۲۳۴

کہنے لگا کہ قریشیوں کو آپ کے سفر کی اطلاع مل چکی ہے اور وہ اپنی عورتوں بچوں یا : دودھ دینے والے جانوروں والعوذ المطافیل کو ساتھ لے کر نکل آئے ہیں [لاہوری کے حاشیہ میں ہے "العوذ المطافیل" اونٹنی کی بچی اور دودھ کے سکوں کے ساتھ اس کے بعد دار بچہ، ودودھیا اونٹنی۔ وہ ناش جن کے ساتھ ان کے بچے بھی ہوں، مطلب یہ تھا کہ وہ لوگ اپنے ساتھ دودھ کے جانور لے کر نکلے ہیں تاکہ ان سے غذا حاصل کرتے رہیں۔ تو جب تک آپ کو روک نہ دیں واپس نہ جائیں۔ بچوں سمیت تو ہیں مراد ہو سکتی ہیں جس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنے ساتھ عورتیں اور بچے لے کر نکلے ہیں کیوں کہ ان کا طویل قیام کا ارادہ ہے نیز اس لئے کہ یا مر عوام فرار کے لئے زیادہ مفید ہے۔ ناہ کو لان کہتے ہیں کہ المطافیل، الطفل کی جمع ہے۔ ان عورتوں کو کہتے ہیں جن کے بچے ساتھ ہوں۔ یعنی یہ قبائل آپ کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے جمع ہو گئے ہیں اور اپنے ساتھ اموال بھی لے آئے ہیں (انتہی) انہوں نے حبشیوں کی کھالیں پہن رکھی ہیں اور بدطولی میں قسم کھائی ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کر چکے ہیں کہ آپ بزور قوت ان پر غلبہ حاصل کر کے مکہ میں داخل نہیں ہو پائیں گے۔ اور ابن سعد کی روایت میں ہے کہ مشرکین کو آپ کے نکلنے کی خبر پہنچی تو انہوں نے آپ کو مکہ سے روکنے پر اتفاق کر کے بلدح نامی جگہ میں لشکر جمع کیا اور الخرائطی کی ہواتف میں ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ کے سال عازم مکہ تھے تو بشر بن سفیان الکعبی آپ کے پاس آئے، آپ نے اس سے دریافت فرمایا کہ بنی کعب کو ہماری آمد کا علم ہو چکا ہے یا نہیں؟ اس نے کہا کہ اس نے فلاں رات بیت اللہ کا طواف کیا اور قریش اپنی مجلس میں جمع تھے کہ جبل ابوقبیس کی چوٹی سے ایک شخص نے چیخ چیخ کر یہ اشعار اتنی بلند آواز سے پڑھے کہ تمام مکہ میں سنائی دیتے تھے (یہاں زرقانی نے وہ اشعار نقل کئے ہیں) اس پر گویا تمام مکہ کانپ اٹھا اور سب نے عہد و معاہدہ کیا کہ اس سال تو آپ مکہ میں داخل نہیں ہو پائیں گے۔ آپ نے یہ سن کر فرمایا کہ چیخنے والا "سلفع" ہے جو بتوں کا شیطان ہے عنقریب اسے اللہ تعالیٰ قتل کر دیں گے۔ (انتہی ملخصاً)
خرائطی کی یہ روایت اگر ثابت ہو جائے تو ممکن ہے "بشر" نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ اطلاع دی ہو تو اس کے بعد آپ نے اسے جاسوس بنا کر بھیجا ہوگا۔ تاکہ پتہ کرے کہ کیا وہ جمع ہو چکے ہیں؟ چنانچہ اس نے واپس آکر ان کے جمع ہونے کی خبر دی۔

جنگ کے بارے میں آپ کا صحابہ سے مشورہ کرنا: اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگو! مجھے مشورہ دو کیا یہ مناسب ہے کہ ہم ان کافروں کے اہل و عیال کو قتل کریں۔ پس اگر یہ لوگ ہمارے مقابلے میں آئے تو اس طرح اللہ تعالیٰ نے مشرکین کی ایک جاسوس جماعت کو منقطع کر دیا ہوگا۔ ورنہ ہم انہیں لٹا کر چھوڑیں گے

"محروبین" یعنی جن کے مال لوٹ لیے گئے ہوں، "چھین لئے گئے ہوں"۔ اور امام احمدؒ کی روایت میں ہے کہ "کیا تم یہ رائے دیتے
ہو کہ ہم ان لوگوں کے اہل وعیال کا رخ کریں جو ان قریش کی مدد کے لئے جمع ہوئے ہیں، پس ان پر حملہ کر دیں۔ پس اگر یہ بیٹھے رہے
تو لٹے پٹے اہل وعیال سے محروم ہو کر بیٹھیں گے اور اگر وہ آئے تو یہ ایک ایسی جماعت ہوگی جسے اللہ تعالیٰ
نے کاٹ ڈالا ہے۔" اور ایک روایت میں ہے: "کیا تمہاری رائے یہ ہے کہ ہم ان لوگوں کے اہل وعیال کا
رخ کریں جو ان کی مدد کو آئے ہیں، پس ہم ان کو گرفتار کر لیں۔ پس اگر وہ بیٹھے رہے تو اہل وعیال گنوا بیٹھیں گے۔ اور اگر وہ
بچ نکلے تو وہ ایسے لوگ ہوں گے جن کو اللہ تعالیٰ نے بچا لیا۔ یا تم یہ رائے دیتے ہو کہ ہم بیت اللہ کا رخ کریں پھر
جو آڑے آئے اس سے جنگ کریں" (اس اصل کتاب میں "فان لم یجیئوا" کا لفظ ہے جس کا ترجمہ کیا گیا مگر
بظاہر "لم" کا لفظ نہیں ہونا چاہیئے اور آگے حافظ کے کلام میں یہی عبارت آرہی ہے۔ اس میں "لم" کا لفظ
نہیں ہے۔ مترجم) میں کہتا ہوں کہ صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں: "پس فرمایا: اے لوگو! مجھے مشورہ دو، کیا تمہاری رائے
یہ ہے کہ میں ان لوگوں کے اہل وعیال کا رخ کروں جو ہمیں بیت اللہ سے روکنا چاہتے ہیں؟ پس اگر یہ لوگ ہمارے
مقابلہ میں آئے تو اللہ تعالیٰ مشرکین کی ایک جماعت کو الگ کر دے گا۔ ورنہ ہم انہیں اہل وعیال سے محروم
کر دیں گے" تو اس حدیث میں ہے کہ "ارشاد نبوی: ہم ان لوگوں کے اہل وعیال کا رخ کریں" اس سے مراد وہ کفار ہیں جو
قریش کی مدد کے لئے اکٹھے ہوئے تھے اور ان کے اہل وعیال پیچھے رہ گئے تھے۔ اور ارشاد نبوی "قطع عینا"
میں عینا سے جماعت مراد ہے۔ یعنی جب یہ کفار اپنے گھروں کی طرف لوٹ آئیں گے، تو اہل مکہ کے ساتھ ان میں
سے کوئی بھی نہیں رہے گا۔ جس سے ان کی جمعیت گھٹ جائے گی۔ اور ممکن ہے (کہ عین سے مراد جاسوس لیا
جائے) اور یہ مطلب ہو کہ جب یہ لوگ اپنے گھر لوٹ آئیں گے تو ہمیں مکہ میں جاسوس بھیجنے اور وہاں جنگ کرنے
والے کفار کے حالات معلوم کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی کیونکہ وہاں قریش کے علاوہ کوئی نہیں رہے گا اس
لئے جاسوس بھیجنے کی ضرورت نہ ہوگی کیونکہ وہاں قریش کے سوا کسی کا باقی نہ رہنا معلوم ہو چکا۔"

"قد قطع اللہ عینا" کا مطلب: اور ان کے حاشیہ میں ہے کہ اس حدیث میں جو "عینا" کا لفظ آیا ہے شارحین
نے اس کے چند معنی ذکر کئے ہیں، جو عنقریب ذکر ہوں گے۔ ان میں سے بعض قریب ہیں اور بعض بعید اور حضرت
شیخ نے عین کے معنی جماعت جو اختیار کئے ہیں اس ناکارہ کے نزدیک یہی راجح اور متعین ہے۔ کیونکہ "عین" بمعنی
جماعت بھی آتا ہے جیسا کہ قاموس میں ہے۔ اور اس کی تصدیق اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ بعض روایات میں
عینا کے بجائے عنقا کا لفظ آیا ہے۔ چنانچہ حافظ فتح میں فرماتے ہیں کہ امام احمدؒ کی روایت میں ہے کہ "وان یجیئوا

لہ یا تمہاری رائے یہ ہے کہ ہم بیت اللہ کا رخ کریں پھر جو شخص اس سے آڑے آئے اس سے لڑیں۔ تو ابوبکرؓ نے ... اے لوگو مجھے مشورہ دو

تکن عنقا قطعہا اللہ" اگر وہ لوگ اپنے گھروں کو لوٹ آئے تو ایک جماعت "عنقا" ہوگی جس کو اللہ تعالیٰ نے الگ کر دیا"۔ اور مغازی ابن اسحاق کی ایک روایت زہری سے بھی اسی شکل کی ہے۔ اور اس تقریر کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے مشورہ فرمایا کہ جو لوگ قریش کی مدد کے لئے جمع ہوئے ان کے گھروں پر حملہ کر کے ان کے اہل و عیال کو گرفتار کر لیا جائے۔ پھر اگر یہ لوگ اپنے اہل و عیال کی مدد کو آئے تو ان کو قریش سے توجہ ہٹانا پڑے گی۔ بدیں صورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کا مقابلہ بجز قریش سے رہ جائے گا۔ پس یہ مراد ہے آپ کے اس ارشاد سے کہ یہ ایک جماعت (عنق) ہوگی جس کو اللہ تعالیٰ نے الگ کر دیا ہے"۔ اھ اور مجمع میں ہے کہ "حدیث حدیبیہ میں آتا ہے: وان یحبوا یکن عنق قطعہا اللہ (اور اگر وہ بچ نکلے تو وہ ایک "عنق" گردن ہوگی جس کو اللہ تعالیٰ نے کاٹ دیا ہے) یہاں عنق سے مراد لوگوں کی جماعت ہے اور ایک حدیث میں ہے کہ "دوزخ سے ایک گردن نکلے گی" یہاں گردن سے ایک شخص یا جماعت مراد ہے"۔ اھ اور کرمانی میں خطابی سے نقل کیا ہے کہ محفوظ روایت یہ ہے: "کان اللہ قد قطع عنقا" یعنی اللہ تعالیٰ کفار کی ایک جماعت کو علیحدہ کر دیں گے جس سے ان کی تعداد گھٹ جائے گی اور ان کی قوت میں ضعف پیدا ہو جائے گا"۔ اور ابن قیمؒ نے بھی الہدی میں لفظ "عنقا" ہی اختیار کیا ہے۔ اور عینیؒ نے خطابی کا قول نقل کر کے آگے لکھا ہے "خلیل کہتے ہیں کہ جاء القوم عنقا کے معنی یہ ہیں کہ لوگ جماعت در جماعت آئے اور اعناق رؤسا کو کہتے ہیں"۔ اھ ابن قیمؒ اس قصہ کے فوائد میں لکھتے ہیں "منجملہ ان کے ایک یہ کہ مشرکین کے اہل و عیال اپنے مردوں سے تنہا ہوں تو انہیں ان کا مردوں سے قبل قید کیا جا سکتا ہے"۔

اس پر حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ تو اس بیت اللہ کا قصد کر کے نکلے تھے اس سفر میں کسی کو قتل کرنا اور لڑنا آپ کا مقصد نہ تھا۔ اس لئے آپ بیت اللہ ہی کا رخ کریں، پھر جو ہمیں روکے گا دیکھا جائے گا اور اس سے ہم نمٹ لیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو پھر اللہ کا نام لے کر چلو۔ یہ بخاری کی روایت ہے۔ حضرت شیخؒ اوجز میں تحریر فرماتے ہیں: حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس جنگ و قتال کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ کیونکہ اس صورت میں عمرہ کا ترک کرنا لازم تھا جب یہ حضرات عمرہ کے لئے نکلے تھے اور ان کے ہدیا ساتھ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمرہ کے لئے ہے۔ اب اگر عمرہ چھوڑ کر قتال مصروف ہو جاتے تو اس میں دھوکے کی سی شکل بن جاتی"۔ اھ اور زرقانی میں ہے کہ امام احمدؒ کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کسی کو اپنے رفقاء سے مشورہ کرتے ہوئے نہیں

دیکھا۔ آپ کا یہ عمل ارشاد خداوندی "وشاورھم فی الامر" (اور ان سے معاملات میں مشورہ لیا کیجئے) کے امتثال کی خاطر
تھا۔ حافظ نے کہا ہے کہ امام بخاری نے یہ حصہ اس کے مرسل ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا۔ کیونکہ زہری کو حضرت
ابوہریرہؓ سے سماع حاصل نہیں۔

اونٹنی کے بیٹھنے کا قصہ ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چلے یہاں تک کہ جب ثنیۃ المرار پہنچے، یہ وہ گھاٹی ہے جس سے
اہل مکہ کی طرف راستہ اترتا تھا۔ حافظ کہتے ہیں: "المرار" میم کے کسرہ و راء کی تخفیف کے ساتھ تہامہ کا راستہ جو حدیبیہ
جا پہنچتا ہے۔ اور داؤدی کا یہ خیال ہے کہ وہ اسفل مکہ کی گھاٹی کا نام ہے۔ میں کہتا ہوں کہ قصے میں ایک جگہ ارسیہ
کا جو لفظ ہے تو یہ کتابت کی غلطی ہے۔ تو آپ کی اونٹنی بیٹھ گئی۔ پس لوگوں نے کہا حل حل (دونوں میں حا کا فتحہ
اور لام کا سکون) اونٹ جب چلنے سے رک جائے تو اسے چلانے کے لئے یہ لفظ کہا جاتا ہے۔ مگر وہ بدستور بیٹھی
رہی۔ پس لوگوں نے کہا: خلأت القصواء، خلأت القصواء (قصواء اڑ کر بیٹھ گئی) تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا قصواء اڑی نہیں نہ اس کی یہ عادت ہے یعنی تھک کر بیٹھ جانا اس کی عادت نہیں جیسا کہ تم سمجھتے ہو بلکہ اس
کو ہاتھیوں کو روکنے والے نے روک دیا ہے۔ یعنی اللہ عزوجل نے اسے چلنے سے روک دیا ہے۔ اور فتح میں
اس کی شرح میں لکھا ہے: "یعنی حق تعالیٰ کی جانب سے بیت اللہ کی تعظیم پر تنبیہ تھی یہاں تک کہ اگر وہ بھی باوجود ذی عقل
ہونے کے اس کا شعور نہیں رکھتی تب تک کہ اسے یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ اس کا سوار (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم)
بیت اللہ کی بے حرمتی کا ارادہ نہیں رکھتے، لہٰذا بیت اللہ کے اطراف حرم کی چیزوں میں سے کسی چیز کی حرمت میں خلل ڈالنا چاہتا ہو"
ہاتھیوں کا تعلق یہ ہے، حافظ فرماتے ہیں: ہاتھیوں کا قصہ مشہور ہے اور یہاں اس کے ذکر کی مناسبت یہ ہے کہ اگر صحابہ
اسی حالت میں مکہ میں داخل ہوتے اور قریش انہیں روکنے کی کوشش کرتے تو جنگ و قتال کی نوبت آتی جو قتل و
غارت اور خون ریزی پر منتج ہوتی۔ نیز اس موقع پر مکہ میں بہت سے کمزور مسلمان مرد، عورتیں اور بچے بھی موجود تھے۔
اب اگر صحابہ کرام حملہ آور ہوتے تو اندیشہ تھا کہ غیر شعوری طور پر ان ضعفاء مسلمین کا نقصان ہو جاتا جیسا کہ اللہ
تعالیٰ نے "ولولا رجال مؤمنون" الخ میں اسی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اور مہلب نے اللہ تعالیٰ پر حابس الفیل کے
لفظ کے اطلاق کو مستبعد سمجھتے ہوئے اس کی توجیہ کی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ہاتھی کو اللہ تعالیٰ کے حکم
نے روک لیا۔ اور مہلب کا تعاقب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر اس لفظ کا اطلاق جائز ہے بنا بریں یہ کہنا
صحیح ہو گا کہ اس اونٹنی کو اسی اللہ نے روک لیا جس نے ہاتھیوں کو روک دیا تھا۔ ہاں: اللہ تعالیٰ کا نام حابس الفیل
(ہاتھیوں کو روکنے والا) یا اس قسم کا نام رکھنا صحیح نہیں۔ ابن منیر نے یہی جواب دیا ہے اور یہ جواب ان کے مذہب

پچاس سو تھے۔ اور بعض نے براء بن عازب کا اور بعض نے عباد بن خالد کا نام ذکر کیا ہے اور الاستیعاب میں خالد بن عبادہ مذکور ہے۔ اور فتح میں فرماتے ہیں تطبیق یوں ممکن ہے کہ کنواں کھودنے وغیرہ میں ان سب حضرات نے حصہ لیا۔ حافظ لکھتے ہیں کہ مغازی ابی الاسود میں قصہ حدیبیہ کے سلسلہ میں حضرت براء بن عازب کی حدیث آتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کنوئیں پر بیٹھے پھر ایک برتن طلب فرمایا۔ اس میں کلی کی پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ پھر اسے کنوئیں میں ڈال دیا۔ پھر فرمایا کچھ دیر انتظار کرو۔ اس کے بعد صحابہ نے اس سے پانی نکالا اور خوب سیراب ہوئے۔ اور تطبیق اس طرح ممکن ہے کہ یہ دونوں قصے پیش آئے ہوں۔ اور واقدی نے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈول میں وضو کیا پھر اسے کنوئیں میں ڈال دیا اور ایک تیر نکال کر کنوئیں میں رکھ دیا۔ اور ابو الاسود نے عروہ سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈول میں کلی کی پھر اسے کنوئیں میں ڈال دیا اور اپنے ترکش سے ایک تیر نکال کر اس میں ڈالا اور دعا فرمائی۔ پس کنواں جوش مارنے لگا۔ پس یہ قصہ اس قصے کے علاوہ ہے جو عنقریب آنے والا ہے کہ لوگ پیاسے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک برتن رکھا تھا آپ نے اپنا دست مبارک اس میں رکھا تو پانی انگشتان مبارک کے درمیان سے چشموں کی طرح ابلنے لگا۔ الحدیث۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی انگشتان مبارک کے درمیان سے پانی پھوٹ نکلنے کا واقعہ اس کے علاوہ بھی کئی موقعوں پر پیش آیا۔ اور غزوہ حدیبیہ کے آغاز میں تم نے کہا کہ اس کے بعد حدیبیہ میں بارش بھی ہوئی تھی۔ الحدیث۔ اور بارش ہونے کا مذکورہ واقعہ مذکورہ بالا دونوں قصوں کے بعد ہوا تھا۔ فتح الباری کی عبارت ختم ہوئی۔

پس خلاصہ اس کے لئے یہ ہوا جوش مارنا یہاں تک کہ وہ اس سے واپس ہوئے یعنی سیراب ہو کر لوٹے۔ اور ابن سعد نے یہ اضافہ کیا ہے کہ یہاں تک کہ انہوں نے کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھ کر برتن بھرے۔ فتح میں اسی طرح ہے نیز حافظ مغازی میں حضرت جابرؓ کی حدیث جس میں برتن میں ہاتھ رکھنے کا قصہ آتا ہے کے ذیل میں فرماتے ہیں "یہ حدیث حضرت براءؓ کی حدیث کے مغائر ہے جس میں ذکر کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کا پانی کنوئیں میں ڈال دیا۔ اور ابن حبان نے ان دونوں کے درمیان یہ تطبیق دی ہے کہ یہ واقعہ دو مرتبہ پیش آیا اور کتاب المغازی میں یہ تفصیل آتی ہے کہ حضرت جابرؓ کی حدیث کے پانی پھوٹ نکلنے کا واقعہ اس وقت پیش آیا جب نماز عصر کے وقت وضو کی ضرورت ہوئی اور حدیث براءؓ کا قصہ عام ضروریات کے لئے پیش آیا اور یہ بھی احتمال ہے کہ جب آپ کی انگشتان مبارک کے درمیان سے بہت سا پانی پھوٹ نکلا اور تمام حضرات صحابہؓ وضو اور پینے سے فارغ ہو گئے تو آپ نے برتن کے باقی ماندہ پانی کو کنوئیں میں ڈال دینے کا حکم فرمایا جس سے اس کا پانی زیادہ ہو گیا۔"

اور امام احمد نے حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص چمڑے کا ایک برتن لایا جس میں معمولی پانی تھا اور پوری جماعت میں اس کے علاوہ پانی نہ تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ پانی ایک پیالے میں انڈیلا پھر آپ نے اس سے

خوب اچھی طرح وضو کیا پھر تیر اس پانی کے اندر ڈال دیا کہ تھوڑی دیر میں پانی جوش مارنے لگا اور لوگ اس پیالے پر ٹوٹ پڑے آپ نے یہ منظر دیکھا تو فرمایا: ذرا ٹھہر جاؤ، پھر اپنا دست مبارک پیالے میں ڈال کر فرمایا: لو اب خوب وضو کرو۔ حضرت جابر فرماتے ہیں "میں نے دیکھا کہ پانی کے چشمے آپ کی انگشتان مبارک کے درمیان سے ابل رہے تھے" حافظ نے لکھا ہے کہ آپ کی انگشتان مبارک سے پانی نکلنے کا واقعہ سفر و حضر میں کئی بار پیش آیا۔" اھ مختصراً

حدیبیہ میں بارش کا قصہ: میں کہتا ہوں کہ حافظ کے کلام میں اس طرف اشارہ ہے کہ ان دونوں قصوں کے درمیان بارش کا قصہ واقع پیش آیا اور اسی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نقل فرمایا، کہ صبح ہوئی تو میرے بعض بندے مجھ پر ایمان لانے والے اور بعض نے کفر کیا، الحدیث۔ یہ قصہ امام بخاری نے غزوۂ حدیبیہ میں حضرت زید بن خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حدیبیہ والے سال نکلے، ایک رات ہم پر بارش ہوئی پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں صبح کی نماز پڑھائی، پھر ہماری طرف متوجہ ہو کر فرمایا: جانتے ہو آج رب نے کیا فرمایا؟ ہم نے عرض کیا: اللہ ورسولہ اعلم (اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں) تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ صبح ہوئی تو میرے کچھ لوگ مجھ پر ایمان لانے والے تھے اور کچھ کفر کرنے والے، پس جس نے یہ کہا ہمیں اللہ کی رحمت، اللہ تعالیٰ کی روزی اور اللہ کے فضل و کرم سے بارش نصیب ہوئی وہ مجھ پر ایمان لایا اور ستاروں کا منکر ہو گیا، اور جس نے کہا کہ ہمیں فلاں ستارے کی بدولت بارش ملی وہ ستاروں پر ایمان لانے اور مجھ سے کفر کرنے والا ہو گیا۔" اوجز میں اس حدیث کی شرح اور اس کے مختلف الفاظ پر تفصیل سے کلام کیا ہے۔

آیت فدیہ کا نزول: نیز حدیبیہ ہی میں کعب بن عجرہ کا قصہ پیش آیا اور فدیہ والی آیت نازل ہوئی۔ چنانچہ امام بخاری نے حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ حدیبیہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس آکر کھڑے ہو گئے اور جوئیں میرے سر سے چہرے پر گر رہی تھیں، آپ نے فرمایا کیا تیرے سر کی جوئیں تجھے ایذا دے رہی ہیں؟ عرض کیا جی ہاں، فرمایا: تو سر منڈا لو۔ حضرت کعب فرماتے ہیں کہ یہ آیت میرے بارے میں نازل ہوئی "فمن کان منکم مریضا او بہ اذی من راسہ" الآیۃ۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین دن روزے رکھو اور ایک اور روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت کعب کو حدیبیہ میں سر منڈانے کا حکم فرمایا اور صحابہ کو یہ معلوم نہیں ہوا کہ انہیں یہیں احرام کھولنا ہو گا وہ تو یہ امید کئے بیٹھے تھے کہ مکہ میں داخل ہوں گے۔ الحدیث۔ اوجز میں اس قصہ کی روایت کے مختلف الفاظ تفصیل سے نقل کئے ہیں۔ مثلاً ان کے طریق کی روایت کے الفاظ یہ ہیں "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے (یعنی کعب بن عجرہ کے) پاس سے گزرے اور وہ بحالت احرام ہنڈیا کے پاس تھے"۔ اور ایک روایت میں ہے "میں ہنڈیا کے نیچے آگ جلا رہا تھا اور جوئیں میرے چہرے پر گر رہی تھیں"۔ اور ایک اور روایت میں ہے کہ "ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اور قاموس میں ہے کہ صید کا لفظ کسی چیز کی کثرت پر بھی بولا جاتا ہے اور اگر یہ معنی مراد ہوں تو صفت کی اضافت موصوف
کی طرف ہوگی یعنی عدد بیبہ کے بڑے بڑے چشمے۔ حافظ کہتے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں بہت سے پانی تھے اور یہ
کنویں کہ جس سے پانی پیتا بعض بہت چکے تھے، اس لئے مسلمان جب معمول پانی کے کنویں پر آتے تو ان کو پیاس نے ستایا
اور عمدہ کا قول پہلے گذر چکا ہے کہ کنویں جیسے کہ پانی پیتا بعض ابھی چکے تھے اور اس کے ساتھ اہل دلائل نے درود والے
جانوروں ہی میں آمعر المطافیل" اس کی شرح پہلے گذر چکی ہے اور وہ آپ سے لڑیں گے اور آپ کو بہت اذیت پہنچائیں
گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدیل کو جواب دیا اور فرمایا ہم کسی سے جنگ کرنے کے لئے نہیں آئے بلکہ عمرہ ادا
کرنے کے لئے آئے ہیں اور قریش کو جنگ نے نہایت ضعیف کر دیا ہے اور نقصان پہنچایا ہے یعنی جو لڑائیاں آپ کے اور قریش کے
درمیان بدر، احد اور خندق وغیرہ میں ہو چکی ہیں ان سے ان کی قوت ٹوٹ چکی ہے اور ان کے اموال تباہ و برباد ہو چکے
ہیں (فان شاءوا) پس اگر ان کی خواہش ہو تو میں ان سے ایک مدت کے لئے جنگ بندی کا معاہدہ کر لوں یعنی اپنے اور ان
کے درمیان ایک مدت مقرر کر دوں جس میں ہمارے اور ان کے درمیان جنگ موقوف رہے اور وہ مجھ اور دوسرے
لوگوں یعنی کفار عرب وغیرہ کو چھوڑ دیں پس اگر میں ان پر غالب آ گیا پھر اگر یہ بھی میری اس اطاعت میں داخل
ہونا چاہیں جس میں دوسرے لوگ داخل ہو گئے تو ایسا کریں۔ عینی کہتے ہیں کہ دوسری شرط کا پہلی شرط پر عطف ہے
اور "تو ایسا کریں" دونوں شرطوں کا جواب ہے۔ ورنہ اگر میں غالب نہ آیا تو ان کو راحت مل گئی کہ جنگ و قتال کی نوبت
نہ ہوگی۔ عینی کہتے ہیں "اگر کہا جائے کہ اس تردید کے کیا معنی ہیں (یعنی اگر میں غالب ہوا تو۔ اور اگر میں مغلوب
ہوا تو) جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قطعی یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ نصرت فرمائیں گے اور آپ ان پر غالب
آ سکیں گے۔ جواب یہ ہے کہ یہ بات مخاطب کے ذہن کی رعایت کرتے ہوئے علی سبیل الفرض اور بطور فرض فرمائی۔"
اور حافظ کہتے ہیں کہ اس نکتہ کی خاطر دوسری شق کو حذف کر دیا یعنی آپ پر دشمن کے غالب آنے کی تصریح نہیں
فرمائی۔ لیکن ابن اسحاق کی روایت میں یہ تصریح آئی ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں "پس اگر لوگوں نے مجھے صدمہ پہنچایا تو
قریش کی مراد بر آئے گی" پس ظاہر یہ ہے کہ کسی راوی نے بربنائے ادب کی خاطر اس کو حذف کر دیا ہے۔ اور اگر وہ ان کو صلح
سے انکار ہے تو اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں اپنے دین کی خاطر ان سے لڑتا رہوں گا یہاں
تک کہ میری گردن جدا ہو جائے۔ یہ کنایہ ہے قتل سے کیوں کہ مقتول کی گردن جدا ہو جاتی ہے۔ اور داؤدی کہتے
ہیں کہ اس سے مراد موت ہے۔ یعنی یہاں تک کہ میری موت واقع ہو جائے اور میں اپنی قبر میں تنہا رہ جاؤں اور ممکن
ہے یہ مراد ہو کہ آپ لڑتے رہیں گے خواہ ان کے مقابلہ میں تنہا رہ جائیں اور تنہا! اللہ تعالیٰ اپنے دین کی مدد کے بارے

میں اپنا کام پورا کر کے رہوں گا۔ مذکورہ بالا تمام واقعات کے الفاظ کے بعد اس جزم و یقین کے اظہار سے اس امر پر تنبیہ کرنا مقصود
ہے کہ پہلے جو بات بطور مقدمہ کے کہی گئی یعنی یہ فقرہ جو قریش کو کہی گئی وہ اس حقیقت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چند
اوصاف معلوم ہوتے ہیں: عقل و دوربینی، شجاعت، حکم خداوندی کے نافذ کرنے میں آپ کی پامردی اور استقامت اور قریش
کی تبلیغ کا حوصلہ، صلہ رحمی کی رعایت، اہل قرابت سے خیرخواہی اور شفقت۔ غیرت کہا کہ جو کچھ تم کہتے ہیں میں ان کو پہنچائے
دیتا ہوں۔ چنانچہ وہ آپ سے اجازت لے کر اپنے رفقاء سمیت رخصت ہوا یہاں تک کہ قریش کے پاس پہنچا۔ واقدی
کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ قریش کے کچھ لوگوں نے آپس میں مل کر کہا کہ یہ بدیل اور اس کے لوگ آرہے ہیں یہ چاہتے
ہیں کہ تم سے محمد کے احوال معلوم کریں، اپنا ان سے ایک حرف بھی مت پوچھو۔ بدیل نے دیکھا کہ یہ لوگ کچھ بھی دریافت
نہیں کرتے تو کہا کہ ہم اس شخص یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے تمہارے پاس آئے ہیں اور ہم نے اس کو ایک
بات کہتے سنا ہے اگر چاہو تو وہ تمہارے سامنے پیش کریں۔ اس پر ان کے کم عقل لوگوں نے ـــــ واقدی نے ان میں
سے عکرمہ بن ابی جہل اور حکم بن عاص کا نام ذکر کیا ہے ـ کہا ہمیں اس کی کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ واقدی نے یہ اضافہ کیا
کہ ہاں جناب اس طرف سے آئے کہ جب تک ہمارا ایک بھی آدمی زندہ ہے وہ اس سال ہرگز مکہ میں داخل نہیں ہو
سکتے۔ ان میں سے دانشمند لوگوں نے کہا ہاں لاؤ۔ یعنی جو کچھ اس سے سنا ہے اس کی خبر دو۔ اور واقدی کی روایت میں
ہے کہ عروہ بن مسعود ثقفی نے مشورہ دیا کہ وہ بدیل کی بات سن لیں، پسند آئے تو مان لیں ورنہ رد کردیں۔ اس پر صفوان اور
حارث بن ہشام بولے کہ جو کچھ تم نے دیکھا ہے بیان کرو۔ بدیل نے کہا کہ میں ان صاحب یعنی محمد کے پاس آیا ہوں چنانچہ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا تھا اس سے خبردار کر دیا۔ ابن اسحق نے اپنی روایت میں یہ اضافہ کیا کہ بدیل
نے ان سے کہا کہ تم لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جلد بازی کر رہے ہو وہ جنگ و قتال کے لئے نہیں آئے بلکہ صرف عمرہ کرنے
کے لئے آئے ہیں۔ پس ان لوگوں نے بدیل کو مشتبہ نظر سے دیکھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس کا جھکاؤ آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کی طرف ہے۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ اگر بات یہی ہے جو تو کہتا ہے۔ یعنی وہ عمرہ کے لئے آئے ہیں تب بھی وہ
تو زبردستی ہم پر داخل نہیں ہو سکتے۔ پس عروہ بن مسعود ثقفی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات سے زیادہ پہلے اسلام
لا چکے تھے اپنی قوم میں واپس جا کر انہوں نے اسلام کی دعوت دی تو قوم نے ان کو شہید کر دیا۔ اور آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم نے فرمایا کہ ـــــ اپنی قوم میں یہ ایسے ہی تھے جیسے صاحب یٰس ہیں جن کا واقعہ سورۂ یٰس میں ذکر کیا گیا
ہے عروہ نے کھڑے ہو کر کہا: اے قوم! کیا تم والد نہیں ہو یعنی میرے لئے والد کی طرح شفیق نہیں ہو؟ لوگوں نے کہا: بے شک
اور اس نے کہا کیا میں بیٹا نہیں ہوں؟ یعنی ایسا خیرخواہ جیسا کہ بیٹا باپ کا خیرخواہ ہوتا ہے؟ لوگوں نے کہا

بے شک۔ اور یونس کی روایت میں اس کے برعکس ہے کہ کیا تم بیٹے نہیں ہو؟ کیا میں باپ نہیں ہوں؟ و شیخ محقق
اس کے قول کہ کیا تم بیٹے نہیں ہو؟ پر فرماتے ہیں۔" ابن ہشام کی روایت میں اس کے برعکس ہے اور دونوں کے معنے
وجہ صحت موجود ہے۔ لیکن اگر روایت اُمّ۔ بیٹا ہونے کی ہو تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی والدہ سُبَیعہ عبد شمس
کی بیٹی تھی۔ لہٰذا وہ قریش کے نواسے ہوئے، اور اگر والد ہونے کی روایت صحیح ہو تو یہ صرف عمر میں بڑا ہونے کے
لحاظ سے اور اس سے غرض اپنی ذات سے تہمت کا دفع کرنا ہے تاکہ وہ جو خبر بھی لائے اسے علیحدہ جانبداری پر محمول نہ کیا
جائے" اور مانع کے حاشیہ میں فتح سے نقل کیا ہے کہ صحیح روایت یہی ہے کہ "کیا تم باپ اور میں بیٹا نہیں ہوں؟" اس
نے کہا کہ کیا تم مجھے متہم سمجھتے ہو یعنی کیا تم کو مجھ پر تہمت شبہ ہے وہ بولے نہیں، آپ پر کوئی شبہ نہیں اور ابن اسحٰق کی
روایت میں ہے کہ وہ بولے تم جو کہتے ہو تم ہمارے نزدیک متہم نہیں ہو۔" اس نے کہا کہ کیا تم نہیں جانتے کہ میں نے
اہل عکاظ (یعنی عکاظ منڈی کے لوگ) بغیر تشدید کے آخر میں ظا سے غیر منصرف ہے) کو اکٹھا کیا تا کہ تمہاری مدد کی
دعوت دی۔ پھر جب انہوں نے میری بات نہیں مانی تو میں اپنے اہل و اولاد اور اپنے اہل طاعت لوگوں کو لے کر تمہارے
پاس آگیا؟ انہوں نے کہا: بالکل صحیح۔ اس نے کہا ان صاحب نے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہارے سامنے
بھلائی کی بات یعنی خیر، وصلح اور رشد کی بات کی پیش کش کی ہے اس کو قبول کر لو۔ ابن اسحاق نے بیان کیا ہے
کہ عروہ نے اصل مدعا سے پہلے جو باتیں کہیں ان کا سبب یہ تھا کہ جو شخص مسلمانوں کے پاس سے ہو کر آتا قریش کا
رویہ اس کے حق میں بڑا شدید ہو جاتا تھا اور ابن اسحٰق کی روایت میں عروہ سے پہلے کرز اور اس کے بعد حلیس کے
جانے کا ذکر ہے اور ظاہر ہے کہ "صحیح" کی روایت زیادہ صحیح ہے۔ اب مجھے اجازت دو کہ میں اس کے پاس جاؤں
قریش نے کہا تم جا سکتے ہو۔

عروہ کی آمد: چنانچہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی
قسم کی باتیں کرنے لگا جو بدیل نے کی تھیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی قسم کا جواب دیا جو بدیل کو دیا تھا
اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں ان سے لڑوں گا۔ اس وقت عروہ نے کہا: اے محمد صلی اللہ
علیہ وسلم دیکھئے اگر آپ نے اپنی قوم کا قصہ پاک کر دیا یعنی آپ نے ان کا بالکل ہی صفایا کر دیا تو کیا آپ نے اس
سے پہلے کسی عرب کو سنا ہے کہ اس نے اپنی ہی قوم کو تباہ کر دیا ہو اور اگر دوسری صورت ہوئی اس کا جواب ادب کی
بنا پر حذف کر دیا۔ مطلب یہ کہ اگر قریش کو غلبہ ہوا تو آپ کی حالت خطرے سے خالی نہیں اور اس کا آئندہ قول: کیونکہ
میں الخ: اس کی دلیل ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس نے اپنے خیال میں دونوں صورتوں کو غیر مستحسن قرار دیا کہ اگر آپ

غالب آئے تو آپ کی قوم تباہ ہو کر رہ جائے گی اور اگر آپ مغلوب ہوئے تو آپ کے صحابہؓ منتشر ہو جائیں گے
مگر یہ دونوں صورتیں شرعاً مستحسن ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "ہل تربصون بنا الا احدی الحسنیین" یعنی تم انتظار
نہیں کرتے ہمارے حق میں مگر دو خوبیوں میں سے ایک کا۔" کیونکہ بخدا میں چند چہرے دیکھ رہا ہوں" شیخ المشائخ حضرت
گنگوہیؒ لامع میں فرماتے ہیں "اس کا قول" میں چند چہرے دیکھ رہا ہوں" اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے آپ کے
ساتھ چند صورتیں ایسی بھی نظر آ رہی ہیں جن سے بھاگ جانا کچھ بھی مستبعد نہیں" اور اس کے حاشیہ میں ہے کہ اس
لفظ میں بخاری کے نسخے مختلف ہیں، اور شراح میں اس کے مفہوم و مصداق میں اختلاف ہے چنانچہ ہندوستانی
نسخوں میں اثبات کے ساتھ ہے علامہ فتح الباری کے نسخہ میں ہے "وانی لا اری" یعنی میں نہیں دیکھتا اور اسی طرح قسطلانی اور
سندھی کے نسخہ میں بھی نفی کے ساتھ ہے اور عینیؒ کی موافقت میں قسطلانی نے لفظ "وجوھا" کی شرح "اعیان
واشراف" کے ساتھ کی ہے، مگر حافظؒ نے اور اسی طرح کرمانی نے اس کی تشریح سے تعرض نہیں کیا۔ پس در صورت
اثبات اعیان و اشراف سے مراد قریش ہوں گے اور مطلب یہ ہوگا کہ قریش کے ساتھ تو اشراف اور سربرآوردہ
لوگ ہیں اور آپ کے ساتھ ہر قسم کے ملے جلے لوگ، شیخ الاسلام نے اپنی شرح میں اس تقدیر کے یہی معنی لئے ہیں اور
در صورت نفی اس سے مراد مسلمان ہوں گے، یعنی آپ کے ساتھ اعیان و اشراف نظر نہیں آ رہے بلکہ ادھر ادھر کے
آدمی ہیں اور شیخ قدس سرہ نے جو مطلب بیان فرمایا ہے وہ ہندوستانی نسخہ پر مبنی ہے جو اثبات کے ساتھ ہے یعنی
آپ کے ساتھ بے پہچانے چہرے نظر آ رہے ہیں جو موقع پر راہ فرار اختیار کر لیں گے اور صاحب فیض نے بھی یہی معنی
لئے ہیں، چنانچہ عروہ نے "وجوہ (چہروں) کی تفسیر "مختلف قبائل" کے ساتھ کی ہے، اور شیخؒ کے بیان کردہ
معنی سیاق کے زیادہ قریب ہیں کیونکہ یہ تمام نقول اس کے قول "اور اگر دوسری صورت ہوئی" کے تحت ذکر
کیا گیا ہے، اور حافظؒ کے کلام سے بھی یہی معنی نکلتے ہیں، چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ "اس کا قول" اور اگر دوسری
صورت ہوئی" کا جواب ذکر نہیں کیا گیا، مطلب یہ ہے کہ اگر قریش کو غلبہ ہوا تو آپ کی حالت خطرے سے خالی
نہیں اور اس کا قول "اور بخدا! مجھے آپ کے ساتھ چند چہرے نظر آ رہے ہیں" یہ گویا اس جواب محذوف
کی دلیل ہے۔" پوری بحث حاشیہ لامع میں دیکھی جائے۔ اور زرقانی شرح مواہب میں کہتے ہیں کہ بخاری
میں اسی طرح "وجوھا" کا لفظ اثبات کے ساتھ ہے اور مصنف یعنی قسطلانی نے اس کی شرح "اعیان
واشراف" کے ساتھ کی ہے، لہٰذا اس سے مراد قریش ہوں گے اور مطلب یہ ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کے اعداء تو اعیان و اشراف ہیں اور آپ کے صحابہ ملے جلے (مختلف قبائل کے گھٹیا درجہ کے سمجھے جانے والے لوگ

ہیں اور صحیح بخاری کے بعض نسخوں میں "نس" کی بجائے "لا" ہے جو "لا اری" کا تصحیف شدہ لفظ ہے۔ یعنی میں نہیں دیکھتا۔ اور
شارحین نے اس لفظ کو نقل کرنے پر کفایت کر کے اس کی تشریح میں تکلف کیا ہے کہ یہ صحابہ کے میدان جنگ سے ثابت
قدم نہ رہنے کی گویا دلیل ہے۔ لیکن اس سے ان کی توقع نہیں۔ نہ ثابت قدمی کا مظاہرہ کریں گے کیونکہ یہ ملے جلے
لوگ ہیں کسی ایک قبیلے کے افراد نہیں کہ ایک دوسرے کی مدد کے لئے میدان میں ڈٹ جانے کا جذبہ ان میں پایا
جاسکے۔ مگر چونکہ روایت اس لفظ کے ساتھ وارد نہیں۔ نہ شارحین نے اس پر کلام کیا ہے اور نہ نسخوں کے
اس کا ذکر کیا ہے۔ لہٰذا اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ اھ

ہمارا یہ کہنا کہ لفظ "لا" کا کوئی نسخہ نہیں، صحیح نہیں بلکہ عجیب ہے۔ کیونکہ فتح الباری، قسطلانی اور عینی
کا یہی نسخہ ہے۔ اور ان کا یہ کہنا کہ شارحین نے تکلف کیا ہے یہ بھی عجیب ہے کیونکہ یہی مطلب حافظ کے کلام
میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ شک میں ڈالتا ہوں کہ آپ کے ساتھ مختلف قسم کے لوگ "اشوابا" یہاں تک کہ
کہ تمام ہندی اور مصری نسخوں اور شروح کے نسخے اثبات کے ساتھ ہیں۔ اور حاشیہ لامع میں ہے کہ یہ لفظ اشوابا
میں شارحین کا اختلاف ہے۔ حافظ کہتے ہیں کہ متن والے سے پہلے ہے ان اکثر نسخوں میں یہی ہے اور صاحب
مشارق نے صرف اسی کو ذکر کیا ہے اور ابو ذر نے کشمیہنی سے "اوشابا" کا لفظ نقل کیا ہے۔ عینی
نے پہلے ذکر کیا ہے۔ اور عینی کہتے ہیں کہ خطابی نے کہا ہے کہ اشوابا سے مراد ملے جلے لوگ ہیں اور شوب کے
معنی ملانے کے اور ایک روایت میں تقدیم واؤ کے ساتھ "اوشاب" کا لفظ ہے۔ اور یہ بھی اسی کی مثل ہے
اور جب مختلف قبائل کے متفرق لوگ جمع ہوں تو ان کو اوشاب اور اشابات کہا جاتا ہے۔ اور ابوذر
کی روایت میں "اوباش" کا لفظ ہے اس سے مراد بھی مختلف قسم کے مخلوط لوگ ہیں۔ اھ۔ اور حافظ کہتے ہیں کہ وہ اشواب
سے دلچسپ ہے۔ حاشیہ لامع کی عبارت ختم ہوئی۔ اور آپ سے یہ بات مخفی نہیں رہی ہوگی کہ ابو ذر کی روایت
کے نقل کرنے میں حافظ اور عینی میں اختلاف ہو رہا ہے۔ اور قسطلانی نے ابوذر کی روایت نقل کرنے میں
حافظ کی پیروی کی ہے۔ اس کے بعد کہا ہے کہ ایک روایت میں ہے "اوباش" کا لفظ ہے یعنی لائق
ہیں کہ آپ کو تنہا چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوں گے اور ایک روایت میں ہے کہ "مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ
قریش سے اگر آپ کا مقابلہ ہوا تو یہ لوگ آپ کو بے مدد چھوڑ دیں گے اور آپ کو گرفتار کر لیا جائے گا۔
اس بدزبان گنوار کی بات آپ کے لئے اور کیا ہو سکتی ہے۔ عروہ کے اس قول سے معلوم ہوا کہ ان کے
ہاں یہ بات معروف تھی کہ جو لشکر مختلف قبائل سے ترتیب دیئے جائیں ان کے بھاگ جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔

اس کے برعکس یہ لشکر ایک ہی قبیلہ کا ہو جو وقت آنے پر بھاگنے سے عار کرتے ہیں اور عروہ کو یہ معلوم نہیں تھا کہ عرب
معلوم ہو کہ قرابت سے عظیم تر ہے اور یہ بات اس وقت اس کے سامنے کھل کر آگئی جب مسلمانوں کو
اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم میں مبالغہ کرتے دیکھا جیسا کہ خود اس کا اپنا بیان آگے آتا ہے۔ اس
پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اور ابن اسحاق کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ حضرت ابوبکر
صدیق رضی اللہ عنہ نے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے بیٹھے تھے، عروہ کی یہ بات سنی تو غصہ سے فرمایا
"لات کی شرمگاہ کو چوس" بظر: بفتح با اور سکون ظاء معجمہ اس قطعہ کو کہتے ہیں جو ختنہ کے بعد عورت کی شرمگاہ
میں باقی رہ جاتا ہے، اور لات ان کے ایک بت کا نام ہے جس کی پرستش قریش اور بنو ثقیف کرتے تھے۔ اہل
عرب جب کسی کو ماں کی گالی دیتے تو کہا کرتے تھے "فلاں شخص اپنی ماں کی شرمگاہ کو چوسے" حضرت ابوبکر
صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ماں کی جگہ ان کے معبود کا ذکر کرکے اس گالی کو اور زیادہ سخت بنا دیا اور یہ گالی
اس برہمی کا اظہار تھی جو مسلمانوں کی طرف فرار کو منسوب کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ اس سے یہ ثابت ہوا
کہ اس قسم کے گندے اور فحش الفاظ کا استعمال جائز ہے جب کسی ایسے شخص کو جو ایسے الفاظ کا مستحق ہے زجر کرنا مقصود ہو
پوری بحث حاشیہ لامع میں ہے۔ اور حافظ ابن قیم کہتے ہیں: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عروہ سے اس
درشت کلامی میں اس بات کی دلیل ہے کہ کسی مناسب موقع پر مصلحت کی خاطر اعضائے مستورہ کا نام صراحتاً ذکر
کرنے کی اجازت ہے۔ چنانچہ جو شخص دعوائے جاہلیت کرے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو بغیر کسی
اشارے کنائے کے صاف صاف کہو کہ اپنے باپ کی پیشاب گاہ کو منہ سے کاٹ، اس لیے ہر بات ہر موقع کے
مناسب ہونی چاہیے۔ "کیا ہم آپ سے بھاگ جائیں گے اور آپ کو تنہا چھوڑ دیں گے" استفہام انکاری ہے جس
سے مقصود عروہ کی اس مزعومہ توجیہ کا رد ہے کہ اس نے مسلمانوں کی طرف فرار کو کیوں منسوب کیا۔ عروہ نے کہا کہ یہ
کون ہے؟ جس نے اتنی سخت گالی دے ڈالی، اس کو بتلایا گیا کہ یہ ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں۔ اور ابن اسحاق کی روایت میں
ہے کہ اے محمد! یہ کون ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ ابو قحافہ کا بیٹا ہے۔ عروہ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں
دریافت کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے اس لئے

لہ امصص: بالف وصل وصادین مہملتین الاولی مفتوحۃ بصیغۃ الامر من مصص یمصص من باب علم یعلم وحکی ابن التین بضم الصاد الاولی
وخطأہ کذا فی الفتح [illegible] اھ

مسلمانوں کے قاصد کافروں کے پاس یا کافروں کے قاصد مسلمانوں کے پاس آئیں یا اور دوسرے ایام ہیں جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مذموم قرار دیا ہے اس کی مثال یہ ہے کہ تفاخر و تکبر لڑائی کے میدان میں مذموم نہیں۔ جب کہ دوسری جگہ مذموم ہے۔ ادر ان کے ہاتھ میں تلوار اور سر پر خود تھی یعنی مغیرہ مکمل طور پر مسلح تھے۔ ادر ایک روایت میں یہ ہے کہ مغیرہ نے جب عروہ کو آتے دیکھا تو اپنی زرہ پہن لی اور سر پر خود پہن لی تاکہ عروہ ان کو پہچان نہ سکے۔ میں کہتا ہوں کہ یہیں یہ اشکال ہے کہ حضرت تو احرام میں تھے پھر حضرت مغیرہ نے خود کیسے پہن لی۔ یہ سکتے ہیں کہ دیکھا کہ کبھی سے اس سے آتی نہ کیا ہو۔ اس سے خلاصی یوں ممکن ہے کہ ان کا یہ فعل مجبوری کی بنا پر تھا۔ جیسا کہ مریض کو بھی ہو جاتا ہے اگر ضرورت ہو تو ہے۔ پس جب بھی عروہ اپنا ہاتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک کی طرف بڑھاتا تو حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اجلال و تعظیم کے لئے اس کے ہاتھ پر تلوار کا نچلا حصہ مارتے اور تلوار کی نیام کے نیچے جو چاندی وغیرہ کی ہوتی ہے اسے نعل کہتے ہیں۔ وہ اس سے کہتے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش سے اپنا ہاتھ پیچھے رکھ۔ عروہ بن زبیر کی روایت میں یہ اضافہ ہے کیونکہ کسی مشرک کا اس لائق نہیں کہ اس کو ہاتھ لگائے۔ پس عروہ نے سر اٹھایا اور کہا یہ کون ہے؟ آپ نے فرمایا مغیرہ بن شعبہ۔ ادر ایک ادر روایت میں ہے کہ جب مغیرہ نے اس کے ہاتھ پر کئی بار تلوار ماری تو غضبناک ہو کر بولا کاش مجھے معلوم ہو جاتا کہ یہ کون ہے جو آپ کے صحابہ میں سے مجھے ایذا دیتا ہے۔ میرا خیال ہے تمہاری جماعت میں اس سے بدتر اور اس سے بڑھ کر کمینہ شخص کوئی اور نہ ہوگا۔ ادر ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسکرا دیئے تو عروہ نے آپ سے دریافت کیا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ کون ہے؟ آپ نے فرمایا یہ تیرا بھتیجا مغیرہ بن شعبہ ہے۔ پس عروہ نے کہا اے غدر۔ غدر بروزن عمر غادر سے معدول ہے ادر اس کے وصف میں مبالغہ مقصود ہے کیا میں تیری غداری میں کوشش نہیں کر رہا یعنی اس کا خون بہا دے کر اور تیری خیانت کے شر کو دفع نہیں کر رہا ہوں! وہاں کا قصہ یہ ہوا تھا کہ زمانہ جاہلیت میں مغیرہ ایک قوم کے ساتھ رفیق سفر ہوئے تھے ادر ان کو قتل کر کے ان کے اموال پر قبضہ کر لیا تھا۔ حافظ کہتے ہیں کہ واقعہ یہ ہوا تھا کہ وہ بنو مالک کے تیرہ افراد کے ساتھ مقوقس شاہ مصر کی ملاقات کے لئے گئے۔ بادشاہ نے ان کو عطیات سے نوازا مگر مغیرہ کو کم حصہ ملا۔ مغیرہ کو اس سے غیرت آئی۔ واپسی پر انہوں نے شراب پی سب مدہوش ہو کر سو گئے تو مغیرہ نے سب کو قتل کر دیا۔ ابن اسحٰق میں اس پر یہ اضافہ ہے کہ بنو مالک کو اس کی خبر ہوئی تو انہوں نے مغیرہ کے قبیلے سے لڑائی کی تیاری شروع کر دی تو عروہ بن مسعود نے بیچ میں پڑ کر لڑائی کی آگ کو ٹھنڈا کیا۔ ادر بنو مالک کو تیرہ مقتولوں کی دیت دینا منظور کیا۔ انہوں نے اس پر صلح کر لی۔ عروہ کے اس قول میں اسی بات کی طرف

اشارہ ہے۔ ۱ھ بعدازاں مغیرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ حاضر ہوئے اور مسلمان ہو گئے۔
پس حضرت ابوبکرؓ نے ان سے دریافت فرمایا کہ تو مالک کے جو لوگ تیرے ساتھ گئے تھے ان کا کیا ہوا؟ مغیرہؓ نے کہا
کہ میں نے ان کو قتل کر دیا اور ان سے چھینا ہوا مال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لایا ہوں کہ آپ اس
کے ذریعہ لوگوں سے جو سلوک فرمائیں یا جو آپ کی رائے ہو اس کے مطابق عمل کریں۔ پس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"اسلام تو قبول کرتا ہوں لیکن مال سے مجھے کوئی سروکار نہیں" یعنی اس سے کچھ تعرض نہیں کروں گا کیونکہ یہ غدر ہی کے ساتھ حاصل
کیا گیا ہے۔ اس سے کہ امن کی حالت میں کافر کا مال غدر (بد عہدی اور دھوکہ) کے ساتھ لینا جائز نہیں کیونکہ رفقاء کی
ایک دوسرے کے ساتھ رفاقت امانت پر مبنی ہوتی ہے اور جن کی امانت ہو ان کی امانت کا ادا کرنا لازمی ہے خواہ وہ
مسلمان ہوں یا کافر۔ اور کافر کا مال جنگ اور غلبہ کے ذریعہ حلال ہے۔ غالباً یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مغیرہؓ
ہی کے پاس رہنے دیا ہو تاکہ ممکن ہے اس کی قوم مسلمان ہو جائے تو ان کو واپس کر دیا جائے۔ ابن بطال نے حافظ کے کلام
سے اخذ کرتے ہوئے اسی طرح لکھا ہے۔ اور حضرت شیخ قدس سرہ نے بذل میں حافظؒ کا کلام ذکر کرنے کے بعد فرمایا
ہے کہ میں کہتا ہوں اس سے مستفاد ہوتا ہے کہ حصول مال کا ذریعہ اگر حرام ہو تو وہ مال بھی قرض ہوگا اس لئے یہ
مال حرام ہوگا یعنی کہ اتفاقاً کے۔ یہ اصل میں تو مباح تھا اس کی کوئی حرمت نہیں اس کے باوجود جب ذریعہ غدر
حاصل کیا جائے تو حرام ہے۔ البتہ اگر جنگ میں غلبہ کے ذریعہ حاصل کیا جائے، یا کافر کی رضامندی سے عقد فاسد
کے ذریعہ لیا جائے بشرطیکہ غدر نہ ہو تو جائز ہے۔ حافظ ابن قیمؒ لکھتے ہیں، "اس قصہ میں اس بات کی دلیل ہے کہ
جو مشرک سے معاہد ہو اس کا مال محفوظ و معصوم ہے اور کوئی شخص اس کا مالک نہیں ہو سکتا بلکہ اس مشرک کو واپس
کیا جائے گا۔ چنانچہ مغیرہؓ نے امان کی شرط پر ان سے رفاقت کی تھی پھر ان سے بد عہدی کر کے ان کے مال لے لئے۔
پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اموال سے تعرض نہیں فرمایا اور نہ ان کی مدافعت کی، نہ ان کے ضامن ہوئے
کیونکہ یہ قضیہ مغیرہؓ کے اسلام لانے سے قبل کا تھا۔" میں کہتا ہوں کہ اس پر ابوبصیر کے قصہ سے جو آگے آتا ہے
اشکال نہیں ہوگا کہ وہ بھی ان دو مشرکوں کے رفیق تھے جن کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو واپس
بھیجا تھا اس لئے کہ وہ اپنی رضامندی سے ان کے رفیق نہیں بنے تھے، بلکہ ان کے ہاتھ میں قیدی تھے اور حنفیہ کے
نزدیک قیدی کے لئے جائز ہے کہ وہ (کافروں کو) دھوکہ دے اور قتل کر دے۔

اور عینیؒ نے عمدۃ میں ذکر کیا ہے کہ خطیب نے اپنی تاریخ میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حق تعالیٰ کے
ارشاد وَمَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَل لَّهُ مَخْرَجًا (یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرے اللہ تعالیٰ اس کے لئے نکلنے کی

صورت پیدا فرما دیں گے) کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ یہ آیت عوف بن مالک اشجعیؓ کے حق میں نازل ہوئی۔ مشرکین نے ان کو قید کر لیا اور ان کو بھوکا رکھا، انھوں نے اپنے والد کو لکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ۔ آگے حدیث طویل ہے اور اس کے آخر میں ہے: اللہ تعالیٰ نے ان کی قید سے چھوٹنے کی صورت پیدا کر دی۔ پس وہ اُن کی وادی سے گزرے جن میں ان کے مال یعنی اونٹ بکریاں چر رہے تھے۔ وہ ان تمام مویشیوں کو ہنکا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے مجھے چھٹکارا دیا، بعد ازاں میں ان کے مویشیوں کو خفیہ طور پر ہنکا لیا، اب یہ حلال ہیں یا حرام؟ فرمایا: نہیں بلکہ حلال ہیں، ہم جب چاہیں ان کا خمس وصول کریں گے۔" الخ۔

پھر یہاں ایک اور واقعہ قابلِ ذکر ہے، وہ یہ کہ عروہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کے دوران آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ (کے معاملات) بغور دیکھتا رہا۔ اس کا بیان ہے کہ خدا کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تھوکا نہیں مگر وہ صحابہؓ میں سے کسی نہ کسی آدمی کے ہاتھ میں گرا اور اس نے بطورِ تبرک اس کو اپنے منہ اور جسم پر مل لیا اور ابن اسحٰق کی روایت میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی موئے مبارک نہیں گرا مگر صحابہؓ نے فوراً اسے لے لیا؛ اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کوئی حکم فرمایا تو آپ کے حکم کی تعمیل کے لئے ہر ایک نے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کی، اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا تو قریب تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعضاء مبارک سے گرنے والے پانی کے لئے لڑ پڑیں۔ اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بات کی اور ابن اسحٰق کی روایت میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے بات کی تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنی آواز کو نہایت پست رکھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کی بنا پر وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آنکھ بھر کر نہیں دیکھتے تھے یعنی مجال نہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نظر جمائے رکھیں۔ حافظ لکھتے ہیں: "اس میں تھوک اور جسم کے جدا ہونے والے بالوں کی طہارت نیز صالحین کے پاک فضلات سے تبرک حاصل کرنے کا ثبوت ہے۔ غالباً حضرات صحابہؓ نے یہ سب کچھ عروہ کے سامنے کیا اور اس میں خوب مبالغہ فرمایا، جس سے اس طرف اشارہ مقصود تھا کہ اس کا ان کی نسبت فرار کا خیال نہ سمجھے، گویا وہ زبانِ حال سے کہہ رہے تھے کہ جو شخص اپنے امام سے ایسی محبت رکھتا ہو اور اس کی اس درجہ تعظیم کرتا ہو اس کے بارے میں یہ گمان کیسے کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے امام کو چھوڑ کر بھاگ جائے گا، اور اسے دشمن کے حوالے کر دے گا، اور یہ صحابہ کرامؓ جس درجہ آپ پر جان نچھاور کرتے تھے اور آپ کی اور آپ کے دین کی مدد کے لئے سرکف ہیں، اس کے مقابلہ میں ان قبائل کی کیا وقعت ہے جن کو محض جوڑ

شخص نے کہا مجھے اجازت دو تو میں ان کے پاس جاؤں۔ انہوں نے کہا جاؤ۔ جب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ
وسلم کے قریب آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا یہ فلاں شخص ہے اور یہ لوگ ہدی کے جانوروں
کی بڑی تعظیم کرتے ہیں اس لیے یہ جانور اس کے سامنے کھڑے کر دو۔ چنانچہ ہدی کے جانور کھڑے کر دیئے گئے اور
لوگوں نے تلبیہ کہتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔ جب اس نے یہ منظر دیکھا تو کہا سبحان اللہ ان لوگوں کو بیت اللہ
سے روکنا ہرگز مناسب نہیں۔ اس کے بعد قریش نے حلیس کو بھیجا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ اس پر رقت
طاری ہو گئی اور اس کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ وہ کہنے لگا رب کعبہ کی قسم قریش ہلاک ہو گئے۔ یہ لوگ تو صرف عمرہ کے
لئے آئے ہیں۔ اور جب قریش کے پاس واپس گیا تو ان سے کہا میں نے دیکھا کہ ہدی کے اونٹوں کو قلادے پہنائے
ہوئے ہیں اور ان کا اشعار کیا ہوا ہے۔ اس لئے میری یہ رائے ہرگز نہیں کہ ان کو بیت اللہ سے روکا جائے۔ پھر قریش
نے حلیس بن علقمہ کو بھیجا۔ معالم التنزیل میں اسی طرح ہے اور روضۃ الاحباب میں حلیس اور بنو کنانہ کے آدمی کو ایک
قرار دیا ہے۔ اس کی عبارت یہ ہے کہ بنو کنانہ کے ایک آدمی نے جس کا نام حلیس تھا کہا۔ اور ایک روایت میں ہے حلیس
علقمہ نے کہا: مجھے اجازت دو میں آپ کے پاس جاتا ہوں۔ قریش نے کہا تم جا سکتے ہو۔

کنانی کی آمد: پس جب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ فلاں
شخص ہے اور یہ اس قوم کا فرد ہے جو ہدی کے اونٹوں کی بہت عزت کرتے ہیں۔ بُدن بدنہ کی جمع ہے۔ اونٹ کو کہتے ہیں
خواہ نر ہو یا مادہ۔ اور اس میں تا تانیث کی نہیں وحدت کی ہے۔ اس لئے تمام اونٹوں کو یک بارگی اٹھا کر اس کے
سامنے کھڑا کر دو۔ چنانچہ اونٹ کھڑے کر دیئے گئے تاکہ وہ انہیں دیکھ کر عبرت پکڑے اور اسے ثابت ہو جائے کہ یہ لوگ
لڑائی کے لئے نہیں آئے۔ اور کہا جاتا ہے کہ قربانی کرنے میں ان کی مدد کرے۔ حافظ مغلطائی اور ابن اسحاق کی روایت میں
یہ الفاظ ہیں کہ جب اس نے ہدی کے اونٹوں کو قلادے پہنے ہوئے وادی کے کنارے سے اپنی طرف سیلاب کے پانی
کی طرح بہتے ہوئے دیکھا۔ جن کو اپنے محل سے روکا گیا تھا تو وہیں سے لوٹ گیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک
بھی نہیں پہنچا۔ لیکن صاحب مواہب نے عروہ سے روایت کی ہے جو حاکم سے مروی ہے کہ حلیس نے چیخ کر کہا رب کعبہ کی قسم قریش
ہلاک ہو گئے۔ یہ لوگ صرف عمرہ کرنے کے لئے آئے ہیں۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا ہاں اے بنو کنانہ
کے بھائی (یعنی اس قوم کے فرد) ان کو یہ بات بتا دیجئے۔ پس ممکن ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دور ہی سے اس کو
مخاطب فرمایا ہو۔ اور لوگوں نے یعنی صحابہؓ نے اس کا تلبیہ کہتے ہوئے استقبال کیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ کسی دینی
مصلحت کے لئے ایسا جائز ہے جیسا کہ علماء نے صراحت کی ہے لیکن اہل بدعت کی تعبیر کے ہدی جیسا کہ ابن حجر اور قسطلانی

کہتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ لڑائی میں خفیہ طور سے کام لینا اور ایک چیز کا ارادہ ظاہر کرنا جب کہ مقصود اس کے خلاف کچھ
اور ہو جائز ہے۔ اور حافظ ابن قیمؒ کہتے ہیں کہ "قریش کے اس قاصد کے سامنے اونٹوں کے کھڑا کرنے میں اس امر کی دلیل ہے
کہ کفار کے قاصدوں کے سامنے شعائر اسلام کا اظہار مستحب ہے۔" پس جب اس کنانی نے یہ منظر دیکھا تو وہ از راہ تعجب
بولا: سبحان اللہ! ان لوگوں کو بیت اللہ سے روکنا ہرگز مناسب نہیں! حافظؒ کہتے ہیں کہ "اس سے معلوم ہوا کہ بعثت سے
قبل کافر بھی حرم اور احرام کی حرمت کی تعظیم بجا لاتے تھے اور جو شخص اس سے روکتا اس پر نکیر کرتے تھے اور یہ حضرت ابراہیم
علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے دین کے باقی ماندہ آثار میں سے تھے۔" پس جب وہ اپنے ساتھیوں یعنی اہل مکہ کی طرف لوٹ کر
گیا تو کہا میں نے دیکھا ہے کہ اونٹوں کے قلادے پہنائے ہوئے ہیں اور ان کا اشعار کیا ہوا ہے۔ پس میں یہ رائے نہیں
رکھتا کہ انہیں بیت اللہ سے روکا جائے۔ ابن اسحاق کی روایت میں مزید یہ ہے کہ "وہ بولے، بیٹھ جا! تو تو نرا گنوار ہے
کچھ جانتا نہیں" اور اسی کی ایک روایت میں ہے کہ اس پر حلیس غصہ سے بھڑک اٹھا اور بولا ہے۔ "اے جماعت قریش!
بخدا ہم نے تم لوگوں سے اس مقصد کے لئے دوستی نہیں کی نہ معاہدہ کیا کہ جو شخص بیت اللہ کی تعظیم کے لئے آیا کرے،
اسے روک دیا جائے۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں حلیس کی جان ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس مقصد کے لئے آئے
ہیں انہیں یا اس بات کی اجازت دینا ہوگی، ورنہ میں سارے احابیش کو ایک آدمی کی طرح یہاں سے لے کر چلا جاؤں گا۔ اب
قریش (کھسیانے ہو کر) بولے حلیس، ذرا ٹھہرو، یہاں تک کہ ہم اپنی ذات کے لئے کوئی پسندیدہ صورت اختیار
کر لیں" اور سیرت ابن ہشام میں ہے کہ "ابن اسحاق نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خراش بن امیہ الخزاعی کو
بلایا اور ان کو ثعلب نامی ایک اونٹ پر سوار کرکے قریش کے پاس بھیجا۔ تاکہ وہ اشراف قریش کو اطلاع کر دے کہ آپ
کس مقصد کے لئے آئے ہیں تو قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اونٹ کو زخمی کر دیا اور خراش کو بھی قتل کرنا چاہا
مگر احابیش ان کے آڑے آئے تو قریش نے اس کا راستہ چھوڑ دیا، یہاں تک کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس
پہنچ گیا۔" اور زرقانی کے لفظ یہ ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ میں فروکش ہوئے تو آپ کو مناسب معلوم
ہوا کہ قریش کے پاس ایک قاصد بھیجا جائے جو ان کو اطلاع دے کہ آپ عمرہ کے لئے تشریف لائے ہیں چنانچہ خراش
بن امیہ خزاعی کو اپنے اونٹ پر بھیجا، پس عکرمہ بن ابو جہل نے اونٹ زخمی کر دیا اور قریش نے خراش کو قتل کرنا چاہا لیکن
احابیش نے اس کی حفاظت کی اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس واپس آ گئے الخ" پہلا واقعہ گزر گیا آگے اور [illegible] میں
ہے کہ "قریش نے چالیس یا پچاس آدمی بھیجے اور انہیں حکم دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لشکر کا چکر لگائیں تاکہ آپ
کے کسی صحابی کو پکڑ کر لا سکیں، مگر یہ لوگ خود سب کے سب پکڑے گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر کر دیا۔ اور

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد کر دیا تھا۔ یہاں اس امر پر تنبیہ ضروری ہے کہ حسب تحقیق علامہ ان صاحب فتح البیان
کو قریش کے پاس بھیجا گیا تھا جنہوں نے ذکر کیا ہے۔ فابینا بابا ان کی تصحیف ہے جس میں بنا ہو ان کا۔ حتی علامہ زرقانی
حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ہو الذی کف ایدیہم عنکم الآیہ کے ذیل میں متعدد روایات ان لوگوں کے بارے میں ذکر کی ہیں جن
کو صحابہ کرامؓ نے حدیبیہ میں گرفتار کیا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد کر دیا تھا اور ان کے بارے
میں یہ آیت نازل ہوئی من جملہ ان کے ایک حدیث مسلم، ابی داؤد اور ترمذی وغیرہ نے حضرت انسؓ سے روایت
کی ہے وہ فرماتے ہیں "حدیبیہ کے دن اہل مکہ کے اسی آدمی مسلح ہو کر جبل تنعیم کی جانب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
اور صحابہؓ کی طرف اترے۔ ان کا مقصد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر دھوکہ سے حملہ کرنا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے ان کے پکڑنے کا حکم دیا۔ چنانچہ وہ پکڑے گئے پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو معاف کر دیا۔ پس یہ آیت
نازل ہوئی۔ الخ۔ ابن اسحاق صاحب تحقیق کہتے ہیں کہ "جب خراش واپس آئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت
عمر بن خطاب کو بلایا تاکہ انہیں مکہ بھیجا جائے۔ انہوں نے کہا کہ مجھے قریش سے جان کا خطرہ ہے اور مکہ میں
بنو عدی بن کعب کا ایک فرد بھی ایسا نہیں جو میری حفاظت کر سکے اور قریش کو معلوم ہے کہ مجھے ان سے کتنی
عداوت ہے اور میں ان پر کتنا سخت ہوں، مگر آپ کو میں ایک ایسا شخص بتاتا ہوں جو مکہ میں مجھ
سے زیادہ معزز ہے اور وہ عثمان بن عفان ہیں۔"

حضرت عثمانؓ کا مکہ جانا: چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمانؓ کو بلایا اور انہیں ابو سفیان اور
اشراف قریش کی طرف یہ پیغام دے کر بھیجا کہ آپ جنگ کے لئے نہیں آئے بلکہ محض بیت اللہ کی زیارت اور اس
کی حرمت و تعظیم کے لئے آئے ہیں اور البدایہ میں یہ اضافہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمانؓ سے فرمایا:
انہیں بتاؤ کہ ہم جنگ کے لئے نہیں بلکہ عمرہ کے لئے آئے ہیں نیز ان کو اسلام کی دعوت دو اور آپ نے ان سے یہ بھی فرمایا کہ مکہ میں
جو مومن مرد اور عورتیں ہیں ان کے پاس جاؤ اور انہیں فتح کی خوشخبری دو اور انہیں بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ مکہ میں اپنے دین
کو غالب کر دے گا۔ یہاں تک کہ وہاں کسی کو اخفائے ایمان کی ضرورت نہ رہے گی۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ مکہ گئے
راستہ میں مقام بلدح پر قریش کی ایک جماعت پر ان کا گزر ہوا۔ انہوں نے دریافت کیا کہ کہاں جا رہے ہو؟ حضرت
عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا ہے کہ تمہیں اللہ کی طرف اور اسلام کی طرف دعوت
دوں اور تمہیں آگاہ کر دوں کہ ہم لڑائی کے لئے نہیں بلکہ صرف عمرہ ادا کرنے آئے ہیں۔ وہ بولے ہم نے تیری بات
سن لی پس تم اپنے کام کے لئے جاؤ۔ اور وہاں ابان بن سعید نے ان کا اٹھ کر استقبال کیا۔ ان کو خوش آمدید کہا
اور اپنے گھوڑے پر زین کسی اور حضرت عثمانؓ کو اپنے گھوڑے پر سوار کر لیا۔ اھ۔

اور البدایہ میں ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مکہ کی طرف نکلے جب مکہ میں داخل ہوئے یا داخل ہونے
سے پہلے ہی ان کو ابان بن سعید ملا اس نے آپ کو اپنے آگے سوار کیا اور ان کو پناہ دی تاکہ وہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچا دیں۔ اور ابن اسحاق کے علاوہ دوسروں کی روایت میں ہے کہ ابان نے ان
سے یہ بھی کہا کہ با خوف و خطر چلو پھرو۔ اور کسی کا خوف مت رکھو۔ بنو سعید حرم میں سب سے معزز ہیں اور
حضرت عثمانؓ چلے یہاں تک کہ مکہ میں داخل ہوئے ابو سفیان اور دیگر اشراف قریش سے ملاقات کی اور انہیں رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچایا۔ پس انہوں نے آپ سے متعدد مرتبہ کہا اور جب آپ اپنے پیغام سے فارغ ہوئے
اور واپسی کا ارادہ کیا تو قریش نے کہا کہ تم چاہو تو بیت اللہ کا طواف کر سکتے ہو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا
جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طواف نہیں کر لیتے میں بھی طواف نہیں کر سکتا۔ اس پر قریش چپ ہو گئے
اور انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنے پاس روک لیا۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آنے میں تاخیر ہوئی
تو مسلمانوں نے کہا کہ عثمانؓ تو خوش قسمت ہیں وہ کعبہ چلے گئے اور شاید تنہا طواف کریں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ
وسلم نے فرمایا ہرگز نہیں وہ تنہا طواف نہیں کر سکتے۔ اور البدایہ میں ہے کہ جب بیعت لے لی گئی تو حضرت
عثمان واپس لوٹے۔ مسلمانوں نے ان سے کہا اے ابو عبداللہ آپ نے تو بیت اللہ کے طواف سے خوب جی ٹھنڈا
کیا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا آپ حضرات نے میرے حق میں بہت برا گمان کیا۔ اس ذات کی قسم جس
کے قبضہ میں میری جان ہے اگر میں وہاں ایک سال بھی ٹھہرا رہتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ میں فروکش ہوتے تب
بھی جب تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طواف نہ کر لیتے میں بھی طواف نہ کرتا اور مجھے تو قریش نے بیت اللہ
کے طواف کی دعوت دی تھی مگر میں نے صاف انکار کر دیا۔ یہ سن کر مسلمانوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
ہماری نسبت اللہ تعالیٰ کو زیادہ جانتے ہیں اور ہم سے زیادہ خوش گمان ہیں۔

بیعت رضوان: اور جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ روک لئے گئے تو یہ افواہ مشہور ہوئی کہ حضرت عثمانؓ قتل
کر دیئے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ شیطان نے مسلمانوں کے لشکر میں بلند آواز سے اعلان کیا کہ اہل مکہ نے عثمانؓ کو قتل کر دیا
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو یہ خبر سن کر بہت صدمہ ہوا۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا
کہ اب ہم ان لوگوں سے دو دو ہاتھ کئے بغیر نہیں جائیں گے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو بیعت
کے لئے بلایا۔ پس ان سے بیعت لی کہ وہ قریش سے قتال کریں گے اور ان کے مقابلے میں میدان سے منہ نہ پھیریں
گے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیکر یا بیری کے درخت کے نیچے تشریف فرما تھے۔

زرقانی کی عبارت جو ابھی اوپر گزر چکی ہے اس کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت
عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو بلایا۔ انہوں نے عذر پیش کیا کہ اہل مکہ سے ان کی جان محفوظ نہیں اور آپ سے حضرت عثمانؓ
کا ذکر کیا کہ وہ وہاں معزز ہیں پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بلایا اور انہیں ایک گرامی نامہ دیا اور انہیں
حکم فرمایا کہ مکہ کے کمزور مرد و عورتوں کو خوشخبری دیں کہ عنقریب اسلام کی فتح ہو جانی ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین
کو سربلند فرمائیں گے۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ عازم مکہ ہوئے۔ بلدح نامی جگہ میں قریش سے ملاقات ہوئی۔
ان کا متفقہ فیصلہ تھا کہ یہ مکہ نہیں جائیں گے مگر ابان بن سعید نے ان کو پناہ دی اور اپنے گھوڑے پر سوار کیا چنانچہ
مکہ گئے۔ ابوسفیان اور سردار قریش سے ملے اور ایک ایک کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گرامی نامہ پڑھ کر سنایا مگر
انہوں نے قبول نہیں کیا بلکہ یہ اصرار کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سال مکہ نہیں آسکتے اور حضرت عثمانؓ کو طواف
کی پیشکش کی۔" اس کے بعد حضرت عثمانؓ کے طواف سے انکار کا واقعہ مفصل ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں "اور
جب صلح نامہ کی تحریر مکمل ہو رہی اور لوگ اس کے نفاذ کے منتظر تھے اچانک ایک فریق کے کسی آدمی نے دوسرے
فریق کے کسی پر پتھر پھینک دیا۔ اس کے نتیجہ میں تیروں اور پتھروں سے مقابلہ شروع ہو گیا ہر فریق کے پاس دوسرے
فریق کے لوگ تھے ان کو روک لیا گیا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سہیل بن عمرو وغیرہ کو اور مشرکین نے
حضرت عثمان کو روک لیا ــــــ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی کہ عثمانؓ قتل کر دیئے گئے تو آپ نے
لوگوں کو بیعت رضوان کے لئے بلایا۔"

اور تحقیق یہ ہے کہ سب سے پہلے بیعت رضوان بنو اسد کے ایک شخص ابوسنان بن وہب نے کی۔ اور جتنے
مسلمان وہاں تھے ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں تھا جس نے بیعت نہ کی ہو سوائے جد بن قیس انصاری جو بنو سلمہ کا
ایک فرد تھا۔ اپنے اونٹ کے نیچے چھپ گیا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں "وہ منظر گویا اب بھی میری
آنکھوں کے سامنے ہے کہ وہ لوگوں سے چھپ کر اپنی اونٹنی کی بغل سے چمٹا ہوا ہے۔" اور حضرت انس رضی اللہ عنہ
سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ
علیہ وسلم کے کام میں گئے ہیں۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے داہنے ہاتھ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا یہ
عثمان کا ہاتھ ہے۔ پھر اپنے دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھ کر فرمایا یہ عثمانؓ کی جانب سے بیعت ہے۔ اور حضرت
عثمانؓ کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دست مبارک لوگوں کے اپنے ہاتھوں سے بدرجہا بہتر تھا۔" البدایہ
میں بھی اسی طرح ہے۔ اور اس میں یہ اضافہ ہے کہ حضرت سلمہ بن الاکوع نے تین بار بیعت کی لوگوں کے اول میں بھی درمیان
میں بھی اور آخر میں بھی۔" اور یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے دو مرتبہ بیعت کی ایک مرتبہ اپنے والد

غالباً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اسی طرف واقعہ کی طرف مشیر ہے۔ الخ یعنی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بات چیت کرنے لگا۔ ابن اسحاق نے یہ اضافہ کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی وہی جواب دیا جو بدیل کو دے چکے تھے۔

سہیل کی آمد: ابھی گفتگو کے دوران اچانک سہیل بن عمرو بن الحارث آگیا۔ ان کا لقب خطیب قریش ہے سوائے پہلے کفر میں تھے پھر بدر میں ... فتح مکہ کے سال اسلام لائے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ان کا اسلام بہت ہی عمدہ تھا اور ابن شاہین نے روایت کیا ہے کہ سہیل کہتے ہیں: اللہ کی قسم میں نے مشرکین کی حمایت میں جتنے اور جہاد میں جتنے معرکے انجام دیئے سب مسلمانوں کی حمایت میں ایک ایک کا قرض ادا کروں گا۔ اور مشرکین کی معیت میں میں نے جتنا مال خرچ کیا اسی قدر مسلمانوں پر بھی خرچ کروں گا۔ اکثر علماء کے نزدیک ۱۸ھ کی طاعون عمواس میں ملک شام میں ان کا انتقال ہوا اور بعض کہتے ہیں کہ جنگ یرموک میں شہید ہوئے۔ اور ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ قریش نے سہیل کو بھیجا اور کہا کہ ان صاحب (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جا کر ان سے صلح کرلو۔ پھر جب سہیل آیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارے لئے تمہارا کچھ کام سہل ہو گیا ہے۔ شیخ لامع میں فرماتے ہیں "تمہارا کچھ کام سہل ہو گیا" کیونکہ آپ نے اس کے دوبارہ آنے سے اندازہ کر لیا تھا کہ قریش صلح کی جانب مائل ہیں۔ اور یہ نیک فال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے نام سے اخذ کی تھی۔ اور اس کے حاشیہ میں مشکوٰۃ سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نیک فال کو پسند فرماتے تھے۔ اور "من" تبعیضیہ کے ساتھ "من امرکم" (تمہارا کچھ کام) فرما کر اس طرف اشارہ کیا کہ اس قصہ میں حاصل ہونے والی سہولت کچھ زیادہ عظیم نہیں ہے اور بعض نے کہا ہے کہ غالباً یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سُہَیل کی تصغیر سے اخذ کیا۔ کیونکہ اس کی تصغیر کا تقاضہ یہ تھا کہ یہ سہولت زیادہ نہ ہو۔ الخ اور زرقانی کہتے ہیں کہ ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا تو گھٹنے ٹیک کر دو زانو ہو بیٹھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چار زانو تشریف فرما تھے اور عباد بن بشر اور سلمہ بن اسلم آہنی لباس میں سر سے پاؤں تک غرق آپ کے سر پر کھڑے تھے اور مسلمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد حلقہ کئے بیٹھے تھے۔ الخ دونوں کے درمیان بات چلی۔ اور سہیل نے دیر تک بات کی اور سوال و جواب ہوتا رہا۔ اور خمیس میں ہے کہ جب سہیل آپ کے پاس پہنچا تو کہا: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم قریش آپ سے صلح کرنا چاہتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ آپ کو اس سال لوٹ جانا ہوگا۔ الخ اور حضرت جابرؓ نے اس سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے

نیز کر کا بعض حصہ ثابت ہوا۔“

<u>کتنی مدت کے لئے کافروں سے صلح کرنا جائز ہے</u> : حافظؒ کہتے ہیں کہ اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ مشرکین سے کتنی مدت تک کے لئے صلح کا معاہدہ صحیح ہے، چنانچہ بعض فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے مطابق دس سال سے زائد کی صلح نہ ہونی چاہیئے، یہ امام شافعیؒ کا قول ہے اور بعض کہتے ہیں کہ دس سال سے زیادہ بھی صحیح ہے بعض نے زیادہ سے زیادہ چار سال، بعض نے تین سال، اور بعض نے دو سال مدت صلح تجویز کی ہے، مگر پہلا قول راجح ہے۔ اھ اور نوویؒ کہتے ہیں ”کفار سے صلح کرنا جب کہ مسلمانوں کی مصلحت اس کی مقتضی ہو بوقت ضرورت بالاتفاق جائز ہے اور ہمارا مذہب یہ ہے کہ صلح دس سال سے زیادہ کی نہ ہو بشرطیکہ امام کو اس پر غلبہ نہ ہو اور اگر امام کو غلبہ ہو تو چار مہینے سے زیادہ کی صلح نہ کرے۔ اور ایک قول میں ایک سال سے کم جائز ہے۔ اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اس کے لئے کوئی حد متعین نہیں بلکہ امام کی رائے کے موافق قلیل و کثیر مدت کے لئے صلح جائز ہے۔“ اھ

اور ابی نے بھی امام مالکؒ کا مسلک اسی طرح نقل کیا ہے اور ابن قیمؒ الہدی میں کہتے ہیں ”اس قصہ میں یعنی صلح حدیبیہ کے قصے میں اس امر کی دلیل ہے کہ صلح کا معاہدہ مطلقاً صحیح ہے اور اس کے لئے کوئی مدت مقرر متعین نہیں ہے۔ بلکہ جتنی مدت کے لئے امام چاہے صلح کر سکتا ہے۔ اس قصہ کے بعد کوئی حکم ایسا نہیں آیا جو اس حکم کے لئے ناسخ ہو اس لئے یہی صحیح ہے کہ صلح جائز اور صحیح ہے اور مزنی کی روایت کے مطابق امام شافعیؒ نے بھی دوسرے مواقع میں اس کی تصریح کی ہے۔ اور موفقؒ کہتے ہیں ”بغیر تعیین مدت کے صلح جائز نہیں کہ اس کا نتیجہ مطلقاً ترک جہاد ہوگا“ ایک اور جگہ کہتے ہیں ”عقد صلح صرف معلوم اور معین مدت تک کے لئے صحیح ہے جیسا اس دلیل کے جو ہم نے ذکر کی ہے۔ اور قاضی کہتے ہیں کہ امام احمدؒ کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ دس سال سے زیادہ کی صلح جائز نہیں، یہی ابو بکر کا مختار اور یہی شافعیؒ کا مذہب ہے۔ کیوں کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ”اقتلوا المشرکین حیث وجدتموهم“ عام ہے۔ جس سے دس سال کی مدت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قریش سے دس سالہ مصالحت کی بنا پر مخصوص ہے۔ اس سے زائد اپنے مقتضائے عموم پر رہے گا۔ اور ابوالخطاب کہتے ہیں کہ امام احمدؒ کے کلام کا ظاہر ہے کہ امام کی صوابدید کے مطابق دس سال سے زیادہ کی صلح بھی جائز ہے اور امام ابو حنیفہؒ کا بھی یہی قول ہے۔ کیوں کہ عقد اجارہ کی طرح جب یہ عقد دس سال کے لئے جائز ہے تو اس سے زیادہ کے لئے بھی جائز ہی ہوگا۔ اور عام سے دس سالہ مدت کی تخصیص ایک علت پر مبنی ہے جو دس سال

سے زیادہ میں بھی پائی جا سکتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ مصلحت کبھی زیادہ مدت کے لئے صلح کی متقاضی ہوا کرتی
ہے۔ اھ

اور ہدایہ میں ہے: "جب امام کی رائے ہو کہ اہل حرب سے یا ان کے کسی فریق سے صلح کرے اور اس میں
مسلمانوں کی مصلحت ہو تو اس کا مضائقہ نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وان جنحوا للسلم فاجنح لها وتوکل
علی اللہ" (وہ اگر صلح کی طرف مائل ہوں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس کی طرف مائل ہو جائیے اور اللہ تعالیٰ پر
بھروسہ کیجئے) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے سال اہل مکہ سے مصالحت کی تھی کہ ان کے اور آپ
کے درمیان دس سال تک جنگ موقوف رہے گی۔ اور اس لئے کہ مصالحت بھی معنی جہاد کے حکم میں ہے
جب کہ وہ مسلمانوں کے حق میں بہتر ہو۔ کیونکہ مقصود، کہ وہ دفع شر ہے، اس سے بھی حاصل ہو جاتا ہے اور حکم
صلح صرف اسی مدت تک محدود نہیں جو روایت میں وارد ہے۔ کیونکہ علت اس سے زائد کی طرف بھی
متعدی ہے۔ بخلاف اس صورت کے کہ وہ مسلمانوں کے حق میں بہتر نہ ہو تو جائز نہیں۔ کیونکہ یہ صورۃً اور
معنًا ترک جہاد ہے۔ اھ

صلح نامہ کی تحریر کا آغاز: پس سہیل نے کہا لائیے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اور ہمارے درمیان
تحریر لکھ دیں۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کاتب کو بلایا۔ یہ حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ تھے۔
جیسا کہ امام بخاریؒ نے کتاب الصلح میں براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے، اسی طرح عمر بن شبہ نے سلمہ بن اکوع
رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ اس کے برعکس عمر بن شبہ کی ایک روایت سہیل بن عمرو سے روایت کی ہے
کہ وہ تحریر ہمارے پاس موجود ہے جس کو محمد بن مسلمہ نے تحریر کیا تھا۔ (اس روایت سے مفہوم ہوتا ہے کہ صلح
نامہ حضرت علیؓ نے نہیں بلکہ محمد بن مسلمہ نے لکھا تھا) ان دونوں میں تطبیق یوں ہوگی کہ اصل صلح نامہ تو حضرت
علی رضی اللہ عنہ نے تحریر کیا تھا۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے اور اس کی ایک نقل محمد بن مسلمہ نے سہیل کے لئے
لی تھی۔ اور عمر بن شبہ کی ایک روایت میں کاتب کا نام ہشام بن عکرمہ ذکر کیا گیا ہے۔ یہ وہم اور صریح غلط ہے۔
کیونکہ جو صحیفہ ہشام نے لکھا تھا یہ وہ تحریر تھی جو قریش نے متفقہ طور پر بنو ہاشم کو شعب ابی طالب میں
محصور کرتے وقت لکھی تھی۔ میں نے اس پر تنبیہ کی ضرورت اس بنا پر محسوس کی تاکہ بعض ناواقف کو یہ دھوکا
نہ ہو جائے کہ قصہ حدیبیہ کے کاتب میں اختلاف ہے۔ یہ بات حافظؒ نے لکھی ہے۔ زرقانی میں اسی طرح ہے۔
پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لکھو بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ پس سہیل نے اور اس کے رفقاء نے

جیسا کہ صحیح میں ہے کہا گیا تھا : میں نہیں جانتا رحمٰن کیا چیز ہے ۔ اور ایک روایت میں ہے کہ سہیل نے کہا :
یمامہ والے صاحب کے سوا کسی رحمٰن کو نہیں جانتا کہ رحمٰن کیا ہوتا ہے لیکن باسمک اللّٰہم لکھئے جیسا کہ آپ ابتداء اسلام
میں لکھا کرتے تھے ۔ جاہلیت میں بھی اسی کے لکھنے کا دستور تھا اور آیت نمل کے نزول تک آنحضرت صلی اللہ علیہ
وسلم کا بھی یہی معمول تھا ۔ مگر جب آیت نمل نازل ہوئی تو آپ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھنے لگے ۔ اس
سے ان لوگوں پر جاہلی نخوت سوار ہوئی ۔ اور ـــــــــــــ ۔ ۔ ـــ ـــ حضرت
انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ سہیل نے کہا : ہم نہیں جانتے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کیا چیز ہے ،
لیکن آپ وہ لفظ لکھئے جس کو ہم جانتے پہچانتے ہیں یعنی باسمک اللّٰہم ۔ اور حاکم کے الفاظ بروایت عبد اللہ بن
مغفل رضی اللہ عنہ یہ ہیں : سہیل نے اس کا (کاتب کا) ہاتھ پکڑ لیا اور کہا باسمک اللّٰہم لکھیے جس کو ہم جانتے
ہیں ۔ مسلمانوں نے کہا : " اللہ کی قسم ! ہم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہی لکھیں گے ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :
نہیں ! باسمک اللّٰہم ہی لکھو چنانچہ یہی لکھا گیا جیسا کہ حاکم کی روایت ہے ۔ لیکن ان حضرات نے اپنی قسم کا لحاظ
ادا نہیں کیا ۔ کیونکہ ان کی نیت یہ تھی کہ جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قطعی حکم نہیں ہوتا ہم یہی لکھیں
گے ۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی سے فرمایا : لکھو ! یہ وہ تحریر ہے ۔ اشارہ ذہن میں مستحضر
مضمون کی طرف ہے جس پر مصالحت کی قاضی : فاعل کے وزن پر ، قضیت الشئ کے معنی ہیں : کسی چیز کا فیصلہ
کرنا ۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۔ مستدرک حاکم میں عبد اللہ بن مغفل کی روایت ہے : " یہ کتاب
سے لکھو کہ یہ وہ تحریر ہے جس پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہل مکہ سے مصالحت ہوئی ۔ " اس روایت
سے معلوم ہوا کہ فیصلہ سے مراد مصالحت ہے اور امام بخاری نے اس پر ترجمۃ الباب قائم کیا ہے ۔ کیف
یکتب ہذا ما صالح فلان بن فلان وان لم ینسبہ الی قبیلتہ او نسبہ " یعنی اس امر کا بیان کہ کیسے لکھا جائے کہ یہ وہ چیز
ہے جس پر مصالحت کی فلاں بن فلاں نے ، اگرچہ اس کو اس کے قبیلہ کی طرف منسوب کرے یا اس کا نسب ذکر
کرے ۔ " حضرت شیخ ؒ لامع میں اس ترجمہ کی شرح میں فرماتے ہیں : " نسب وغیرہ کا ذکر تعیین اور رفع ابہام
کے لئے ہوتا ہے ۔ اور اگر یہ تعیین اس کے بغیر ہی حاصل ہو تو نسبت ذکر کرنے کی ضرورت نہیں " ۔ اور اس کے
حاشیہ میں ہے کہ حافظ ؒ لکھتے ہیں : " یعنی جب وہ اس کے بغیر مشہور ہو کہ کسی طرح کے التباس کا اندیشہ نہ ہو
تو دستخط میں صرف مشہور نام کا ذکر کر دینا ہی کافی ہے ۔ نہ اس کے باپ دادے کا ذکر کرنا ، اسی طرح نسبت اور شہرت کا
ذکر کرنا ضروری نہیں ۔ اور فقہاء کا یہ کہنا کہ دستخط میں اس کا نام ، اس کے باپ دادے کا نام ، نسبت وغیرہ کا ذکر کیا

جائے۔ یہاں صورت میں ہے کہ التباس کا اندیشہ ہو اور اگر اندیشہ نہ ہو تو صرف استحباب کا درجہ رکھتے ہیں۔ اسکے
بعد سہیل نے کہا: "خدا! اگر ہم آپ کو اللہ کا رسول سمجھتے تو آپ کو بیت اللہ سے نہ روکتے نہ آپ سے جنگ و قتال
کی نوبت آتی۔" اور بخاری میں ہے کہ اس نے کہا کہ "ہم آپ کو اس حیثیت سے تسلیم کرتے نہیں، اگر ہمیں آپ
کا رسول ہونا تسلیم ہوتا تو آپ کو بیت اللہ سے نہ روکتے اور نہ لڑائی کرتے بلکہ آپ سے بیعت کر لیتے۔"

اور بخاری کی الادب المفرد میں ہے کہ سہیل نے کہا: "اگر ہم آپ کو رسول اللہ تسلیم کرتے ہوتے تو بیت اللہ
سے نہ روکتے پھر تو ہم نے آپ پر بڑا ظلم کیا۔" اور حیثیت میں خود انہی سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے جب صلح نامہ میں "محمد رسول اللہ" نہ جانے "محمد بن عبداللہ" لکھوایا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہو کر
فرمایا: "اے علی! تجھے بھی ایک دن اسی قسم کا واقعہ پیش آئے گا۔" اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ اس
واقعہ کی طرف ہے کہ جب جنگ صفین کے بعد حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان مصالحت
ہوئی اور کاتب نے صلح نامہ میں یہ عبارت لکھی: "یہ وہ تحریر ہے جس پر امیر المومنین حضرت علیؓ نے مصالحت کی"
تو حضرت معاویہؓ نے فرمایا: "امیر المومنین نہ لکھئے، اگر میں آپ کو امیر المومنین تسلیم کرتا تو آپ سے جنگ کیوں
کرتا؟ اس کی جگہ لکھئے علی بن ابی طالب لکھئے۔" جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ سنا تو انہیں حدیبیہ
کے دن کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان یاد آیا اور فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا تھا۔ علی بن ابی
طالب ہی کے محصور زرقانی کہتے ہیں کہ نسائی نے بروایت علیؓ یہ الفاظ نقل کیا ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا کہ تجھے بھی اسی قسم کا واقعہ پیش آئے گا اور تجھے مجبوراً کرنا پڑے گا۔" یہ اسی واقعہ کی طرف اشارہ تھا
جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تحکیم کے دن پیش آیا کہ جب کاتب نے یہ تحریر کیا تھا: "یہ وہ مصالحت ہے جس پر ....
امیر المومنین حضرت علیؓ نے مصالحت کی۔" تو حضرت معاویہؓ نے پیغام بھیجا کہ اگر میں آپ کو امیر المومنین
جانتا تو تحکیم کی نوبت کیوں آتی؟ اس لفظ کو مٹا دیجئے اور اس کی جگہ علی بن ابی طالب کا لفظ لکھئے۔ یہ سن کر
حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اللہ اکبر کہا۔ اور فرمایا ٹھیک وہی بات ہوئی جس کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے
پیشگوئی فرمائی تھی۔ "اس لفظ کو مٹا دو" بلکہ اس کی جگہ محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لفظ لکھئے۔ اور
ایک روایت میں ہے کہ اپنا اور اپنے باپ کا نام لکھئے۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خدا کی
قسم! میں یقیناً اللہ کا رسول ہوں، اگرچہ تم مجھے جھٹلاتے رہو۔ اس کی جزا محذوف ہے یعنی تب بھی میری
رسالت کو ضرر نہیں۔ پھر حضرت علیؓ سے فرمایا: اس لفظ کو مٹا دو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: بے

تو اس کو مٹا نہیں سکتا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ نہیں! اللہ کی قسم! میں آپ کے نام کو کبھی نہیں مٹا سکتا۔ علماء فرماتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ طرز عمل ادب مستحب کے باب سے ہے کہ کسی بزرگ شخصیت کی جانب سے کسی بات کا حکم ہوا، مامور یہ سمجھے کہ امر قطعی نہیں، اور اس میں بظاہر خلاف ادب امر کا ارتکاب ہے، تو مامور کو توقف کرنا چاہئے جب تک معاملہ کی صحیح نوعیت سامنے نہیں آجاتی۔ تو تقابل میں اسی طرح ہے۔ اور احادیث میں ہے حضرت عبدالرحمن بن عوف کی امامت کے وقت میں تو اس پر اشکال ہوتا ہے کہ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ اپنی نماز میں بدستور مشغول رہے، اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اسی قسم کا واقعہ پیش آیا تو وہ پیچھے ہٹ گئے۔ اس کا سبب ہے کہ جواب یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ یہ سمجھے کہ جو امر غیر واجب ہو وہاں تعمیل حکم کے بجائے رعایت ادب بہتر ہے۔ اور حضرت عبدالرحمن نے اس کے بجائے امتثال امر کو ترجیح دی" اھ۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو خود مٹایا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا، مجھے اس لفظ کی جگہ دکھاؤ ——— چنانچہ آپ کو وہ لفظ دکھایا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مٹادیا۔ امام نووی فرماتے ہیں، ان دونوں باتوں میں سہیل کی ضد کو تسلیم کرلینا اس بنا پر تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ وہ مجھ سے جس بات کا بھی مطالبہ کریں گے جس کے ذریعہ اللہ کی حرمات کی تعظیم مقصود ہو، میں ان کا مطالبہ ضرور پورا کروں گا" پس اس جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جانب سے کا لفظ لکھا۔ اور بخاری کی کتاب المغازی کی روایت میں ہے کہ، پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیفہ خود لیا، اور آپ کتابت نہیں جانتے تھے، پس آپ نے تحریر فرمایا، یہ وہ تحریر ہے جس پر محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مصالحت کی"۔ اور شیخ قدس سرہ لامع میں فرماتے ہیں، "راوی کا قول، پس آپ نے تحریر فرمایا، الخ، صحیح تو یہ ہے کہ آپ کی طرف نسبت کتابت مجازی ہے اور اس کو حقیقت پر محمول کرکے معجزہ قرار دینا مناسب نہیں، کیوں کہ اگر آپ نے خود اپنے دست مبارک سے لکھا ہوتا تو کفار کہہ بیٹھتے کہ امر تو یہ تھا کہ آپ کو لکھنا آتا ہے اور اس سے ان کی بدگمانی اور پختہ ہوجاتی کہ آپ، معاذ اللہ، شاعر اور کاتب ہیں، کتابیں پڑھ پڑھ کر بتاتے ہیں اور یہ خلاف مقصود ہے"۔ اھ اور لامع کے حاشیہ میں ان حضرات کے نام ذکر ہیں جو ان دونوں اقوال کے قائل ہیں یعنی یہ معجزہ تھا یا مجاز پر محمول تھا، اور فریقین کے دلائل بھی خوب تفصیل سے ذکر کئے ہیں، جس کا جی چاہے وہاں دیکھ لے۔ پس جب کہ سہیل کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شرط یہ ہوگی کہ تم ہمارے لئے بیت اللہ جانے کا راستہ خالی کردو تاکہ ہم اس کا طواف کرسکیں۔ پس سہیل نے کہا اللہ کی قسم ہرگز

نہیں، ہم آپ کو بیت اللہ جانے کی اجازت ہرگز نہیں دے سکتے، ورنہ عرب باتیں کیا کریں گے۔ محققین کہتے ہیں
کہ اس کا قول "عرب باتیں کریں گے" جملہ مستانفہ ہے اور "ہرگز نہیں" کے تحت میں داخل نہیں۔ "ہرگز نہیں" کا
مدخول محذوف ہے یعنی ہم آپ کو بیت اللہ جانے کی اجازت ہرگز نہیں دیں گے اور بعض لوگوں نے گمان کیا
ہے کہ "ہرگز نہیں" کا لفظ بعد کے فقرے (عرب باتیں کیا کریں گے) پر داخل ہے اور مطلب یہ ہے کہ عرب
ہرگز باتیں نہیں کریں گے۔ اور نہ ہم انہیں موقع دینا چاہتے ہیں اور پہلی توجیہ سب سے بہتر ہے" اھ

میں کہتا ہوں کہ جس احتمال کو محققین نے رد کیا ہے۔ وہ بھی محتمل ہے۔ چنانچہ امام بخاریؒ نے کتاب الانبیاء
"باب ما ینہی من دعوی الجاہلیۃ" میں حضرت جابر بن عبداللہؓ سے ایک مہاجر کے انصاری کو مارنے کا قصہ ذکر
کیا ہے۔ اس میں حضرت عمرؓ کا یہ سوال مذکور ہے کہ آپ اس کو قتل کیوں نہیں کر دیتے؟ اس کے جواب میں آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لا یتحدث الناس انہ کان یقتل اصحابہ" (یعنی نہیں! مبادا لوگ یہ کہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ
وسلم اپنے صحابہ کو قتل کرتے ہیں) شیخؒ فتح الباری میں فرماتے ہیں: "احتمال ہے کہ دونوں کو ایک ہی کلمہ قرار دیا جائے
یعنی تحدث کی نفی ہو" اور اس کے حاشیہ میں ہے کہ "حافظ کہتے ہیں کہ قتادہ کی مرسل روایت میں یہ الفاظ ہیں "لا واللہ
لا یتحدث الناس" اس سے شیخ کے کلام کی تائید ہوتی ہے" اھ ملخصاً اور امام بخاریؒ نے "کتاب الایمان والنذور
کے آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے "نعم لتلقی الکبادۃ" (انہیں لکھا ہے کہ علماء اور
حاشیہ لامع میں اس پر تفصیل سے کلام ہے کہ یہ ایک جملہ ہے کہ دو جملے ہیں؟ عام شارحین نے اس کو ایک جملہ قرار
دیا ہے اور میں نے اس کو ترجیح دی ہے کہ دو جملے ہیں۔ ان میں سے ایک کے متعدد نظائر ذکر کیے ہیں۔ مثلاً ان
کے مسجد میں گم شدہ چیز کی تلاش کرنے والے کے بارے میں فرمایا "لا ردہا اللہ علیک" (یعنی تلاش مت کر، واپس کر
دے اللہ تعالیٰ تیری چیز) وغیرہ۔ گو ہم سے یہ دونوں توجیہات منقول ہیں۔ اور ابن اسحاق کی روایت میں ہے
کہ "آپ ہم پر بزور قوت داخل ہو گئے" لیکن یہ لیکن آپ کے عمرہ کا ارادہ آئندہ سال پورا ہو گا۔ چنانچہ آپ
نے یہی لکھوا دیا۔

صلح نامہ کی ایک اہم شرط : پس سہیل نے کہا اور یہ شرط ہے یہ پہلی شرط پر معطوف ہے کہ آپ کے
پاس ہمارا جو آدمی بھی آئے خواہ وہ آپ کے دین پر ہو، آپ اس کو ہمارے پاس واپس کر دیں گے۔ بخاری
کی کتاب الشروط میں حضرت مسورؓ کی ایک طویل حدیث کے ضمن میں اسی طرح ہے۔ نیز امام بخاری کی
کی ایک روایت میں کتاب الشروط کے شروع میں یہ الفاظ ہیں: "اور نہیں آئے گا ہم میں سے کوئی فرد" الخ۔ ہم

الفاظ مردوں کو بھی شامل ہیں اور عورتوں کو بھی۔ اس لئے عورتیں بھی اس معاہدہ صلح میں داخل تھیں۔ مگر بعد میں
اُن کے حق میں معاہدہ منسوخ ہو گیا یا (یہ کہا جائے کہ) عورتیں بطریق عموم ہی اس میں داخل تھیں، پھر ان کو عموم
میں تخصیص کر دی گئی اور ابن اسحاق کی روایت میں عربی یہ ہے کہ " اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین میں سے جو
شخص قریش کے پاس آ جائے وہ اسے واپس نہیں کریں گے " اور مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ۔
قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شرائط مصالحت کی یہ کہ تم میں سے جو شخص ہمارے یہاں آ جائے ہم اسے واپس
نہیں کریں گے اور ہمارا آدمی جو تمہارے پاس آئے تمہیں واپس کرنا ہوگا "

پس صحابہ نے (ازراہ حیرت و تعجب) عرض کیا یا رسول اللہ کیا ہم یہ (صریحاً جانبدارانہ شرط بھی) لکھ لیں؟
فرمایا: ہاں! کیونکہ ہمارا جو آدمی ان کے یہاں چلا جائے (ہمیں اس کی ضرورت کیا ہے) اللہ تعالیٰ اس کو دور ہی
رکھے۔ اور جو شخص ان کے یہاں سے ہمارے پاس آئے (ہم معاہدہ کے مطابق اس کو واپس کر دیں گے) عنقریب
اللہ تعالیٰ اس کے لئے کشائش اور نکلنے کی صورت پیدا فرما دیں گے " اھ

<u>عورتیں اس شرط میں داخل نہیں تھیں</u> ۔ اور یہاں دو نقطہ نظر ہیں جن پر فتح الباری اور اس کے حاشیہ میں
مفصل کلام کیا گیا ہے۔ اول یہ کہ کیا عورتیں بھی اس شرط میں داخل تھیں اور پھر نزول آیت سے اس سے مستثنیٰ ہو گئیں
یا یہ کہ وہ شروع ہی سے معاہدہ میں داخل نہیں تھیں؟ اس ناکارہ کے نزدیک راجح یہ ہے۔ جیسا کہ فتح کے
حاشیہ میں یہ دونوں قول، جو سندی کے کلام میں ابھی اوپر گزرے ہیں، مفصل نقل کرنے کے بعد ذکر کیا ہے
کہ چونکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں عورتوں کو اس سے مستثنیٰ کرنا مقصود تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ صورت پیدا
کر دی کہ معاہدہ ان الفاظ میں ہوا " ہمارا جو آدمی آپ کے پاس آئے الخ " جیسا کہ بخاری کی روایت میں ہے
مگر انہوں نے اس سے عموم سمجھا کیونکہ عورتیں مردوں کے تابع ہوا کرتی ہیں اس لئے بعض راویوں نے
اس کو عموم کے الفاظ سے نقل کر دیا پھر جب عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے آیت امتحان نازل
فرما کر اس پر تنبیہ کر دی کہ معاہدہ صرف مردوں سے مخصوص ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ معاہدہ کا اصل لفظ ان تین
لفظوں میں سے ایک ہوگا۔ یعنی کوئی مرد، کوئی فرد، جو شخص (رجل، احد، من) اور رجل کا لفظ زیادہ قرین
قیاس ہے کیونکہ مشرکین کو اس میں منازعت کا حق نہیں تھا اور اس سے عموم سمجھنا ان کے فہم کا قصور تھا، اور
اللہ تعالیٰ علام الغیب تھے اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا لفظ الہام فرمایا جو مقصود سے زیادہ
قریب تھا۔

کیا صلح میں ایسی شرط رکھنا اب بھی جائز ہے؟ ۔ بحث دوم یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے
بعد اس شرط پر صلح کا معاہدہ جائز ہے یا نہیں کہ مسلمانوں کو کافروں کی طرف واپس کر دیا جائے گا؟ شیخ قدس سرہ
لامع میں فرماتے ہیں " یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی دوسرے کے لئے جائز نہیں کیوں کہ جس شخص
کو واپس کیا جائے گا اس کی حالت پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا (کہ وہ اپنے اسلام پر قائم رہ سکے گا یا نہیں) اس
لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی دوسرے کا ایسی صلح کرنا خلاف مقتضی شرع ہے" اھ اور لامع کے
حاشیہ میں ہے کہ عینی لکھتے ہیں: " اس شرط پر مشرکوں سے صلح کرنے میں علماء کا اختلاف ہے، چنانچہ ایک قوم کا قول یہ
ہے کہ یہ جائز نہیں، اور یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے منسوخ ہے کہ " میں ہر اس مسلمان سے بری
ہوں جو کسی کافر کے ساتھ دار الحرب میں قیام پذیر ہو" اور مسلمانوں کا اجماع ہے کہ دار الحرب سے ہجرت کرنا تمام
مردوں اور عورتوں پر فرض ہے، یہ کوفیین اور امام مالکؒ کا قول ہے، اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حکم مردوں
کے حق میں منسوخ نہیں مگر اس قسم کے معاہدہ کا حق صرف خلیفہ کو ہے یا ایسے شخص کو جو خلیفہ کی طرف سے مامور ہو،
خلیفہ کے علاوہ اگر کسی شخص نے ایسا معاہدہ کیا تو وہ مردود ہوگا" اھ اور عینی کی یہ جو کہا امام شافعیؒ کے اس قول
سے کہ " یہ مردوں کے حق میں منسوخ نہیں" مفہوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک عورتوں کے حق میں یہ حکم منسوخ
ہے۔ میں کہتا ہوں کہ امام مالکؒ سے مختلف روایات منقول ہیں جیسا کہ حاشیہ لامع میں مدونہ اور دسوقی سے
نقل کیا ہے اور مدونہ نے امام مالکؒ کا مذہب امام شافعیؒ کے موافق نقل کیا ہے اور مسلمانوں کو واپس کرنے
کی شرط حنابلہ کے نزدیک صحیح ہے، جیسا کہ حاشیہ لامع میں المغنی سے نقل کیا ہے اور شیخ ابن قیمؒ کہتے ہیں کہ عورتوں
کو واپس کرنے کی شرط جائز نہیں اور نص قرآن اس عقد (صلح حدیبیہ) میں عورتوں کی حد تک منسوخ ہے اور اس کے
منسوخ ہونے کے بعد اس کی کوئی سبیل نہیں، کیوں کہ کوئی چیز موجب فسخ نہیں۔ مسلمانوں نے کہا سبحان اللہ! کسی
کو مشرکوں کی طرف کیسے واپس کر دیا جائے جب کہ وہ مسلمان ہو کر آیا ہے؟ حافظ کہتے ہیں کہ یہ بات غالباً حضرت عمر
رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہی ہوگی، جیسا کہ آگے آتا ہے اور واقدی نے اس بات کے کہنے والوں میں اسید بن
حضیر رضی اللہ عنہ اور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے نام بھی ذکر کئے ہیں اور سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ بھی
نے اس کا انکار کیا تھا جیسا کہ بخاری شریف کی کتاب المغازی میں ہے۔

ابوجندل کا قصہ: اور ابھی وہ اسی حالت میں تھے اور ابن اسحٰق کی روایت میں ہے کہ صلح نامہ ابھی
ابھی لکھا ہی جا رہا تھا کہ ابوجندل بن حضرت سہیل بن عمرو اپنی بیڑیوں میں لڑکھڑاتے ہوئے آ نکلے

(تصنیف مشارع الانظر) یعنی بیڑیوں کے سبب آہستہ آہستہ چلتے آ رہے تھے) ان کا معاملہ تھا جس کو انہوں نے ترک
کر رکھا تھا۔ یہ جب اسلام لائے تو قریش نے ان کو قید کر دیا تھا اور انہیں ہجرت سے روک دیا گیا اور اسلام کی خاطر ایذائیں
دی گئیں اور یہ اسفل مکہ سے نکل کر آئے تھے یہاں تک کہ اپنے آپ کو مسلمانوں کے درمیان لا ڈالا۔ ابن اسحاق کی
روایت میں یہ اضافہ ہے کہ سہیل، ابوجندل کی طرف اٹھا، اس کے چہرے پر طمانچہ مارا، اس کا گریبان پکڑا اور اس کی
گردن دبائی۔ پس اس کے باپ سہیل نے کہا " اے محمد! سب سے پہلی چیز جس پر میں آپ سے معاملہ کرتا ہوں
یہ ہے کہ آپ اس کو واپس کر دیں۔ آپ نے فرمایا: ابھی تک تو ہم نے صلح نامہ نہیں لکھا یعنی ابھی تک تو اس کی
کتابت کی تکمیل نہیں ہوئی۔ سہیل نے کہا: خدا کی قسم! تب میں آپ سے کسی چیز پر صلح نہیں کروں گا۔ آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے اس کو میری خاطر اجازت دے دیجئے "أجِزْهُ لي" (اجازۃ سے امر کا صیغہ ہے۔ یعنی
اس کے حق میں میرے فعل کو نافذ بنا دیجئے کہ میں اس کو واپس نہ کروں یا اس کو صلح سے مستثنیٰ کر لیجئے۔ اور حمیدی کی
جمع بین الصحیحین میں "أجِزْهُ" "ز" کے ساتھ ہے اور ابن جوزی نے "ر" کو ترجیح دی ہے۔ اس واقعہ سے معلوم
ہوا کہ عقود میں اس اعتبار زبانی معاہدہ کا ہے اگرچہ اس کی تحریر اور اس پر شہادت ثبت کرنے میں تاخیر واقع ہو
جائے۔ اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سہیل کو اس کے لڑکے ابوجندل واپس کر دیا اور آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم نے اپنے ارشاد "ابھی تک تو ہم نے تحریر مکمل نہیں کی" کے ذریعہ یہ چاہا تھا کہ کسی حیلے سے سہیل راضی ہو جائے
اور قریش بھی انکار نہیں کریں گے کہ چاہتے کہ اپنے بیٹے کو معاف کر دیتا لیکن جب اس نے انکار پر ضد باندھ لی
تو آپ نے اس کو واپس کر دیا۔ پس سہیل نے کہا میں اس کی کبھی اجازت نہیں دوں گا۔ آپ نے مکرر فرمایا:
اس کو تو میری اجازت دے دیں۔ سہیل بولا: میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اور مکرز نے کہا اور واقدی کے مطابق
مکرز اور حویطب نے کہا: ہاں ہم نے آپ کی خاطر اس کو اجازت دیتے ہیں۔ پس ان دونوں نے ابوجندل کو
پکڑ کر خیمہ میں داخل کر لیا اور اس کے باپ کو اس کے مارنے سے ہٹا دیا۔ حافظ کہتے ہیں کہ یہاں یہ ذکر نہیں
کیا گیا کہ سہیل نے مکرز کو کیا جواب دیا۔ بعض شارحین کا کہنا ہے کہ "اس کو کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ مکرز کا
عقد صلح سے کوئی تعلق نہیں تھا" لیکن یہ محل نظر ہے کیونکہ واقدی اور ابن عائذ کی روایت ہے کہ مکرز بھی سہیل
کے ساتھ صلح کے سلسلے میں آیا تھا اور ان کے ساتھ حویطب بن عبدالعزیٰ بھی تھا مگر ان دونوں نے یہی ذکر کیا ہے
کہ یہ اجازت صرف عذاب وغیرہ سے امن دینے تک محدود تھی۔ مسلمانوں کے پاس اس کے رہنے کی اجازت
نہیں تھی۔ لیکن اس پر اشکال ہوتا ہے کہ صحیح کی روایت میں ہے کہ مکرز نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جب

چونکہ کہا کہ ہم نے آپ کی خاطر اس کو اجازت دی اور اسی بنا پر اس کا یہ اشکال کا باعث سمجھا گیا کیونکہ یہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے خلاف تھا کہ "وہ فاجر ہو رہی ہے" بظاہر اس کے فاجر ہونے کا مقتضی یہ تھا کہ
وہ سہیل کی ضد پوری کرتا۔ اور اس اشکال کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اس کا فاجر ہونا تو ایک حقیقت ہے مگر اس سے
یہ لازم نہیں آتا کہ اس سے شاذونادر بھی کوئی نیکی وقوع میں نہ آسکے۔ یا ممکن ہے کہ اس نے یہ بات ازراہ تفنن کہی
ہو اور باطن میں اس کے خلاف ہو۔ یا ممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد سن لیا ہو کہ "وہ فاجر
ہے" اس نے اسکے خلاف کو ظاہر کرنے کا ارادہ کیا ہو اور اگر واقدی اور ابن عائشہ کی روایت ثابت ہو تو وہ ان
احتمالات سے قوی تر ہے کیونکہ اس کے اجازت دینے کا مقصد صرف یہ تھا کہ اسکو مہلت دیدی جائے تاکہ وہ
اپنے باپ کی اطاعت کی طرف رجوع ہو جائے لیکن وہ اس اجازت کے ساتھ بھی قریش سے خارج نہیں ہوا اور
ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ "سہیل نے کہا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کی آمد سے پہلے میرے اور
آپ کے درمیان قطعی فیصلہ ہو چکا تھا آپ نے فرمایا تو نے ٹھیک کہا۔"

اور شیخ قدس سرہ "لامع" میں فرماتے ہیں کہ مکرز کا یہ کہنا کہ "ہم نے آپ کی خاطر اس کو اجازت دے دی"
چونکہ مکرز تو قریش کی جانب سے وکیل تھا نہ ابوجندل کا وکیل تھا اس لئے اس کی بات نہیں سنی گئی" اور لامع کے
حاشیہ میں اس پر مفصل کلام کیا گیا ہے اور اس میں حافظ کا وہ کلام بھی ذکر کیا ہے جو ابھی اوپر گزرا اور اس کے آخر
میں یہ حافظ نے ذکر کیا ہے کہ: "بعض شارحین کا خیال ہے کہ سہیل نے مکرز کو کوئی جواب نہیں دیا" الخ اس سے
کہاں مراد ہے؟ چنانچہ وہ کہتے ہیں: "اگر تم کہو کہ جب مکرز نے کہہ دیا تھا کہ ہم نے اس کو اجازت دے دی تو
آپ نے ابوجندل کو مشرکین کی طرف کیوں واپس کیا؟ جواب یہ ہے کہ عقد صلح کرنے والا سہیل تھا مکرز نہ
تھا اس لئے اس شخص کا قول معتبر ہے جو عقد کر رہا ہے نہ کہ مکرز کا قول۔" اھ ابوجندل نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے
کہا: اے مسلمانو! کیا مجھے مشرکین کے حوالے کیا جائے گا جب کہ میں مسلمان ہو کر آیا ہوں! کیا تم نہیں دیکھتے کہ
مجھے کن مصائب سے سامنا ہے؟ ان کو اللہ کے راستہ میں بہت ہی سخت عذاب دیا گیا تھا۔ ابن اسحاق نے
یہ اضافہ کیا ہے کہ "ابوجندل چلا کر بلند آواز سے فریاد طلبی کے انداز سے کہنے لگا: "اے مسلمانو! کیا مجھے مشرکین
کے حوالے کر دیا جائے گا کہ وہ مجھے دین سے بچلا دیں؟" یہ سن کر مسلمانوں کے غم و اندوہ میں اور بھی اضافہ
ہو گیا۔" اھ اور فتح میں ہے کہ ایک روایت میں ہے کہ سہیل ایک کیکر کے درخت کی طرف گیا اس سے ایک
شاخ کاٹی اور اس سے ابوجندل کے منہ پر مارنے لگا، یہ منظر دیکھ کر مسلمانوں پر رقت طاری ہو گئی اور رونے لگے

گئے۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اے ابوجندل! صبر کرو اور اللہ سے ثواب کی امید رکھو کیونکہ اللہ تعالیٰ تیرے لئے اور تیرے ساتھ کے اور مسلمانوں کے لئے کشائش اور فرج (اس مصیبت سے نکلنے کا راستہ) پیدا فرما دیں گے۔ ہم ان لوگوں سے ایک معاہدہ کر چکے ہیں اور ہماری صلح ہو چکی ہے جس میں واپسی کی شرط بھی ہم نے قبول کر لی ہے اور ان لوگوں نے بھی اللہ کا عہد دیا ہے اور ہم ان سے بدعہدی نہیں کریں گے۔" اور حضرت عمرؓ بن خطاب اپنی جگہ سے فوراً اٹھ کر ابوجندل کے پہلو میں چلنے لگے اور ان سے فرماتے جاتے تھے "اے ابوجندل! یہ تو مشرک ہیں ان میں سے ایک ایک کا خون کتے کے خون کی حیثیت رکھتا ہے اور حضرت عمرؓ تلوار ان کے قریب کر رہے تھے اور بعد میں فرماتے تھے: مجھے توقع تھی کہ وہ تلوار لے کر اپنے باپ کا سر اڑا دے گا۔ مگر ان صاحب کو اپنے باپ سے یہ سلوک گوارا نہ ہوا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ابوجندل نے کہا: اے عمرؓ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے مجھ سے زیادہ مستحق نہیں ہو؟"

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ جب گھر سے چلے تھے تو چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب دیکھا تھا کہ ہم بیت اللہ کا طواف کر رہے ہیں اس لئے انہیں فتح میں قطعاً شک نہیں تھا مگر جب انہوں نے دیکھا کہ یہاں صلح ہو گئی ہے اور وہ فتح کے بغیر واپس جا رہے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کڑی شرطیں بھی قبول فرما لی ہیں تو انہیں اس کا اتنا صدمہ ہوا کہ قریب تھا کہ وہ اس صدمے سے مر جائیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: واللہ! میں جب سے اسلام لایا اس دن کے سوا مجھے کبھی کسی معاملہ میں تردد نہیں ہوا۔ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: کیا آپ اللہ کے سچے نبی نہیں ہیں؟ الخ۔ قریب قریب اسی طرح ہے اور یہ پوری گفتگو بخاری کی روایت سے آگے آ رہی ہے۔ نوویؒ، حافظؒ کی متابعت میں کہتے ہیں: علماء نے کہا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا سوال اور ان کی گفتگو خدانخواستہ دین میں شک کی وجہ سے نہیں ہوئی تو یہ کیسے ہو سکتا ہے، چنانچہ ابن اسحٰق کی روایت میں ہے کہ جب حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے فرمایا: "آپ کی رکاب تھامے رکھو کہ آپ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں" تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: میں بھی گواہی دیتا ہوں کہ آپ واقعی اللہ کے سچے رسول ہیں صلی اللہ علیہ وسلم۔ بلکہ ان کی ساری گفتگو کا منشا اس صلح کی مصلحت دریافت کرنا تھا جو ان سے مخفی تھی اور ان کی (کفار کی) تذلیل کرنا اور اسلام کے غلبہ پر برانگیختہ کرنا تھا۔ جیسا کہ حضرت دین اللہ کی سربلندی کے بارے میں ان کی طاقت اور شدت معروف ہے۔ میں کہتا ہوں ایسی چیزیں جن کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول میں ذکر ہے وہ تردد نہیں تھا رسالت میں بلکہ اس امر میں تھا کہ یہ صلح مصلحت دین کے حق میں

جب کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے درمیان فیصلہ نہیں کیا؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میں اللہ کا رسول ہوں اور
میں اس کے حکم کے خلاف نہیں کروں گا اور وہ میری مدد فرمائے گا۔" اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تردد اور اضطراب
زائل کرنے کے لئے ان کو تنبیہ فرمائی گئی ہے کہ آپ نے یہ معاہدہ کسی ایسے مقصد کی خاطر کیا ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے
آپ کو مطلع فرمایا ہے اور یہ کہ آپ نے جو کچھ کیا ہے وہ حق سے کیا ہے میں نے عرض کیا کیا آپ نے ہم سے یہ نہیں
فرمایا تھا کہ ہم بیت اللہ جائیں گے اور طواف کریں گے؟ اس میں تنبیہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خواب
مدینہ منورہ میں دیکھا تھا۔ جیسا کہ پیچھے گذر چکا ہے وہاں حلق کی آیت کا تحفہ کیا گیا ہے یہ تردد بھی شک نہ تھا کہ
معتمر قسمت ہو گی کہ جب انہوں نے دیکھا کہ یہاں تو صلح ہو گئی تو انہیں اس سے تاسف ہوا کہ قریب تھا کہ
صدمہ سے ہلاک ہو جائیں" فرمایا: "اور تم یہ کہ ... کیا میں نے یہ بھی کہا تھا کہ اسی سال جائیں گے؟ میں نے عرض کیا
یہ تو نہیں فرمایا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بس تم بالضرور بیت اللہ جاؤ گے اور طواف کرو گے۔" اور واقدی
نے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "اس دن مجھے عظیم صدمہ ہوا اور میں نے آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم سے ایسا سوال جواب کیا جو اس سے قبل کبھی نہیں کیا تھا۔" اور بزار نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے
روایت کیا ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم راضی ہو گئے مگر میں انکار پر تلا رہا یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا ولسے عمر! تم دیکھ رہے ہو کہ میں راضی ہو گیا ہوں لیکن تم انکار ہی کئے جا رہے ہو۔" اور بخاری کی کتاب الجزیہ
اور کتاب التفسیر میں حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اے
ابن خطاب! میں اللہ کا رسول ہوں اور اللہ تعالیٰ مجھے ہرگز ضائع نہیں فرمائیں گے۔" پس حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ
غم و غصہ کی حالت میں واپس ہوئے کہ کسی کروٹ چین نہیں آ رہا تھا، یہاں تک کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس
آئے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: "پس میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آیا۔"
حافظ لکھتے ہیں کہ "حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ ذکر نہیں کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد انہوں نے
اس سلسلہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے علاوہ کسی اور سے بھی بات چیت کی ہو۔ اور میرا یہ گمان ہے کہ حضرت
عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی جلالت قدر اور وسعت علم مسلم تھی، نیز ثانی کتب
کی ابن اسحاق کی روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل حضرت ابوبکرؓ سے سوال کرنے کا ذکر ہے، مگر صحیح کی روایت
زیادہ صحیح ہے خصوصاً جب کہ ایک دوسری حدیث میں اس کی وضاحت بھی موجود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے
بعد حضرت ابوبکرؓ کے پاس جانے کا سبب کیا تھا۔" اور ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد
حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حضرت ابوبکرؓ سے سوال و جواب کرنے کا سبب وہ شدید غم و غصہ تھا جو انہیں لاحق تھا۔

اور دین کی نصرت و سربلندی اور اللہ کا فرمانوں کی تعمیل کا وہ شدید واعیہ تھا جو اُن میں موجزن تھا۔ جیسا کہ حضرت سہل بن حنیف اس کو اپنے لفظوں میں یوں بیان فرماتے ہیں کہ، وہاں حضرت عمرؓ غصہ کی حالت میں اُٹھے مگر کسی کروٹ چین نہیں آیا یہاں تک کہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس گئے تو انہوں نے کہا: اے ابوبکرؓ! کیا آپ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے نبی نہیں ہیں؟ کہا: کیوں نہیں، بیشک سچے نبی ہیں۔ میں نے کہا: کیا ہم حق پر اور ہمارے دشمن باطل پر نہیں ہیں؟ کہا: کیوں نہیں، یقیناً۔ میں نے پھر کہا: ہمیں ہمارے دین کے بارے میں ذلت اور خست کیوں دی جا رہی ہے۔ ابوبکرؓ نے عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: اے میاں! یقیناً آپ اللہ کے رسول ہیں اور آپ اپنے رب کے حکم کے خلاف نہیں کرتے، اور اللہ تعالیٰ آپ کی ضرور مدد کرے گا۔ اس لئے آپ کی رکاب تھامے رکھو۔ غرز (یعنی غین معجمہ و سکون را) دراصل گھوڑے کی رکاب کو کہا جاتا ہے۔ یعنی آپ کے حکم کو مضبوطی سے پکڑو، اور آپ کی مخالفت نہ کرو جس طرح کوئی شخص سوار کی رکاب تھامے اس کے ساتھ ساتھ رہتا ہے وہ اس سے کسی وقت جدا نہیں ہوتا اور اسماعیلی میں یہ اضافہ ہے، "یہاں تک کہ قبا میں حضرت آگئے" اور لاحق میں ہے کہ یہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم کیا گیا ہے کہ مرتے دم تک آپ کا ساتھ دیں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی امر و نہی میں آپ کے خلاف نہ کریں۔ اور یقین کرو اللہ کی قسم! آپ حق پر ہیں۔ میں نے کہا کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے یہ نہیں فرماتے تھے کہ ہم بیت اللہ جائیں گے اور اس کا طواف کریں گے؟ کہا: یہ تو ٹھیک ہے مگر کیا آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ تم اسی سال جاؤ گے؟ میں نے کہا: یہ تو نہیں فرمایا تھا، کہا: پھر تم ضرور جاؤ گے اور بیت اللہ کا طواف کرو گے۔ الغرض حضرت ابوبکرؓ نے لفظ بلفظ ٹھیک وہی جواب دیا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا۔ اس سے ثابت ہوا کہ حضرت ابوبکرؓ تمام صحابہؓ میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال کے سب سے زیادہ واقف، امور دین کے سب سے بڑے عالم اور امر الٰہی کی موافقت میں سب سے مضبوط تھے اور قوی یہ ہے اس حدیث میں اس کی تصریح ہے کہ مسلمانوں نے صلح مذکور کو ناگوار سمجھا، عام مسلمان اس معاملہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے پر تھے اور اس تقریر سے ثابت ہوا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس میں ان کے موافق نہیں تھے۔ بلکہ آپ کا قلب ٹھیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب کے مطابق تھا۔ اور ہجرت کے بیان میں آتا ہے کہ ابن الدغنہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ٹھیک وہی اوصاف بیان کئے ہیں جو حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کئے تھے کہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، ناداروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں اور ناگہانی مصائب میں لوگوں کی اعانت فرماتے ہیں، وغیرہ۔ گویا دونوں کی

صفات ابتداء ہی سے ہو چکی تھیں، اس لئے یہ ہرگز نہ صرف آخر تک رہی بلکہ انتہا کو پہنچ گئی۔

میں کہتا ہوں کہ یہ وہی حالت ہے جس کو حضرات صوفیہ "نسبت اتحادیہ" سے تعبیر کرتے ہیں اور یہ ان چاروں نسبتوں میں سے ایک ہے جو صوفیہ کے یہاں معروف ہیں یعنی نسبت انعکاسیہ، نسبت القائیہ، نسبت اصلاحیہ اور نسبت اتحادیہ۔ میں نے حاشیۂ لامع کے ابتدائی اوراق میں عنوان ابتداء وحی کے وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بغل میں لے کر بار بار دبانے کا ذکر ہے ان کو تفصیل سے بیان کیا ہے

اور کتب حدیث میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس "نسبت اتحادیہ" کی بہت سی مثالیں مذکورہ الصدر واقعات کے علاوہ بھی مذکور ہیں، ان میں ایک اسلامی عہد کا واقعہ ہے جس میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موافقت کی تھی اور اسی نسبت اتحادیہ کے نتیجے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکرؓ خلیفہ بلا فصل ہو سکے کیونکہ صحابہ رضوان اللہ علیہم پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فراق سے نہایت وحشت و دہشت طاری تھی ان حالات میں اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت کسی ایسے شخص کے سپرد ہوتی جس کی طبیعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت سے ذرا بھی خلاف ہوتی تو اس کے احکام میں مزید وحشت پیدا ہو جاتی، اور میں نے حاشیۂ لامع میں اس کی طرف مختصر اشارہ کیا ہے چنانچہ اس میں لکھا ہے کہ "حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے تقدم کے وجوہ و اسباب میں سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کی طبیعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جذبات و عواطف کے یکسر تابع تھی اور یہی سبب تھا کہ حضرات صحابہ کو ان کے احوال سے انس حاصل ہوا، رضی اللہ عنہم"

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں "بعد ازاں اس کی تلافی میں نے بہت سے عمل کئے" بعض شارحین نے "بہت سے اعمال" کی تفسیر آمد و رفت اور سوال و جواب سے کی ہے، حافظ کہتے ہیں "بہت سے اعمال" کی یہ تفسیر مردود ہے بلکہ اس سے مراد اعمال صالحہ ہیں، تاکہ ان سے ابتدا میں آنحضرت سے جو توقف صادر ہوا اس کا تدارک اور تکفیر ہو جائے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اس کی تصریح منقول ہے چنانچہ ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ اس دن میں نے جو کچھ کیا اور جو گفتگو ہوئی اس کے خوف سے میں نے صدقے کئے، روزے رکھے، نمازیں پڑھیں اور غلام آزاد کئے، اور واقدی کی روایت میں ہے کہ "میں نے اس کی وجہ سے بہت سے غلام آزاد کئے اور دہر تک روزے رکھے۔"

صلح نامہ کی دس دفعات: زرقانی نے نقل کی ہیں، اور دس سال کے لئے صلح کا معاہدہ ہوا تھا، جیسا کہ سہیلی کی

صلح نامہ کی تحریر سے فراغت ہوئی تو صلح نامہ پر طرفین کے چند افراد کی شہادت ثبت کر دی گئی۔ مسلمانوں کی طرف سے حضرت ابوبکر، عمر، علی، عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص، محمود بن مسلمہ، عبداللہ بن سہیل بن عمرو اور ابو عبیدہ بن جراح کے اور مشرکین کی طرف سے مکرز بن حفص اور حویطب بن عبد العزیٰ کے نام درج کئے گئے ہیں (فتح الباری میں اسی طرح ہے اور کچھ اضافہ خمیس سے کیا گیا ہے)۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا: "اٹھو! نحر اور حلق کرو۔" حافظ کہتے ہیں کہ ابوالاسود کی روایت میں عروہ سے مروی ہے کہ "جب صلح سے فارغ ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدی کا حکم فرمایا۔ پس مسلمانوں نے ہدی کے جانور حرم کی طرف کھینچے اور مشرکین قریش نے ان کو روک دیا۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نحر کا حکم فرمایا" اور نسائی نے اس پر باب ذکر کیا ہے کہ "ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب ہدی کے اونٹوں کو بیت اللہ شریف سے روک دیا گیا تو وہ اس طرح آواز نکالتے تھے جس طرح اپنی اولاد کے اشتیاق میں آواز نکالا کرتے ہیں۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدی کے اونٹوں کو حدیبیہ میں اسی جگہ نحر کیا جہاں ان کو روک دیا گیا تھا" لیکن اگر کہا جائے یہ روایت اس دوسری روایت کے منافی نہیں جو ابن سعد نے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کی ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ بنو اسلم کے ایک شخص کے ساتھ بیس اونٹ بھیجے تاکہ انہیں مروہ کے پاس نحر کیا جائے"۔ نسائی میں اسی طرح ہے اور ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ حدیث ابن کثیر نے امام احمد کے حوالے سے ذکر کی ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے دن ستر اونٹ نحر کئے جن میں ابوجہل کا اونٹ بھی شامل تھا۔ پس جب ان کو بیت اللہ سے روک دیا گیا تو وہ ایسی ہی آواز نکالتے تھے جیسے اپنی اولاد کے اشتیاق میں نکالتے ہیں۔" پس اللہ کی قسم صحابہ میں سے ایک بھی نہ اٹھا۔ کہا گیا ہے کہ غالباً انہوں نے اس بنا پر توقف کیا کہ شاید یہ حکم استحباب کے لئے ہو یا اس توقع پر کہ شاید نزول وحی کے ذریعہ صلح نامہ کو کالعدم قرار دے دیا جائے یا انہیں اسی سال عمرہ کے لئے کر جانے کی اجازت دے کر اس میں تخصیص ہو جائے، اور اس کی گنجائش اس لئے تھی کہ یہ زمانہ نسخ کا تھا، اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ صلح جو دب کر ہوئی تھی اس نے انہیں مبہوت اور مدہوش کر دیا ہو اور وہ اس فکر میں مستغرق ہوں کہ باوجود غلبہ و قوت کے ان کے خیال میں انہیں ذلت لاحق ہوئی ہے جبکہ انہیں یقین تھا کہ وہ بزور غلبہ کے ساتھ اپنے مقصد کو حاصل کر سکتے ہیں اور عمرہ کی قدرت رکھتے ہیں، یا انہوں نے تعمیل حکم میں اس لئے تاخیر کی کہ ان کا اعتقاد یہ تھا کہ امر مطلق کا فی الفور بجا لانا ضروری نہیں۔ اور احتمال ہے کہ یہ سارے امور ہی مجموعی طور پر ان کے پیش آئے ہوں۔ (یعنی بعض حضرات کے لئے بعض امور اور دوسرے بعض کے لئے دوسرے بعض امور) جیسا

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ (عمرہ کے لئے) نکلے، پس کفار قریش حائل ہو گئے۔ اس روایت کے آخر میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حلق کیا اور صحابہؓ نے قصر کیا۔" ملا علی قاری مرقات میں کہتے ہیں: "یعنی بعض صحابہؓ نے قصر کیا اور باقی حضرات نے حلق کیا تھا۔"

حلق کرانے والوں کے لئے تین بار دعا کرنا: اور طبقات میں ہے کہ "آپ کے صحابہؓ نے نحر کیا اور عام حضرات نے حلق کرایا اور کچھ لوگوں نے قصر، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ حلق کرانے والوں پر رحم فرمائے، تم نے تین بار دعا فرمائی، عرض کیا گیا: یا رسول اللہ! اور قصر کرنے والوں پر؟ پھر فرمایا: اور قصر کرنے والوں پر بھی۔" ابن اسحاق نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ کچھ لوگوں نے اس دن حلق کرایا اور کچھ حضرات نے قصر کرایا، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ حلق کرانے والوں پر رحم فرمائے۔ صحابہؓ نے عرض کیا: اور قصر کرنے والوں پر بھی؟ الحدیث — اور اس کے آخر میں ہے کہ عرض کیا گیا: یا رسول اللہ! آپ نے حلق کرانے والوں کو رحمت کی دعا کرنے میں ترجیح کیوں دی؟ فرمایا: وہ شک میں نہیں پڑے۔" زرقانی کہتے ہیں کہ خطابی نے کہا ہے: "اور اللہ تعالیٰ نے ایک ہوا بھیجی، جیسا کہ ابن سعد نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو بیت اللہ سے روک دیا گیا۔ اور انہوں نے حلق کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے ایک تند ہوا بھیجی جس نے ان کے بالوں کو اٹھا کر حرم میں لا ڈالا۔ یہ ان کے بیت اللہ سے روک دئے جانے کی تلافی تھی۔ ابو عمر کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ان کا قبولِ عمرہ کی نیک فال سے حرم میں پہنچا دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک اس سے مستثنیٰ تھے، چنانچہ ایک روایت میں آتا ہے کہ خراشؓ نے جب آپ کا حلق کیا تو آپ کے موئے مبارک کیکر کے ایک سرسبز درخت پر جو ان کے قریب ہی تھا، پھینک دیئے پس لوگ اس کے اوپر چڑھنے لگے اور ام عمارہ نے آپ کے موئے مبارک کے کئی گچھے لئے، وہ ان کو دھو کر بیماروں کو پلایا کرتی تھیں جس سے وہ شفایاب ہو جاتے تھے اور یہ بھی احتمال ہے کہ موئے مبارک کا اکثر حصہ صحابہؓ نے لے لیا ہو اور باقی ماندہ ہوا کے ساتھ حرم شریف میں جا پہنچے ہوں۔ اور صحیح بخاری میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے دن ہم سے فرمایا: تم لوگ تمام روئے زمین کے لوگوں سے افضل ہو۔" اور مسلم وغیرہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ "کوئی شخص جو بدر اور حدیبیہ میں شریک ہوا دوزخ میں داخل نہیں ہوگا۔" اور امام مسلم نے حضرت ام مبشر رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے وہ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، آپ فرماتے تھے کہ "اصحاب شجرہ میں سے کوئی شخص دوزخ میں داخل نہیں ہوگا۔" ابو عمر کہتے ہیں کوئی غزوہ، غزوۂ بدر کے مساوی یا اس کے قریب نہیں، بجز

غزوۂ حدیبیہ سے کہ وہاں بیعت رضوان ہوئی تھی، لیکن دوسرے حضرات فرماتے ہیں کہ غزوۂ احد کو غزوۂ حدیبیہ پر ترجیح حاصل ہے اور وہ فضیلت میں غزوۂ بدر کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔

حدیبیہ میں قیام کی مدت : (۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ میں دس دن سے کچھ زیادہ ٹھہرے تھے بعض نے بیس دن بتائے ہیں اور واقدی اور ابن سعد نے کچھ زیادہ کو مبہم رکھا ہے۔ شامی میں ان دونوں سے انیس دن نقل کئے ہیں اور ابن عائذ نے قریب ماہ قیام کا ذکر کیا ہے۔

قصۂ حدیبیہ سے متعلق فقہی مباحث : مخفی نہ رہے کہ قصۂ حدیبیہ میں بہت سے فقہی ابحاث ہیں جن کی تفصیل توضیح اور لامع کے حاشیہ میں مذکور ہے۔ اس مختصر رسالہ میں ان کے ذکر کی گنجائش نہیں، چنانچہ اوجز میں "باب ما جاء فیمن احصر بعدو" کے ذیل میں ہے کہ "اس میں بہت سے ابحاث ہیں ۱۔ احصار کس چیز سے متحقق ہوتا ہے۔ ۲۔ کیا حرم میں بھی احصار متحقق ہو سکتا ہے؟ ۳۔ وجوب قضا کی بحث۔ ۴۔ وجوب ہدی کی بحث۔ ۵۔ نحر ہدی کے زمان و مکان میں اختلاف۔ ۶۔ جو شخص ہدی سے عاجز ہو گیا وہ کسی اور چیز کی طرف انتقال کر سکتا ہے؟ ۷۔ وقوف عرفات کے بعد حبس اشد ہے۔ ۸۔ الگ رہنے یا ساتھ جانے کی بحث۔ ۹۔ کیا محصر کے لئے احرام کھولتے وقت حلق کرانا لازم ہے؟ ۱۰۔ کیا احرام کے وقت شرط لگانا محصر کے لئے مفید ہے؟ ۱۱۔ حدیبیہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا احصار۔ ۱۲۔ حدیبیہ حل میں داخل ہے یا حرم میں؟ ۱۳۔ جس شخص کو احرام سے قبل احصار کا علم ہو جائے اس کا حکم؟ ۱۴۔ ما استیسر من الہدی سے کیا مراد ہے؟ علاوہ ازیں دیگر مباحث جو اوجز میں مذکور ہیں۔

سورۂ فتح کا نزول : پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ سے واپس ہوئے درآنحالیکہ صحابہؓ کے دلوں میں اس بات کا قلق تھا کہ فتح نہیں ہوئی، جب کہ مدینہ منورہ سے چلے تھے تو انہیں اس کے ہونے میں کسی طرح کا شک نہیں تھا، پس جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابھی راستہ ہی میں تھے سورۂ فتح نازل ہوئی۔ منقول ہے کہ یہ سورت مکہ و مدینہ کے درمیان نازل ہوئی جیسا کہ ابن اسحاق کی روایت ہے اور ابن سعد کی روایت ہے کہ اس کا نزول مقام ضجنان میں ہوا۔ ضجنان ضاد معجمہ کا فتح جیم کا سکون، اور مکہ اور اس کے درمیان ۲۵ میل۔ مکہ سے ایک برید پر ایک پہاڑ کا نام ہے اور سہیلیؒ تذکرہ میں کہتے ہیں کہ امام بخاریؒ امام احمدؒ اور امام ترمذیؒ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ہم ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے۔ میں نے تین بار آپ سے ایک بات دریافت کی، مگر آپ نے جواب نہ دیا، میں نے اپنے جی میں کہا اے خطاب کے بیٹے! تجھ کو تیری ماں گم پائے تو نے تین بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ٹوکا مگر آپ نے تجھے جواب نہیں دیا۔ اس پر میں نے اپنے اونٹ کو حرکت دی اور سب

لوگوں سے آگے ہو گیا اور مجھے اندیشہ ہوا کہ میرے حق میں کہیں قرآن نازل نہ ہو جائے۔ زیادہ دیر نہیں گذری تھی کہ میں
نے ایک شخص کو سنا کہ مجھے زور زور سے پکار رہا ہے۔ میں لوٹ آیا اور میرا خیال تھا کہ میرے بارے میں قرآن نازل
ہو چکا ہے۔ (میں حاضر ہوا) تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آج رات مجھ پر ایسی سورت نازل ہوئی ہے
جو مجھے دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب ہے یعنی انا فتحنا لک فتحا مبینا۔" اور امام احمد، ابوداؤد وغیرہ نے حضرت مجمع
بن جاریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ہم حدیبیہ میں حاضر ہوئے تھے جب واپس ہوئے کراع الغمیم پہنچے تو کیا
دیکھتا ہوں کہ لوگ اونٹ دوڑا رہے ہیں۔ پس لوگوں نے دریافت کیا (ایک دوسرے سے) کہ کیا قصہ ہے؟ انہوں
نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوئی ہے۔ پس ہم بھی لوگوں کے ساتھ اونٹ دوڑاتے ہوئے نکلے تو دیکھا
کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "کراع الغمیم" پر اپنی اونٹنی پر ہیں پس لوگ آپ کے گرد جمع ہو گئے۔ آپ نے ان کے سامنے
انا فتحنا لک فتحا مبینا پڑھی۔ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا یہ فتح ہے؟ فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے
قبضہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے یہ یقیناً فتح ہے۔" میں کہتا ہوں کہ بخاری شریف میں حضرت براء رضی اللہ عنہ
سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: کہ تم لوگ تو فتح مکہ کو فتح سمجھتے ہو اور فتح مکہ تو فتح تھی ہی مگر ہم لوگ تو فتح بیعت
رضوان کو سمجھتے تھے۔" اور لامع میں ہے: "کیونکہ یہ بیعت، فتح مکہ کا سبب تھی کہ صلح حدیبیہ بہت سے فوائد کا ذریعہ
ثابت ہوئی چنانچہ اسلام کی باتیں اور مسلمانوں کے اخلاق و عادات تمام عرب میں پھیل گئے وغیرہ الخ" اور اس
کے حاشیہ میں حضرت مجمع بن جاریہ انصاری کی حدیث جو ابو داؤد شریف کے حوالے سے اوپر گذری ہے، ذکر کرنے
کے بعد لکھا ہے: اور کتاب الجہاد میں "باب اثم من عاہد ثم غدر" کے بعد ایک طویل باب میں حدیث حدیبیہ ثابت
سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ سے گذر چکی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: "پس عمر رضی اللہ عنہ ــــــــ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے
پاس آئے اور ان سے بھی وہی گفتگو ہوئی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی تھی پس سورۃ فتح نازل ہوئی۔ پس
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ پڑھ کر سنائی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:
یا رسول اللہ کیا یہ فتح ہے؟ فرمایا: ہاں" حافظ کہتے ہیں "فتح سے مراد یہاں حدیبیہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے فتح مبین
کا مقدمہ و آغاز ثابت ہوئی چنانچہ اس پر صلح مرتب ہوئی اور جو حضرات اسلام لانے اور مدینہ آنے سے ڈرتے تھے
ان کو موقع ملا جیسا کہ خالد بن ولید اور عمرو بن عاص کو یہ صورت پیش آئی اس کے بعد ایسے اسباب پے در پے
واقع ہوتے گئے کہ بالآخر فتح مکمل ہوئی۔ اور ابن اسحاق نے امام زہری سے نقل کیا ہے کہ حدیبیہ سے قبل کوئی فتح اسلام
میں اس سے عظیم تر ثابت نہیں ہوئی۔ گذشتہ (انیس) سالوں میں جتنے لوگ اسلام لائے تھے ان دو سالوں میں

اتنے بلکہ اس سے بھی زیادہ لوگ اسلام لائے۔ ابن ہشام کہتے ہیں کہ اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ حدیبیہ کے لئے تشریف لے گئے تو کل چودہ یا پندرہ سو آدمی آپ کے ساتھ تھے اور اس کے دو سال بعد فتح مکہ میں آپ دس ہزار قدسیوں کے ساتھ نکلے۔ الخ

زرقانی کہتے ہیں کہ "موسیٰ بن عقبہ نے عروہ سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لا رہے تھے کہ ایک صحابی نے کہا: کیا یہ فتح ہے؟ انہوں نے ہم کو بیت اللہ سے روک دیا، ہماری ہدی روک دی گئی اور دو مسلمان مشرکوں کے حوالے کر دیئے گئے! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر ہوئی تو فرمایا: بہت ہی بری بات کہی۔ ارے یہ تو سب سے بڑی فتح ہے کہ مشرکین... صرف اس بات پر راضی ہو گئے کہ وہ اپنے علاقے میں جا سکے سے تمہیں روک دیں اور وہ تم سے صلح کی درخواست کرتے ہیں اور امن کی خاطر تمہاری طرف رغبت کرتے ہیں، جو چیز ان کو ناگوار تھی اللہ تعالیٰ نے تمہاری طرف سے اس کا موقع نہیں آنے دیا اور اللہ تعالیٰ نے تم کو ان پر کامیاب کیا اور تمہیں اجر و ثواب کے ساتھ صحیح و سالم واپس کر دیا، اس لئے یہ سب سے بڑی فتح ہے۔ کیا تم احد کا دن بھول گئے جب کہ تم دوڑے جا رہے تھے اور کسی کو پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھتے تھے اور میں پیچھے سے تم کو بلا رہا تھا؟ کیا تم جنگ احزاب کا دن بھول گئے جب کہ وہ تمہارے اوپر کی جانب سے اور تمہارے نیچے کی جانب سے چڑھ آئے تھے اور جب آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں اور کلیجے منہ کو آ رہے تھے اور تم اللہ کے بارے میں مختلف خیال باندھ رہے تھے! پس مسلمانوں نے کہا: اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا، واقعی یہ بہت بڑی فتح ہے اللہ کی قسم! یا نبی اللہ ہم نے اس بات پر غور نہیں کیا جو آپ کے پیش نظر تھی، بلاشبہ آپ اللہ تعالیٰ اور اس کے امر کو ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔" امام زہری نے صلح حدیبیہ کی جو مصلحت ذکر کی ہے اس کے علاوہ یہ مصلحت بھی تھی کہ وہ فتح اعظم کا مقدمہ تھی اور اس کے بعد لوگ جوق در جوق اللہ کے دین میں داخل ہونے لگے، اور فتح مبین چونکہ فتح کا مقدمہ ہے اس لئے وہ بھی فتح کے ساتھ موسوم ہوئی۔ اور شیخ ابن قیمؒ نے صلح حدیبیہ کے مصالح بہت ہی تفصیل سے ذکر کئے ہیں، جن کا خلاصہ چار چیزیں ہیں: اول یہ کہ یہ فتح اعظم کا مقدمہ ثابت ہوئی جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اور اپنے لشکر کو معزز کیا اور جس کے ذریعہ لوگ اللہ کے دین میں جوق در جوق داخل ہوئے۔ دوم یہ کہ یہ خود بھی سب سے بڑی فتح تھی کیونکہ لوگوں کو ایک دوسرے سے امن نصیب ہوا، مسلمانوں کو کافروں سے اختلاط کا موقع ملا اور مسلمانوں نے ان کو کھل کر دعوت دینا شروع کی، ان کو قرآن سنایا، اور نہایت امن و سکون سے علی الاعلان ان کے ساتھ اسلام کے موضوع پر گفتگو اور مناظرے کئے، علاوہ

لوگ اپنے اسلام کا اظہار نہیں کر پاتے تھے ان کو اظہار اسلام کا موقع ملا اور مدت صلح کے درمیان وہ سب لوگ اسلام میں داخل ہو گئے جن کا داخل ہونا شدنی اور مقدر تھا سو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو مسلمانوں کے ایمان و اذعان میں اضافہ کا ذریعہ بنایا اور ان کو بیرونی فتوحات میں آسانی ہوئی اور کھل سبیل کی فتح ہوئی اور ان میں بعض نے یہ بھی رضا بالقضاء اور وعدہ الٰہی کی تصدیق کی دولت حاصل ہوئی جو اجر کا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی کو اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ان انعامات کا ذریعہ بنایا جن کا ذکر سورۂ فتح میں ہے یعنی آپ کی اگلی پچھلی تمام خطاؤں کی مغفرت، آپ پر اپنے انعامات کی تکمیل، صراط مستقیم کی طرف آپ کی رہنمائی، آپ کی قوی نصرت، آپ کا ان امور سے راضی ہونا اور آپ کا انشراح الصدر۔ انتہیٰ مختصرا

مسلمان عورتوں کی آمد: "پھر مومن عورتیں آئیں" حافظ کہتے ہیں: اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ عورتیں آپ کے پاس اس وقت آئیں جب کہ آپ حدیبیہ میں فروکش تھے مگر ایسا نہیں بلکہ وہ مدت صلح کے دوران آتی تھیں۔ امام بخاری نے کتاب الشروط کے اندر میں جو روایت ذکر کی ہے وہ اس مفہوم پر ظاہر ہے چنانچہ اس کے الفاظ ہیں: "پھر اس مدت کے دوران جو مرد بھی آیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے واپس کر دیا اگرچہ وہ مسلمان تھا اور پھر مومن عورتیں ہجرت کر کے آئیں" انتہیٰ۔ اور تفسیر کی ایک روایت میں ہے کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ میں تھے کہ آپ کے پاس مومن عورتوں کی ایک جماعت ہجرت کر کے آئی ان میں ام کلثوم بنت عقبہ اور سبیعہ بنت الحارث اسلمیہ تھیں۔ سبیعہ کا شوہر مسافر صیفی ان کی طلب میں آیا اور مشرکین نے چاہا کہ آپ اسے واپس کر دیں پھر جبریل علیہ السلام یہ آیت لے کر نازل ہوئے: یا ایہا الذین آمنوا اذا جاءکم المؤمنات مہاجرات الآیہ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سبیعہ سے حلف لیا اس نے قسم کھائی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے شوہر مسافر کو اس کا خرچ دلوا دیا اور سبیعہ سے حضرت عمرؓ نے نکاح کر لیا۔" اھ

اور الاکتفاء میں ہے کہ مدت صلح ہی میں ام کلثوم بنت عقبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کر کے آئیں، ان کے دو بھائیوں عمارہ اور ولید نے مطالبہ کیا کہ ان کو واپس کیا جائے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو واپس نہیں کیا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس سے انکار کرتے ہیں۔ آہ۔ حافظ ابن عبدالبر "استیعاب" میں لکھتے ہیں کہا گیا ہے کہ یہ سب سے پہلی خاتون تھیں جو ہجرت کر کے آئیں ان کی ہجرت مدت صلح میں ۷ھ میں ہوئی اور انہی کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: اذا جاءکم المؤمنات مہاجرات الآیہ۔ حافظ ابو جعفر بن حبیب لکھتے ہیں کہ لوگوں کا بیان ہے کہ یہ

ے وفی الاصل اذا جاءکم المہاجرات

مکہ سے چل کر پیدل مدینہ پہنچی تھیں۔" حافظ لکھتے ہیں: "جو عورتیں ہجرت کر کے آئیں ان میں سے صرف جو ذیل کے نام ذکر کئے گئے ہیں: ۱۔ امیمہ بنت بشر (یہ حسان کے نکاح میں تھیں پھر سہل بن حنیف نے ان سے نکاح کیا) ۲۔ ام حکم بنت ابی سفیان ۳۔ بروع بنت عقبہ ۴۔ عبدہ بنت عبد العزیٰ ۵۔ بنت عمرو بن عبد المطلب" انتہیٰ مختصراً۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی: یایھا الذین آمنوا اذا جاءکم المؤمنات مہاجرات فامتحنوھن۔۔۔ حتیٰ بلغ بعصم الکوافر (اے ایمان والو! جب مومن عورتیں ہجرت کر کے تمہارے پاس آئیں تو ان کا امتحان کر لیا کرو۔) آگے علامہ قسطلانی ابن منیر کی متابعت میں لکھتے ہیں کہ اس روایت کے مطابق جس میں کہ صلح نامہ کی یہ عبارت نقل کی گئی ہے: "اور جو بھی آئے گا آپ کے پاس ہمارا کوئی فرد (تو)" یہ آیت سنت کے لئے مخصص ہوگی اور یہ بہترین مثال ہے (کہ قرآن مجید سے سنت کی تخصیص صحیح ہے) اور بعض سلف کے طریقہ پر اس کے لئے ناسخ ہوگی۔ (از قبیل نسخ السنة بالکتاب۔ اور جس روایت میں "نہیں آئے گا آپ کے پاس ہمارا کوئی آدمی" کے الفاظ مروی ہیں اس کے مطابق اس میں کوئی اشکال ہی نہیں۔" اھ۔

ابن عربی احکام القرآن میں لکھتے ہیں: "واپسی کے معاہدے سے عورتوں کا خارج ہونا اس معاہدے کے عموم کی تخصیص تھی۔ اس کی تشریح نہیں جیسا کہ بعض ناقصین کو وہم ہوا ہے۔" نیز آیت کے مسائل میں لکھتے ہیں: "تیسرا مسئلہ اس علت میں جس کی وجہ سے عورتوں کو واپس نہیں کیا گیا اگرچہ شرط کے عموم میں وہ بھی داخل تھیں اور اس میں دو قول ہیں: ایک یہ کہ ان کی نرم دلی و ضعف کی وجہ سے، دوسرا یہ کہ حرمت اسلام کی وجہ سے۔ اور حق تعالیٰ کا ارشاد "نہ یہ ان کافروں کے لئے حلال ہیں، نہ وہ (کافر) ان (مسلمان عورتوں) کے لئے حلال ہیں" اس پر دلالت کرتا ہے، اور دوسرا قول ہی صحیح ہے اور جائز ہے کہ حکم دونوں علتوں کے ساتھ معلل ہو۔" آگے لکھتے ہیں: "اور امتحان کی تفسیر میں دو قول ہیں: ایک یہ کہ اس سے مراد قسم ہے اور دوسرا وہ جو صحیح میں مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت کے ساتھ ان کا امتحان کیا کرتے تھے۔" الخ مختصراً۔ میں کہتا ہوں کہ صلح نامہ کی تحریر کے آغاز میں گزر چکا ہے کہ اس نا[illegible] کے نزدیک [illegible] (نہیں آئے گا آپ کے پاس ہم میں سے کوئی آدمی) کی روایت زیادہ مناسب ہے جیسا کہ تفصیل سے گزر چکا ہے اور یہی زیادہ مناسب ہے کیونکہ اس پر کوئی اشکال وارد نہیں ہوتا۔

ابوبصیر کا قصہ: پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم واپس مدینہ آ گئے۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے۔ اور بخاری کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کا نزول مدینہ کی واپسی سے قبل ہو چکا تھا۔ پس قریش کا ایک آدمی ابوبصیر (بفتح الباء و کسر الصاد المہملہ) آپ کے پاس آیا۔ جس کا نام عتبہ (بضم عین مہملہ و سکون تاء) ہے اور بعض نے عتیبہ

(بصیغۂ تصغیر) فرمایا ہے۔ گویا وہ تمیمی ہے، اور بنی زہرہ کا حلیف تھا، اس سے معلوم ہوا کہ حدیث الباب میں "قریش
کا آدمی" سے مراد ——— قریش کا حلیف ہے کیونکہ زہرہ قریش کی ایک شاخ تھی، پس قریش نے اس
کی طلب میں دو آدمی بھیجے، ابن سعد نے ایک کا نام خنیس (خا معجمہ، نون اور آخر میں سین مہملہ کے ساتھ بصیغۂ تصغیر)
ابن جابر ذکر کیا ہے، اور دوسرا اس کا غلام تھا جو "کوثر" کہلاتا تھا۔ اور ابن اسحٰق کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ ——
اخنس بن شریق اور ازہر بن عبد عوف نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام ایک خط لکھا اور اپنے ایک غلام اور
بنو عامر کے ایک شخص کو جس کو دو اونٹ اجرت کے دیئے گئے تھے، یہ خط دے کر بھیجا۔ اخنس تو ابو بصیر کے
قبیلہ بنو ثقیف کا ایک سردار تھا، اور ازہر کا تعلق ابو بصیر کے حلفاء بنو زہرہ سے تھا، اور دونوں کی طرف سے اس کی
واپسی کا مطالبہ تھا۔" اور واقدی نے یہ اضافہ کیا ہے کہ "یہ دونوں شخص ابو بصیر کے تین دن بعد آگئے۔" اور
انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ معاہدہ میں جو عہد آپ نے ہم سے ٹھہرایا تھا کہ ہمارے یہاں سے جو
شخص آپ کے پاس آئے گا آپ اسے واپس کریں گے، اس کو پورا کیجئے، اور انہوں نے ابو بصیر کی واپسی کا مطالبہ کیا، چنانچہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم نے وفاء عہد کی خاطر اسے ان دونوں کے حوالے کر دیا۔ حافظ کہتے ہیں کہ: ابن اسحٰق کی روایت میں
ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو بصیر سے فرمایا: "تجھے معلوم ہے کہ ان لوگوں سے کس قرار داد پر ہماری صلح ہوئی
ہے، اور ہم معاہدہ کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ اس لئے اپنی قوم میں واپس چلا جا۔ اس نے عرض کیا کہ کیا آپ
مجھے مشرکوں کی طرف واپس فرماتے ہیں جو مجھے دین سے برگشتہ کریں گے اور مجھے عذاب دیں گے؟ آپ نے فرمایا: صبر کر
اور ثواب کی نیت رکھ، اللہ تعالیٰ جلد ہی تیرے لئے اور تیرے ساتھ دوسرے کمزوروں کے لئے راستہ پیدا فرما دیں گے۔" اور ابو الملیح کی روایت
میں یہ اضافہ ہے کہ "حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابو بصیر سے کہا: تو بھی آدمی ہے وہ بھی آدمی ہیں، اور تیرے پاس
تلوار موجود ہے۔ یہ اس کے قتل کی طرف اشارہ تھا۔" یہ بھی کہا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ارشاد "اور تیرے
پاس تلوار ہے" میں اشارہ دشمن کی تلوار کی طرف ہے جو ذو الحلیفہ میں ابو بصیر نے اس سے طلب کی تھی، گویا حضرت عمر
رضی اللہ عنہ نے انہیں اس بات پر برانگیختہ کیا کہ اسے بھی موقع ملے تو دشمن کی تلوار لے کر اس کا فیصلہ چکا دے۔ پس
یہ دونوں شخص اس کو لے کر نکلے، یہاں تک کہ جب ذو الحلیفہ پہنچے تو وہاں اتر کر کھجوریں کھانے لگے، اور واقدی کی روایت
میں ہے کہ جب ذو الحلیفہ پہنچے تو ابو بصیر مسجد میں داخل ہو گئے، دو رکعتیں پڑھیں اور بیٹھ کر کھانا شروع کیا اور ان
دونوں کو بھی کھانے کی دعوت دی، جو ساتھ لائے تھے، انہوں نے دسترخوان بچھایا اور سب مل کر کھانے لگے۔ پس ابو بصیر
نے ایک شخص سے کہا۔ ابن اسحٰق کی روایت میں مروی ہے کہ عامری کو کہا، اور ابن سعد کی روایت میں ہے کہ

نہیں ہیں جیسا کہ کہا ہو واقف ہو بس میں تلوار تربیت ہو رہی معلوم ہوتی ہے۔ اس سے بعض شارحین نے جس کی تلوار تھی تلوار نیام سے
نکال کر کہا ہاں، اللہ کی قسم! یہ بہت عمدہ ہے، میں نے اس کا بار بار تجربہ کیا ہے، اور ایک روایت میں ہے کہ جیسا کہ
تم تعلق میں ہے: کریں دن رات اس شخص کو اس کے ساتھ مارتا رہوں گا۔ ابوبصیر نے کہا ذرا مجھے دکھاؤ دیکھوں
یہ کیسی ہے، اس لئے تو اس کو تھوڑی دیر میں ابوبصیر نے اس کو ایسی ماری کہ وہیں ٹھنڈا ہو گیا۔ یہ ٹھنڈا ہو گیا
بہ موت سے کنایہ ہے کیونکہ میت کی حرکت سکون سے بدل جاتی ہے۔ کذا فی الفتح۔ اور بعض نے کہا ہے کہ سرد ہونا موت
کو لازم ہے۔ اور ابن اسحٰق کی روایت میں ہے کہ پس ابوبصیر اس پر جھک گیا یہاں تک کہ اس کو قتل کر دیا۔ ابن حجر
مقدمہ کے فوائد میں لکھتے ہیں کہ معاویہ نے جب اس کو اپنی گردن میں سے لیا اور اس پر قبضہ کر لیا اس کے بعد
ان میں سے کسی کو قتل کر دیا تو وہ مقتول کا ضامن نہیں نہ دیت کے ساتھ نہ قصاص کے ساتھ اور امام بھی اس کا ضامن
نہیں بلکہ اس کا حکم اس شخص کا ہے جو دار الحرب کے اپنے علاقہ میں قتل کیا ہو کیونکہ اس پر امام کا حکم نافذ نہیں۔
چنانچہ ابوبصیر نے اس کو ذوالحلیفہ میں قتل کیا تھا اگرچہ حرم کی جگہ ہے مگر وہ اس کو اپنے قبضہ میں سے نکل گئے تھے اور امام کی
زد سے باہر اور اس کے حکم سے نکل چکا تھا۔ اور دوسرا بھاگ گیا۔ اور ابن اسحٰق کی روایت میں ہے کہ خوف سے بھاگ نکلا
اور ابن عائذ کی روایت میں ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بایں کیفیت بھاگا کہ اپنے کپڑے کا نیچے کا حصہ
منہ میں دبا رکھا تھا اور شرمگاہ کا ایک حصہ ننگا ہو رہا تھا اور تیز دوڑنے کی وجہ سے کنکریاں اس کے قدموں کے نیچے
اڑ رہی تھیں اور ابوبصیر اس کے پیچھے آ رہے تھے۔ حافظ کی پیروی میں نسخوں میں اسی طرح ہے۔ یہاں تک کہ
مدینہ منورہ (زادہا اللہ شرفاً و کرامۃ) آیا اور بھاگتے ہوئے مسجد میں داخل ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے
دیکھ کر فرمایا: اس نے تو کوئی خوف کی بات دیکھی ہے۔ جب یہ غلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا
تو کہا: میرا ساتھی قتل کر دیا گیا اور مجھے بھی قتل کر دیا جائے گا، یعنی اگر تم لوگوں نے اس کو نہیں ہٹایا۔ اور واقدی
کی روایت میں ہے کہ میں تو بچ نکلا ہوں، میں نے اس کا بدلہ نہیں لیا۔ اور ابوالاسود کی روایت عروہ سے
مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبصیر کو ان دونوں کے ساتھ حوالے کر دیا۔ انہوں نے اس کی مشکیں باندھ
لیں راستے میں وہ کہیں سو رہے تھے۔ اس نے دانت سے [illegible] کر اپنی رسیاں چھڑا لیں اور ایک کا سر کاٹ ڈالا اور ایک
کے تلوار ماری اور دوسرے کی طرف متوجہ ہوا تو وہ بھاگ نکلا۔ مگر پہلی روایت زیادہ صحیح ہے۔ کذا فی الفتح۔ اتنے میں ابوبصیر
بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ گیا۔ میں عرض کیا: یا رسول اللہ! اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ نے آپ
کا ذمہ پورا کر دیا۔ مطلقاً کہتے ہیں [illegible] قسم محذوف ہے اور جو عبارت ذکر کی گئی ہے یہ قسم محذوف کی تاکید ہے۔

حافظ کہتے ہیں: "یعنی میں نے جو کچھ کیا ہے اس سلسلہ میں ان کی جانب سے آپ پر کوئی ذمہ داری نہیں۔ اور واقدی
نے زہری سے یہ فقرہ بھی روایت کیا ہے کہ ابوبصیر نے کہا: یا رسول اللہ! میں جانتا تھا کہ قریش کے پاس جاؤں گا تو
کافر مجھے دین سے برگشتہ کر دیں گے۔ اس لئے میں نے یہ کچھ کیا اور معاہدہ تو ان کے اور آپ کے درمیان
ہے اور میرے اور ان کے درمیان تو کوئی معاہدہ نہیں۔ آپ تو مجھے ان کی طرف واپس کر ہی چکے ہیں۔ پھر
اللہ تعالیٰ نے مجھے ان سے نجات دلا دی۔ نسائی کہتے ہیں کہ ابن عقبہ کی روایت میں ہے کہ ابوبصیر مقتول
کا سامان لے کر آئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! اس کا خمس لیجئے، فرمایا: میں اس کا خمس لے لوں تو اس
کے معنی یہ ہیں کہ میں نے ان سے کیا ہوا وعدہ پورا نہیں کیا۔ لیکن تو جانے اور تیرے مقتول کا سامان جہاں
جی چاہے چلا جا۔ چنانچہ اس کے ساتھ جو پانچ مسلمان مکہ سے آئے تھے وہ بھی نکل گئے" تو میں کہتا ہوں:
ظاہر یہ ہے کہ یہ پانچ افراد ابوبصیر کے بعد مدینہ آئے تھے کیونکہ روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابوبصیر تنہا آیا
تھا جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دو شخصوں کے ساتھ واپس کر دیا جو اس کی طلب میں آئے تھے
روایات کے بیان میں یہی ٹھیک ہے۔ اس لئے مسند عبدالرزاق کی روایت میں راوی کا یہ کہنا کہ وہ پانچ آدمی بھی اس کے ساتھ
نکل گئے اس سے مراد دوسری مرتبہ مدینہ سے نکلنا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کی ماں کی ہلاکت
"ویل امہ" بضم لام و قطع ہمزہ و کسر میم مشدد یہ لفظ اصل میں بددعا کے لئے ہے۔ مگر یہاں تعجب کے لئے استعمال
ہوا ہے یعنی جنگ کی طرف اس کے اقدام کرنے، جنگ کی طرف جلد بازی کرنے اور جنگ کی آگ بھڑکانے پر
تعجب کا اظہار مقصود تھا۔ اور ایک روایت میں بغیر ہمزہ اور تخفیف کے ساتھ "ویلمہ" مروی ہے۔ یہ مفعول
مطلق کی حیثیت سے منصوب یا مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور جوہری کہتے ہیں کہ جب یہ
مضاف ہو تو صرف نصب ہی پڑھا جاتا ہے یہی تفصیل عینی میں ہے "یہ جنگ بھڑکانے والا ہے" "مسعر حرب" بکسر
میم و سکون سین و فتح عین مہملہ تمیز کی بنا پر منصوب ہے اور ابن اسحق کی روایت میں "محش حرب" کا لفظ ہے اس
کے بھی یہی معنی ہیں یعنی وہ شخص جس سے آگ کو حرکت دی جاتی ہے۔ "لو کان لہ احد" یعنی اگر کوئی
شخص اس کی مدد اور پشت پناہی کرتا۔ کذا فی الفتح۔ عینی نے یہ اضافہ کیا ہے کہ لفظ "لو" کا جواب محذوف
ہے یعنی اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اس کا کوئی ساتھی ہوتا جو اس کی مدد کرتا اور تائید کرتا۔" اور میرے نزدیک زیادہ
مناسب یہ ہے کہ لفظ "لو" تمنا کے لئے ہے اور ایک روایت میں ہے کہ "لو کان لہ رجال" یعنی کاش کچھ لوگ
اس کے ساتھ ہوتے۔ پس ابوبصیر نے اس تمنا کو سمجھ لیا اور چلا گیا۔ اس میں اس کے فرار کی طرف اشارہ تھا کہ

یعنی اس کا راستہ روک لیتے اور آگے جانے سے منع کرتے تھے یعنی انہیں قتل کر دیتے اور ان کے اموال پر قبضہ کر لیتے اور
ابن اسحٰق کی روایت میں ہے کہ جو کافر بھی ہاتھ لگتا اسے قتل کر دیتے اور ان کے پاس سے جو قافلہ گزرتا اُسے لوٹ
لیتے یہاں تک کہ قریش نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغام بھیجا۔ اور ایک روایت میں یہ ہے کہ انہوں نے ابوسفیان بن حرب
کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا اور نہایت منت سماجت سے درخواست کی کہ ابوجندل اور اس کے رفقاء کو
اپنے پاس بلا لیں۔ اور جو شخص ہمارے پاس سے نکل کر آپ کے پاس آئے گا وہ آپ کے لئے بغیر حرج کے حلال ہے
اور آپ کو وہ اللہ تعالیٰ کا اور صلہ قرابت کا واسطہ دیتے تھے یعنی وہ آپ سے کہہ رہے تھے ہم آپ کو
اللہ تعالیٰ کا اور قرابت کا واسطہ دیتے ہیں کہ آپ ان کو اپنے پاس بلا لیجئے پس جو شخص بھی آپ کے پاس آئے اس کو
امن یعنی اجازت ہے۔ عینی کہتے ہیں کہ فمن اتاہ یعنی اتاہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قریش
نے کچھ درخواست نہیں کی بجز اس کے کہ آپ ابو بصیر اور ان کے رفقاء کو پیغام بھیجیں کہ وہ قریش کی ایذا رسانی
سے باز رہیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف پیغام بھیج دیا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو بصیر کے نام ایک نامہ تحریر فرمایا اور آپ کا نامہ ایسے وقت میں پہنچا جب ابو بصیر نزع
کی حالت میں تھے چنانچہ ان کا انتقال — یعنی اس وقت ہوا جب آپ کا نامہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ ابوجندل نے
ان کو وہیں دفن کر دیا اور ان کی قبر کے پاس مسجد بنائی۔ اور ابوجندل اپنے رفقاء سمیت مدینہ آ گئے۔ بعد ازاں ہمیشہ وہیں
رہا کرتے یہاں تک کہ جہاد کے لئے ملک شام گئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں شہید ہو گئے اور
کہتے ہیں یہ بھی حضرت سے مشہور ہے کہ ابوجندل کو ان کے باپ کے حوالہ کیا جاتا تھا ان کو معلوم ہو گیا کہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اس چیز سے بہتر تھی جس کو وہ پسند کرتے تھے۔ کذا فی الفتح۔

اور تفسیر میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوجندل اور ابو بصیر کے نام تحریر فرمایا کہ وہ دونوں آپ کے
پاس مدینہ آ جائیں اور ان کے ساتھ جتنے مسلمان ہیں انہیں حکم دیں کہ اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں اور قریش کا کوئی
شخص یا قافلہ ان کے پاس سے گزرے تو اس سے تعرض نہ کریں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک ابو بصیر
اور ابوجندل کے پاس پہنچا تو ابو بصیر کا آخری وقت آ پہنچا چنانچہ ان کا انتقال ہو گیا تو ابوجندل اپنے رفقاء کے
ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور باقی لوگ اپنی اپنی جگہ واپس ہو گئے اور قریش کے قافلوں نے امن
سکون کا سانس لیا اور ابوجندل حیات آپ کے پاس رہے اور اس کے بعد جتنے غزوات ہوئے ان میں شریک رہے
اور فتح مکہ میں بھی شریک ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ واپس ہو گئے پس آپ کے پاس مدینہ میں رہے

تا آنکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا اور ان کے والد ماجد سہیل بن عمرو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ
کے ابتدائی دور خلافت میں مدینہ آئے۔ ایک مدت تک یہیں رہے۔ بعد جہاد کے لیے ملک شام کی طرف نکلے
ان کے ہمراہ ان کے صاحبزادے ابو جندل بھی تھے۔ پس باپ بیٹا دونوں جہاد کرتے رہے یہاں تک کہ وہیں
ان دونوں کو انتقال ہوا۔ رضی اللہ عنہما۔

حافظ ابن حجر ابو بصیر کے فوائد میں کہتے ہیں: عالم مشرک کو حیلے سے اچانک قتل کر دینا جائز ہے۔ ابو بصیر نے جو
کچھ کیا اسے غدر (عہد شکنی) نہیں کہا جا سکتا کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش کے مابین جو معاہدہ ہوا تھا،
ابو بصیر اس میں داخل نہیں تھا کیونکہ وہ اس وقت مدینہ میں محبوس تھا۔ لیکن جب اسے اندیشہ ہوا کہ وہ مشرک
اس کو مشرکین کے حوالے کر دے گا تو اس نے اس مشرک کو قتل کرکے اپنی ذات سے اس کے شر کو دفع کیا
اور اس حیلے سے اپنے دین کی مدافعت کی۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کام پر نکیر نہیں فرمائی۔ واقدی کی
بعض کی روایت میں ہے کہ سہیل ابن عمرو کو عامری کے قتل کی اطلاع ہوئی تو اس نے مقتول کی دیت کا مطالبہ
کیا کیونکہ وہ اس کے قبیلے کا فرد تھا۔ مگر ابو سفیان نے اس سے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا مطالبہ
نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ آپ نے تو اپنا عہد پورا کر دیا تھا۔ اور اس کو تمہارے قاصد کے سپرد کر دیا تھا۔ اور اس
نے آپ کے حکم سے اس کو قتل نہیں کیا۔ اور ابو بصیر کے ورثہ بھی اس کی دیت نہیں کیونکہ وہ مقتول کے دین
پر نہیں ہے۔

اونٹ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے مالک کی شکایت کرنا

ابو یوسف یحیٰ جو کاتب کے بیٹے ہیں کہتے ہیں کہ میں نے اس زمانے میں خواب دیکھا کہ ایک شخص مجھ سے فرمائش کرتا ہے کہ
میں عمرہ حدیبیہ کے بیان میں اس اونٹ کا قصہ بھی ذکر کروں جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے مالک کی
یہ شکایت کی تھی کہ وہ اس سے کام پورا لیتا ہے مگر اسے بھوکا رکھتا ہے۔ میں بیدار ہوا تو اس خواب سے حیرت
ہوئی کیونکہ ایک مدت سے یہ بات دل میں راسخ تھی کہ یہ واقعہ غیر مشہور کا ہے۔ اور اونٹ کا مالک ایک انصاری
شخص تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے احباب سے اس کی تفتیش کے لیے کہا۔ مگر کسی کو آخر تک خبر نہ ہوئی کہ یہ واقعہ حدیبیہ
کا ہے جو کہ قصہ حدیبیہ میں پیش آیا ہو۔ اور میں خود ضعف بصر کی بنا پر تلاش اور تتبع سے معذور تھا۔ لیکن میرے
حاشیہ نویس میں ملا کر میں نے اس میں پایا کہ یہ قصہ تھا۔ اور اس کی شرح زرقانی میں شامل ترقی سے اور مختلف
الفاظ سے مروی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک قصہ نہیں ہے چنانچہ اور اس کی شرح میں آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم سے اونٹ کی شکایت کرنے اور آپ کو سجدہ کرنے کے کئی واقعات مذکور ہیں اور مشکوٰۃ میں
حضرت یعلیٰ بن مرہ ثقفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
سے تین چیزیں یعنی تین معجزات دیکھی ہیں۔ ایک یہ کہ ہم ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جا رہے تھے کہ
ہم ایک ایسے اونٹ کے پاس سے گزرے جس پر پانی لاد کر لایا جاتا تھا۔ پس جب اونٹ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ
وسلم کو دیکھا تو بلبلایا اور اپنی گردن رکھ دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہاں ٹھہر گئے اور دریافت فرمایا کہ اس
اونٹ کا مالک کہاں ہے؟ وہ حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا: اس کو میرے پاس فروخت کر دو۔ اس نے عرض کیا
یا رسول اللہ! ہم اس کو آپ کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کرتے ہیں اور بات یہ ہے کہ یہ اونٹ ایسے گھر کا ہے جن
کے پاس اس کے سوا کوئی اور ذریعہ معاش نہیں ہے۔ فرمایا: تعجب ہے تو نے اس کا یہ قصہ ذکر کیا ہے تو (ہم اس کو قیمت
لینا نہیں چاہتے لیکن) اس نے شکایت کی ہے کہ اس سے کام زیادہ لیا جاتا ہے اور چارہ کم دیا جاتا ہے۔ اس لیے
(آئندہ اس کو شکایت کا موقعہ نہ دو) اس کے ساتھ بہتر سلوک سے پیش آؤ۔ پھر ہم آگے چلے یہاں تک کہ ایک
منزل پر اترے پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سو گئے ــ یہاں ایک درخت کے آنے کا قصہ مذکور ہے۔
وہ فرماتے ہیں کہ پھر ہم آگے چلے اور ایک پانی کے پاس سے گذرے تو ایک عورت آپ کے پاس اپنے بچے
کو لائی جس پر جنات کا اثر تھا۔ الخ یہ حدیث صاحب مشکوٰۃ نے شرح السنہ کے حوالے سے نقل کی ہے اور ابھی
تک مجھے اس سفر کی تعیین نہیں ہوئی۔ اور ملا علی قاری نے اس کی شرح میں صرف یہ لکھا ہے: تین چیزیں یعنی تین
معجزات میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دیکھے یعنی ایک ہی سفر میں۔ مگر سفر کی تعیین نہیں کی اور
سیوطی نے الخصائص میں ایک فصل ان معجزات میں ذکر کی ہے جو تبوک کے راستے میں صادر ہوئے تھے اور ان میں
یعلیٰ بن مرہ کی حدیث بروایت احمد وغیرہ نقل کی ہے۔ لیکن حدیث میں تبوک کا ذکر نہیں بلکہ اس کے الفاظ یہ ہیں
کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ کا سفر کیا۔ الخ اور اس میں سفر حج اور عمرہ دونوں کا احتمال
ہے۔ پس اگر اس کا مکہ کا سفر عمرہ میں ہونا ثابت ہو تو کوئی مانع نہیں کہ اس کا عمرہ حدیبیہ میں ہونا تسلیم کیا جائے
البتہ اونٹ کو بھوکا رکھنا اور زیادہ کام لینے کا واقعہ بار بار مدینہ میں پیش آیا۔ چنانچہ یہ قصہ ابو داؤد نے کتاب الجہاد
میں عبداللہ بن جعفر سے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اپنے پیچھے
سوار کیا پس آپ انصار کے ایک شخص کے باغ میں تشریف لے گئے وہاں ایک اونٹ تھا۔ جب اس
نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو بلبلایا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے الخ اس حدیث کے آخر میں

حیثیت کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے مالک سے فرمایا: "اس نے میرے پاس شکایت کی ہے کہ تم اسے بھوکا رکھتے ہو اور ہمیشہ کام لیتے ہو"۔ پس اس بیان سے معلوم ہو گیا کہ یہ قصہ مدینہ منورہ میں پیش آیا۔

تیسری فصل عمرۂ قضا میں

حنفیہ اور ان کے موافقین جن کے نزدیک محصر کے عمرہ کی قضا واجب ہے ان کے نزدیک یہ عمرۃ القضاء (جس کے ساتھ) کہلاتا ہے، اور شافعیہ اور ان کے موافقین جن کے نزدیک قضا واجب نہیں ان کے نزدیک یہ عمرۃ القضاء (بغیر مسلک) اور عمرۃ القضیہ کہلاتا ہے۔ حافظ ابن قیم ہدی میں کہتے ہیں: دوم عمرۃ القضیہ، اس میں اختلاف ہے کہ گزشتہ سال جس عمرہ سے آپ روک دیے گئے تھے یہ اس کی قضا تھی یا یہ مستقل عمرہ تھا؟ اس میں علماء کے دو قول ہیں، امام احمد سے دونوں روایتیں مروی ہیں، ایک یہ کہ یہ قضاء تھی، اور یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے، دوم یہ کہ قضاء نہیں تھا، اور یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ جو حضرات کہتے ہیں کہ یہ قضا تھا ان کا استدلال یہ ہے کہ اس کا نام ہی عمرۃ القضاء ہے اور یہ نام اول سے حکم کے ۔ دوسرے حضرات کہتے ہیں کہ یہاں قضا سے کے معنی ادا کرنے کے نہیں بلکہ قضا بمعنی مقاضات یعنی فیصلہ کے ہیں۔ چونکہ اس عمرہ کے ادا کرنے کا ان سے فیصلہ ہوا تھا اس لیے اس کو عمرۃ القضاء اور عمرۃ القضیہ کہا گیا۔ اھ

اور تاریخ خمیس میں لکھا ہے کہ عمرۃ القضیہ، عمرۃ القضاء، اور عمرۃ القصاص بھی ہے۔ زرقانی نے یہ اضافہ کیا ہے کہ اس کا نام عمرۃ الصلح بھی ہے جو حاکم نے ذکر کیا ہے اور صاحب خمیس نے اس پر عمرۃ الامن کے نام کا بھی اضافہ کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کا نام عمرۃ القضاء اس لیے ہوا کہ یہ اس عمرہ کی قضا تھی جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو روک دیا گیا تھا، اور ابن ہشام کہتے ہیں کہ اس کو عمرۃ القصاص اس لیے کہتے ہیں کہ کفار نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گزشتہ میں عمرہ کرنے سے روک دیا تھا اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے بدلہ لیا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آئندہ سال اسی حرمت کے مہینے شہر حرام (ذی القعدہ) میں کہ تشریف لے گئے جس میں انھوں نے روکا تھا، اور یہی بعض کہتے ہیں کہ ذکر کیا گیا ہے کہ اسی عمرہ کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: الشهر الحرام بالشهر الحرام والحرمات قصاص۔

میں کہتا ہوں کہ کون نہیں جانتا کہ اس کا نام عمرۃ القضاء بہ نسبت دوسرے ناموں کے زیادہ مشہور ہے اور

پر ناجیہ بن جندب اسلمی کو مقرر کیا۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے آگے درختوں میں چراتے جا رہے تھے۔ ان
کے ساتھ بنو اسلم کے چار جوان تھے۔ اس کو واقدی نے روایت کیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے
نے ہتھیار، زرہیں، خودیں اور نیزے اور سو گھوڑے بھی اپنے ساتھ لے لیے۔ پس جب ذوالحلیفہ پہنچے تو گھوڑے
آگے بھیج دیے اور محمد بن مسلمہ انصاری کو ان پر نگران مقرر فرمایا اور ان کو اور ہتھیاروں کو آگے بھیج دیا اور
بشیر بن سعد کو۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ہتھیاروں کی نگرانی پر مامور فرمایا۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ! آپ نے
ہتھیار بھی ساتھ اٹھا لیے حالانکہ ان کی شرط یہ تھی کہ آپ ہمارے پاس ہتھیاروں کے ساتھ داخل نہیں ہوں گے بجز
نیام میں بند تلوار کے جو مسافر کا ہتھیار ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہم ان کو حرم میں نہیں لے
جائیں گے بلکہ وہ حرم کے قریب ہی رہیں گے اور خدانخواستہ ان کی طرف سے کوئی شرارت ہوئی تو ہتھیار پاس
قریب ہوں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے باب مسجد سے احرام باندھا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے
فرع کا راستہ اختیار فرمایا تھا۔ اگرچہ آپ یہاں سے احرام باندھتے۔ اس کو واقدی نے حضرت جابر سے
روایت کیا ہے اور طبرانی نے اس کو حضرت جابر سے بغیر فرع کے ذکر کے روایت کیا ہے اور غالباً اسی
طرح ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسلمانوں نے تلبیہ پڑھا اور
محمد بن مسلمہ گھوڑوں کو لے کر مر الظہران جا پہنچے جو قریب کا ہی ایک مقام ہے۔ وہاں قریش کے چند آدمیوں
سے ملاقات ہوئی انہوں نے گھوڑوں کے ساتھ لانے کا سبب پوچھا۔ بولے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کل صبح
سویرے یہاں آیا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ قریش کے پاس گئے اور انہیں اس قصہ سے آگاہ کیا۔ وہ گھبرا گئے اور بولے
واللہ! ہم نے کوئی نئی حرکت نہیں کی۔ ہم تو اپنی تحریر اور معاہدے کی مدت پر قائم ہیں پھر محمد صلی اللہ
علیہ وسلم اپنے صحابہ کو لے کر ہم پر کیوں چڑھائی کرتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے مکرز نامی ایک
شخص کو قریش کے چند لوگوں کے ہمراہ بھیجا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت بطن یاجج میں صحابہ
کے ہمراہ تشریف فرما تھے اور وہیں کے باہر اور ہتھیار بھی یہاں پہنچ گئے تھے۔ ان لوگوں نے یہاں آپ
صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی اور عرض کیا: آپ نے بچپن سے آج تک کبھی معاہدہ کی خلاف ورزی
نہیں کی۔ اب آپ حرم میں اپنی قوم پر ہتھیاروں سمیت داخل ہوں گے؟ حالانکہ آپ نے ان سے شرط کر
رکھی ہے کہ آپ صرف مسافر کے ہتھیار کے ساتھ داخل ہوں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
میں ان پر ہتھیار لے کر داخل نہیں ہوں گا۔ یہ سن کر مکرز لوٹا۔ آپ اس نیکی اور وفائے عہد کے ساتھ

احرام کی حالت میں تھے۔ اور آپ کی جانب سے ان کو چار سو درہم مہر ادا کیا گیا۔" اھ اس کلام سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کو مدینہ سے یا ذوالحلیفہ سے روانہ کیا تھا مگر یہ اس بارے میں صریح نہیں اور حافظ ابن قیمؒ نے کہا ہے کہ "جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بطن یاجج پہنچے تو سارا سامان وہاں رکھ دیا، اور جعفر بن ابی طالب کو حضرت میمونہؓ کی طرف نکاح کا پیغام دے کر روانہ کیا۔ انھوں نے پیغام پہنچایا تو حضرت میمونہؓ نے اپنا معاملہ حضرت عباسؓ کے سپرد کر دیا اور انھوں نے حضرت میمونہؓ کا نکاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا۔" اھ اور ابن کثیر نے موسیٰ بن عقبہ کی مغازی سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔ نیز المختصر میں ہے کہ "ان کے نکاح کے قصہ میں یہ بھی مروی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عمرۃ القضاء کے لیے تشریف لے گئے تو حضرت عباسؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مقام جحفہ میں ملاقات کی۔ اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میمونہ بنت حارث بیوہ ہو گئی ہیں کیا آپ کو ان سے نکاح کی رغبت ہے؟ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بحالت احرام ان سے نکاح کیا۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت جعفرؓ کو حضرت میمونہؓ کے پاس بھیجنے اور حضرت عباس کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نکاح کی سفارش کرنے کے مابین تعارض نہیں کیونکہ بظاہر حضرت عباسؓ کی تحریک کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفرؓ کو حضرت میمونہؓ کے پاس نکاح کا پیغام دے کر بھیجا، اس پر انھوں نے اپنا معاملہ حضرت عباسؓ کے سپرد کر دیا اور حضرت عباسؓ نے ان کا نکاح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کر دیا۔

میں کہتا ہوں کہ امام مالکؒ نے موطا میں سلیمان بن یسار سے روایت کیا ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خادم ابو رافعؓ کو انصار کے ایک شخص کی معیت میں روانہ کیا، ان دونوں نے حضرت میمونہؓ کا نکاح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کر دیا جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابھی تک مدینہ ہی میں تشریف فرما تھے اور سفر کا آغاز نہیں فرمایا تھا۔" گزشتہ دونوں قول یعنی حضرت جعفرؓ کو بھیجنا اور حضرت عباسؓ کا نکاح کی درخواست کرنا ان ــــ دونوں کے درمیان اور موطا امام مالک کی روایت کے درمیان تطبیق یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ان دونوں صاحبوں کو حضرت میمونہؓ کی رائے دریافت کرنے کے لیے روانہ کیا، پھر حضرت عباسؓ نے جحفہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مذکورہ بالا درخواست کی تو آپ نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کو بھیجا، انھوں نے اپنا معاملہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا تو

انھوں نے مقام سرف میں ان کا نکاح کیا۔

بحالت احرام نکاح کرنے کا حکم

نوٹ: یہاں ایک مشہور طویل الذیل فقہی بحث ہے کہ محرم کا نکاح جائز ہے یا نہیں؟ بذل اور اوجز وغیرہ شروح حدیث میں اس پر بہت تفصیل سے کلام کیا گیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ محرم کا نکاح ائمہ ثلاثہ کے نزدیک صحیح نہیں، اگر اس نے نکاح کیا تو وہ باطل ہوگا۔ اور حضرات حنفیہ اور ان کے موافقین کے نزدیک جائز ہے، البتہ اس باب میں جو ممانعت وارد ہوئی ہے وہ کراہت تنزیہی پر محمول ہے۔ اس لیے کہ وہ خلاف اولیٰ ہے کیونکہ یہ وقت اہم ترین عبادت میں مشغول ہونے اور ظاہر و باطن کے ساتھ حق تعالیٰ کے سامنے گڑگڑانے کا ہے۔ اور حضرت میمونہ سے نکاح کرنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل بیان جواز کے لیے تھا اور کسی فعل کو باوجود کراہت کے بیان جواز کی غرض کیلئے کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اجر عظیم کا موجب تھا۔ جیسا کہ علماء کے ہاں معروف ہے۔ اور فریقین کے دلائل اور وجوہ ترجیح کی تفصیل بذل میں ہے، اس مختصر میں اس کی گنجائش نہیں۔ اور شیخ المشائخ گنگوہی قدس سرہ نے کوکب میں اس پر بہت ہی عمدہ کلام کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں: "ائمہ ثلاثہ کا یہ مذہب کہ نکاح باطل ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صریح فعل سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ اور اس کے برعکس ایک روایت میں جو آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت میمونہ سے اس وقت نکاح کیا جبکہ آپ احرام کی حالت میں نہیں تھے، تو یہ یا تو غلط ہے یا مجاز پر محمول ہے کہ نکاح سے مراد مقاربت لی جائے کیونکہ تمام مؤرخین اور محدثین اس امر پر متفق ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ جاتے ہوئے موضع سرف میں نکاح کیا تھا۔ اب کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم احرام کے بغیر مکہ تشریف لے گئے تھے؟ جب سب کا اتفاق ہے کہ نکاح موضع سرف میں ہوا اور یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت مکہ جا رہے تھے، تو اندریں صورت یہ کیسے تصور کیا جاسکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بحالت عدم احرام نکاح کیا ہو؟ پس مقام سرف کے لطائف میں سے ہے کہ اسی جگہ حضرت میمونہ کا نکاح ہوا، اور مکہ سے واپسی پر اسی جگہ ان کی رخصتی عمل میں آئی، اور بالآخر ایک سفر میں اسی جگہ ان کا وصال ہوا۔ اھ

میں کہتا ہوں کہ ان مقبول امور کا عجائبات میں سے شمار کیا جانا، جیسا کہ اہل تاریخ کو مسلم ہے، اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ یہ تینوں واقعات الگ الگ اسفار میں پیش آئے ہوں۔ اور اگر نکاح اور رخصتی ایک ہی سفر میں ہوئی ہو تو اس میں کچھ بھی غرابت اور تعجب انگیز بات نہیں بجز تکلف کے

اس پر متفق ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں رخصتی کا قصد فرمایا تھا اور اہلِ مکہ کو ولیمہ کی دعوت دی تھی۔ مگر انھوں نے قبول نہیں کی۔ تو گویا نکاح سے قبل ہی ولیمہ کا قصد فرمایا تھا۔ چنانچہ حافظ ابن قیمؒ نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تین دن رہے، جب چوتھے دن کی صبح ہوئی تو سہیل اور حویطب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں گئے اور حویطب نے بلند آواز سے پکار کر کہا ابھی تک تم ہماری زمین سے نہیں نکلے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے تمہارے یہاں کی ایک خاتون سے نکاح کیا ہے۔ اگر میں اس کی رخصتی تک ٹھہروں تو تمہارا کیا حرج ہے؟ ہم کھانا تیار کریں گے ہم سب کھائیں گے اور تم بھی ہمارے ساتھ کھاؤ گے۔ اس پر انھوں نے کہا ہم آپ کو اللہ تعالیٰ کا اور معاہدہ کا واسطہ دے کر کہتے ہیں کہ آپ فوراً یہاں سے چلے جائیں۔ پورا قصہ آگے آتا ہے۔ اور یہ پورا قصہ ابن ہشام نے ابن اسحاق سے نقل کیا ہے۔ اور امام بخاری نے اپنی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بحالتِ احرام حضرت میمونہؓ سے نکاح کیا، پھر مکہ میں تین روز قیام پذیر رہے اور تیسرے دن حویطب قریش کے چند افراد کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ آپ کی میعاد ختم ہو چکی، اس لیے یہاں سے نکل جائیے" الخ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مکہ میں داخل ہونا اور کفار کا مکہ چھوڑ کر باہر نکل جانا

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ناقہ قصواء پر سوار تھے اور مسلمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چاروں طرف تلواریں حمائل کیے ہوئے تلبیہ پڑھ رہے تھے اور کفارِ قریش یعنی ان کے اکابر و اشراف خدا اور رسول سے عداوت کی بنا پر مکہ چھوڑ کر پہاڑوں کی چوٹیوں کی طرف نکل گئے۔ انھیں اس بات پر طاقتِ صبر نہیں تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو طواف کرتے دیکھیں۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ وہ لوگ اسی دشمنی کی بنا پر باہر نکل گئے کیونکہ انھیں بغض و عداوت کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دیکھنا گوارا نہ تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدی کے اونٹ آگے بھیج دیے اور انھیں مکہ کے قریب وادی طُویٰ میں رکھا گیا تاکہ جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) عمرہ سے فارغ ہوں تو ان کو نحر کے لیے لایا جائے۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ثنیّہ کدا سے (مکہ میں) داخل ہوئے۔ کَدا: بفتح اول و مد کے ساتھ۔ وہ گھاٹی جو حجون کے اوپر حصہ میں ہے اور حجون: بفتح حائے مہملہ۔ وضم جیم اور واو اور نون کے ساتھ۔ مکہ میں ایک پہاڑ کا نام ہے۔ اور حجۃ الوداع"

ہیں گذر چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اونٹنی پر آگے سے داخل ہوتے تھے۔

عبداللہ بن رواحہؓ کے اشعار

اور عبداللہ بن رواحہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی کی مہار تھام رکھی تھی۔ اور ایک روایت میں ہے کہ وہ آپ کی رکاب تھامے ہوئے تھے۔ لیکن ممکن ہے کبھی مہار پکڑتے ہوں اور کبھی رکاب تھام لیتے ہوں اور کبھی آپ کے آگے آگے چلتے ہوں۔ اور تلوار حمائل کئے رجزیہ شعر پڑھ رہے تھے

خلوا بني الكفار عن سبيله — اليوم نضربكم على تنزيله

ضرباً يزيل الهام عن مقيله — ويذهل الخليل عن خليله

(ترجمہ) اے کافروں کی اولاد! آپ کا رستہ چھوڑ دو۔ آج اس (قرآن) کی تنزیل پر ہم تمہیں ماریں گے۔ اور ایسا ماریں گے کہ سر تن سے جدا ہو جائیں گے اور دوست دوستوں کو بھول جائیں گے۔

ابن رواحہؓ کے اشعار کے سلسلہ میں مختلف روایات آئی ہیں جیسا کہ الخمیس میں ہے اور حافظ ابن حجر نے یہ اشعار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طواف بیت اللہ کے وقت ذکر کئے ہیں۔ یہ اشعار سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "اے ابن رواحہ! تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اور اللہ تعالیٰ کے حرم میں شعر پڑھتے ہو؟" زرقانی کہتے ہیں: یعنی ان اشعار سے اعداء کا غصہ بھڑک جائے تو حرم میں قتال کی نوبت آ سکتی ہے۔ یا یہ مطلب تھا کہ اس موقعہ پر شعر خوانی اس کمال ادب کے منافی ہے جس کے ہم عادی ہیں، خصوصاً عبادت کی حالت میں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے فرمایا: "اے عمر! ان کو چھوڑ دو، کیونکہ یہ اشعار کفار کے لئے تیروں کی بارش سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہیں۔" اور ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابن رواحہ یہ پڑھو: "لا الہ الا اللہ وحدہ نصر عبدہ و اعز جندہ و ہزم الاحزاب وحدہ۔" (اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ یگانہ ہے، اس نے اپنے بندے کی مدد فرمائی، اور اپنے لشکر کو عزت بخشی، اور جماعتوں کو تنہا شکست دی)۔ چنانچہ ابن رواحہؓ نے یہ کلمات کہے اور ان کے ساتھ مسلمانوں نے بھی یہ کلمات کہے۔

میں لکھ چکا ہوں کہ یہاں اس امر کی تصریح ضروری ہے کہ امام ترمذی اور نسائی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عمرۃ القضاء میں مکہ میں داخل ہوئے اور عبداللہ بن رواحہؓ آپ کے آگے یہ شعر پڑھتے جا رہے تھے۔ خلوا بني الكفار عن سبيله الخ۔ اور یہی حضرت عمرؓ نے

ان سے کہا کہ اے ابن رواحہ! تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اور اللہ تعالیٰ کے حرم میں شعر کہتے
ہو؟ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عمر! ان کو کہنے دو، کیونکہ شعر کافروں پر تیروں کی
بارش سے بھی زیادہ موثر اندازہ ہیں۔ امام ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث اس سند سے حسن صحیح ہے اور ایک
دوسری حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عمرۃ القضاء میں مکہ میں داخل ہوتے اور کعب
بن مالک آپ کے آگے آگے تھے، اور بعض علماء حدیث کے نزدیک یہ دوسری حدیث زیادہ صحیح ہے،
کیونکہ عبداللہ بن رواحہؓ جنگ موتہ میں شہید ہوئے اور عمرۃ القضاء اس کے بعد ہوا۔ اھ

امام ترمذی کا یہ کہنا کہ عمرۃ القضاء غزوہ موتہ کے بعد ہوا، وہم ہے، کیونکہ عمرۃ القضاء ۷ھ میں ہوا
اور غزوہ موتہ ۸ھ میں، جیسا کہ معروف ہے۔ حافظ ابن حجرؒ کہتے ہیں: یہ ذہول شدید اور غلط مردود ہے،
میں نہیں جانتا کہ امام ترمذیؒ وفور معرفت کے باوجود اس غلطی میں کیسے جا پڑے۔ عمرۃ القضاء میں حضرت
جعفرؓ، حضرت علیؓ اور زید بن حارثہؓ کا حضرت حمزہؓ کی صاحبزادی کے بارے میں جھگڑنا ایک معروف واقعہ
ہے جیسا کہ آگے آئے گا، اور حضرت جعفرؓ، حضرت زیدؓ اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ ایک ہی معرکہ میں
شہید ہوئے۔ آخر امام ترمذی پر ایسی چیز کیسے مخفی رہ گئی؟ بعد ازاں مجھے بعض لوگوں کی تحریر ملی کہ ترمذی
میں حضرت انسؓ کی حدیث کے ذیل میں یہ لکھا ہے کہ "یہ واقعہ فتح مکہ کا ہے" اگر یہ صحیح ہو تو امام ترمذی کا اعتراض
بجا ہے، لیکن ترمذی کے راوی کرخی کے ہاتھ کا لکھا ہوا جو نسخہ موجود ہے اس میں یہی عبارت ہے جو اوپر
گذر چکی ہے۔ واللہ اعلم۔ اھ میں کہتا ہوں کہ "بعض لوگوں" سے حافظ کی مراد غالباً ابن قیمؒ ہیں،
کیونکہ انھوں نے الہدی میں کہا ہے کہ ترمذی وغیرہ میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتح کے دن
مکہ میں داخل ہوتے، درآنحالیکہ عبداللہ بن رواحہؓ آپ کے آگے یہ شعر پڑھ رہے تھے ———
خلوا بنی الکفار عن سبیله۔ مگر یہ وہم ہے کیونکہ ابن رواحہؓ فتح مکہ ہونے سے چار ماہ قبل جنگ موتہ میں شہید
ہوچکے تھے، وہاں آپ کے سامنے ابن رواحہ کے شعر پڑھے جاتے تھے۔ اور یہ ایسی حقیقت ہے جس میں
اہل علم کا کوئی اختلاف نہیں۔ اھ اور کتب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حضرت عمرؓ کے
انکار کی وجہ پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم برابر لبیک کہتے رہے یہاں تک کہ آپ
نے اپنی چھڑی کے ساتھ رکن یعنی حجر اسود کا استلام کیا۔ درآنحالیکہ آپ نے اپنے کپڑے سے اضطباع
کر رکھا تھا۔ (اضطباع کے معنی یہ ہیں کہ چادر کو داہنی بغل کے نیچے سے نکال کر اس کے دونوں پلو

کندھے پر آگے پیچھے نکالے جاتے ہیں) ابن قیم لکھتے ہیں کہ آپ نے اضطباع کرنے کا حکم فرمایا کہ اپنے کندھے برہنہ رکھیں
اور طواف میں تیز چلیں تاکہ مشرکین کے سامنے ان کی قوت و طاقت کا اظہار ہو۔ اور آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم ہر ممکن طریقے سے ان کو مرعوب کرنے کی تدبیر کیا کرتے تھے۔ اور آپ نے اپنی اونٹنی پر طواف کیا تھا
کہ ابن سعد اور واقدی نے ذکر کیا ہے۔ اور ان دونوں نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ آپ کو کوئی عذر نہیں تھا۔
اور ابن اسحاق وغیرہ نے ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیدل طواف کیا۔ تین
پھیروں میں تیز تیز چلے اور باقی پھیروں میں اپنی رفتار سے چلے۔ اور مسلمان آپ کے ساتھ پیدل طواف کرتے
تھے اور تلاوت کرتے تھے۔ اور ابن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ
کیا اور ہم نے بھی آپ کے ساتھ عمرہ کیا۔ پھر جب آپ مکہ میں داخل ہوئے تو آپ نے طواف کیا اور ہم
نے آپ کے ساتھ طواف کیا۔ اور آپ صفا و مروہ آئے تو ہم بھی آپ کے ساتھ آئے۔ اور ہم آپ کو
اہل مکہ سے چھپائے رکھتے تھے کہ کہیں کوئی شخص آپ پر تیر نہ پھینکے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ہم آپ
کو مشرکوں اور مشرکوں کے لڑکوں سے بچا رہے تھے کہ کہیں آپ کو ایذا نہ دیں۔ یہ دونوں روایتیں
بخاری کی ہیں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ جب آپ مکہ تشریف لائے اور عمرۃ القضاء میں بیت اللہ
کا طواف کیا تو پھر آپ کو انھوں نے بچوں سے بچا رکھا تھا کہ مبادا آپ کو تکلیف پہنچا دیں۔ اور
رہا یہ کہ انھوں نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح اضطباع کر رکھا تھا (اضطباع کی تفسیر اوپر
گذر چکی ہے) اور انھوں نے رمل کیا۔ رمل اور اضطباع کی بحث جزء ثانی اور رابع میں گذر چکی ہے۔ پس ایک
مرد مومن ہیں اور پہاڑ پر کھڑے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو طواف کرتے دیکھ رہے تھے۔

رمل کا سبب اور اس کی ابتدا

اور صحیحین میں بروایت بخاری حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ مشرکین نے کہا کہ یہ لوگ تمہارے پاس آ رہے ہیں
جن کو یثرب کے بخار نے کمزور کر دیا ہے۔ پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ پہلے تین پھیروں
میں رمل کریں اور رکن یمانی اور حجر اسود کے بیچ معمولی رفتار سے چلیں۔ اور تمام پھیروں میں رمل کا حکم دینے
سے کوئی چیز مانع نہیں تھی بجز اس کے کہ آپ ان پر شفقت کرتے ہوئے ان کی رعایت فرمانا چاہتے تھے۔
اور ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: رمل کرو تاکہ مشرکین تمہاری قوت کا مشاہدہ کریں اور مشرکین
جبل قعیقعان کی جانب کھڑے تھے۔ اور اسد الغابہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں نے اضطباع کر

رمل کیا اور یہ اسلام میں سب سے پہلا رمل اور اضطباع تھا۔ اور آگے یہ بتایا کہ قریش نے باہم چہ میگوئیاں کیں جیسا کہ ابن اسحاق نے ذکر کیا ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ عسرت و مشقت اور تنگی میں ہیں۔ پس وہ دار الندوۃ کے پاس صف باندھ کر بیٹھ گئے تاکہ آپ کو اور آپ کے صحابہ کو دیکھیں۔ پس جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں داخل ہوئے تو اپنی رداء مبارک کے ساتھ اضطباع کیا اور فرمایا: اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم فرمائے جو آج ان کافروں کے سامنے اپنی قوت کا مظاہرہ کرے۔ پھر آپ نے حجر اسود کا استلام کیا اور دوڑتے ہوئے نکلے اور حضرات صحابہ نے بھی آپ کے ساتھ دوڑ لگائی (یعنی رمل کیا) یہاں تک کہ جب آپ اُن سے بیت اللہ کی آڑ میں آ گئے اور رکن یمانی کا استلام کیا تو معتاد رفتار سے چلے اور حجر اسود کا استلام کرنے کے بعد پھر رمل کیا۔ تین پھیرے اسی طرح پورے کئے اور باقی پھیروں میں عام رفتار سے چلے۔ انتہیٰ

میں کہتا ہوں کہ امام بخاری، امام مسلم اور امام ابو داؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ ابو داؤد کے الفاظ یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ تشریف لائے تو صحابہ یثرب کے بخار کی وجہ سے لاغر تھے۔ پس مشرکوں نے کہا کہ تمہارے یہاں ایسے لوگ آ رہے ہیں جن کو بخار نے لاغر کر دیا ہے۔ اور انہوں نے اس سے تکلیف اٹھائی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی گفتگو سے مطلع فرمایا۔ پس آپ نے ان کو حکم دیا کہ وہ تین پھیروں میں رمل کریں اور رکن یمانی اور حجر اسود کے درمیان عام رفتار سے چلیں۔ پس جب مشرکوں نے ان کو رمل کرتے دیکھا تو کہنے لگے یہی لوگ ہیں جن کے بارے میں تم کہتے تھے کہ ان کو بخار نے لاغر کر دیا ہے۔ یہ لوگ تو ہم سے بھی زیادہ قوی اور مضبوط ہیں۔ الخ۔ اور ایک روایت میں ہے کہ قریش کہتے تھے کہ گویا یہ ہرن جیسے ہیں۔

زرقانی کہتے ہیں کہ امام احمد نے ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عمرہ میں "مر الظہران" میں اترے تو آپ کے صحابہ کو خبر ہوئی کہ قریش ان کے ضعف کے افسانے بیان کر رہے ہیں۔ پس بعض نے کہا کہ اگر ہم اپنی سواریوں کو ذبح کر کے ان کا گوشت کھائیں اور شوربا پئیں تو کل جب ان لوگوں کے یہاں جائیں گے تو تازہ دم ہوں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایسا نہ کرو بلکہ اپنے توشے جمع کر کے میرے پاس لاؤ۔ چنانچہ انہوں نے جمع کر کے دستر خوان بچھائے اور خوب کھایا اور پھر کھانا باقی بچ رہا تو ہر ایک نے اپنے توشہ دان میں بھر لیا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ

نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کی گفتگو سے مطلع کر دیا۔ پس آپ نے ان کو حکم دیا کہ رمل کریں الخ"
پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اونٹنی پر صفا اور مروہ کے درمیان طواف کیا یعنی سعی کی۔ سعی کو طواف
کہنا حق تعالیٰ کے ارشادات یطوف بہما کی اقتدا کی بنا پر ہے۔ پہلے گزر چکا ہے کہ ہدی کے جانور ذی
طویٰ میں چھوڑ دیے گئے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طواف وسعی سے فارغ ہونے تک وہ آپ کے
حکم سے مروہ کے پاس لائے جا چکے تھے۔ چنانچہ آپ جب سعی کے ساتویں پھیرے سے فارغ ہوئے تو فرمایا:
"یہ نحر کی جگہ ہے اور مکہ کا ہر گلی کوچہ نحر ہے"۔ پھر آپ نے ان ساٹھ اونٹوں کو جو ساتھ لائے تھے مروہ کے پاس نحر
کیا اور اسی جگہ حلق کرایا۔ صاحب اتحاف نے ذکر کیا ہے کہ معمر بن عبداللہ العدوی نے آپ کا حلق کیا تھا۔ یہی
عمل مسلمانوں نے کیا۔ واقدی کہتے ہیں کہ آپ کے ساتھ ان لوگوں نے بھی نحر کیا تھا جو حدیبیہ میں شریک نہیں
تھے۔ مگر انھوں نے نحر نہیں کیا اور جو لوگ حدیبیہ میں شریک تھے اور عمرۃ القضاء کے لئے بھی آئے انھوں نے
بدنہ میں اشتراک کیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو سو صحابہ کو ان کے طواف وسعی سے فارغ
ہونے کے بعد حکم فرمایا کہ وہ بطن یاجج چلے جائیں اور اسلحہ کی نگرانی کریں۔ اور دوسرے لوگ جو وہاں تھے
اور انھوں نے ابھی تک مناسک ادا نہیں کئے وہ آکر مناسک ادا کریں۔ چنانچہ آپ کے ارشاد کی تعمیل
کی گئی۔

عمرۃ القضاء میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ کے اندر داخل نہیں ہوئے

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قریش کی شرط کے مطابق
کہ مکہ میں تین دن رہے۔ اور یہی عمرۃ القضاء میں کعبہ
کے اندر داخل نہیں ہوئے۔ زرقانی کہتے ہیں کہ امام
بخاری کی روایت ہے کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ سے دریافت کیا کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عمرۃ
القضاء کے سال کعبہ میں داخل ہوئے۔ فرمایا: نہیں۔ اور واقدی کی روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم عمرۃ القضاء میں کعبہ کے اندر نہیں گئے۔ آپ نے ان کو پیغام بھیج کر اجازت طلب کی تھی۔
مگر انھوں نے یہ بات کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ آپ کی شرط میں یہ بات داخل نہیں تھی۔

حضرت بلال کا کعبہ کی چھت پر اذان کہنا فتح مکہ کا واقعہ ہے

امام بیہقی نے بطریق واقدی ابن مسیب سے روایت کیا ہے
کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرۃ القضاء میں جب طواف
پورا کیا تو بیت اللہ کے اندر داخل ہوئے۔ پھر وہیں رہے۔ یہاں تک حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے کعبہ پر چڑھ کر تکبیر کی اذان کہی۔ الحدیث۔ اور اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ فتح مکہ
صفوان اور خالد بن اسید (یہ دونوں ابھی اسلام نہیں لائے) نے اس امر پر اللہ کا شکر ادا کیا کہ ان کے باپ مر چکے ہیں اور انہوں
نے اس غلام کو کعبہ کی چھت پر (معاذ اللہ) گدھے کی طرح آواز نکالتے نہیں دیکھا۔ مگر یہ روایت وہم ہے۔
چنانچہ ابو نعیم۔ ابن ابی شیبہ۔ ابن ہشام اور بیہقی نے دوسری سند سے اور دیگر حضرات نے متعدد طرق
سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ شریف میں داخل ہوا اور حضرت بلالؓ کا اس کی چھت
پر اذان کہنا فتح مکہ کا واقعہ ہے۔ اور بعض نے تصریح کی ہے کہ یہی مشہور ہے۔ اور واقدی بھی روایت میں منفرد ہو
تو بھی قابل اعتبار نہیں چہ جائیکہ وہ دوسروں کے خلاف روایت نقل کرے۔ بالخصوص صحیح بخاری کی روایت
کے خلاف ہو۔ اھ

اور حافظ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں کہا ہے کہ بیہقی نے بطریق واقدی اسی طرح ذکر کیا ہے کہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کا بیت اللہ میں داخل ہونا عمرۃ القضا کا واقعہ ہے۔ مگر مشہور یہ ہے کہ یہ فتح مکہ کے سال ہوا۔
واللہ اعلم۔ اھ اور حجۃ الوداع میں لکھا ہے کہ عمرۃ القضاء میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کعبہ میں
داخل ہونا ثابت نہیں ہے۔ اور صحیح بخاری میں عبد اللہ بن ابی اوفیٰ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم نے عمرہ کیا پس بیت اللہ کا طواف کیا۔ اور مقام ابراہیم علیہ السلام کے پیچھے دو رکعتیں پڑھیں اور
آپ کے ساتھ وہ لوگ تھے جو آپ کو لوگوں سے (یعنی مشرکین سے) بچانے کے لیے پردہ کر رہے تھے۔ پس ایک شخص نے ان
سے یعنی عبد اللہ بن ابی اوفیٰ سے کہا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ میں داخل ہوئے تھے؟ فرمایا: نہیں۔ اھ اور
شیخ عبد الحق فرماتے ہیں: یہ عمرۃ القضا کا واقعہ ہے اور اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت اللہ
کے اندر نماز نہیں پڑھی۔ کیونکہ اس کے اندر جو تصاویر اور بت تھیں ان کے ہٹانے اور مٹانے کی قدرت
نہ تھی۔ اور ان کی موجودگی میں داخل ہونا جائز نہ تھا۔ اور اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ مقامات متبرکہ میں
جب کسی طرح کا کفر و شرک ہوتا ہو تو ان کی زیارت کو ترک کر دینا چاہیے۔ اھ اور اس کے حاشیہ میں ہے کہ
شیخ کا یہ ارشاد کہ یہ عمرۃ القضا کا قصہ ہے صحیح واقعہ ہے، نووی کہتے ہیں کہ علماء نے کہا ہے کہ آنحضرت
کے ترک دخول کا سبب یہ تھا کہ بیت اللہ میں اصنام و تصاویر تھیں اور مشرکین آپ کو ان کی تغییر کی اجازت
نہیں دیتے تھے، پھر فتح مکہ کے موقع پر آپ نے تصاویر کو مٹانے کا حکم فرمایا بعد ازاں بیت اللہ کے
اندر تشریف لے گئے۔ جیسا کہ بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے۔ پس جب یہ تقادیر

ہوا۔ اور خمیس میں ہے کہ جب چوتھے دن ظہر کا وقت ہوا تو سہیل بن عمرو اور حویطب بن عبد العزیٰ آپ
کے پاس آئے اور کہا: آپ کی مدت ختم ہو چکی ہے۔ لہٰذا یہاں سے تشریف لے جایئے۔ اور ایک روایت
میں ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ اپنے صاحب سے کہیے کہ ہمارے یہاں
سے نکل جائیں۔ کیونکہ مدت ختم ہو چکی ـــ اس کے بعد صاحب خمیس کہتے ہیں: پس جب رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے چوتھے دن کی صبح کی تو سہیل بن عمرو اور حویطب بن عبد العزیٰ آپ کے پاس آئے یہ ان کا
بیان گذشتہ بیان کے خلاف ہے کہ وہ چوتھے دن کی ظہر کے وقت آئے تھے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
انصار کی مجلس میں حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے گفتگو فرما رہے تھے۔ پس حویطب نے چیخ کر کہا:
ہم آپ کو اللہ تعالیٰ اور معاہدہ (صلح) کا واسطہ دے کر کہتے ہیں کہ آپ ہماری سرزمین سے نکل جائیں۔ کیونکہ تین
دن گزر چکے ہیں: پس سعد نے کہا: تو غلط کہتا ہے۔ تیری ماں نہ رہے۔ یہ تیری زمین ہے نہ تیرے باپ کی
واللہ! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صرف اپنی خوشی سے جائیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکراتے
ہوئے فرمایا: اے سعد! ان لوگوں کو جو ہمارے ڈیرے میں ہماری ملاقات کو آئے ہیں دکھ مت دو۔
نقل کئے ہیں کہ یہ بات کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تین دن رہے۔ اس روایت کے منافی
نہیں جو اوپر درج کی گئی ہے کہ جب چوتھے دن ظہر کا وقت ہوا تو سہیل آپ کے پاس آیا۔ الخ چنانچہ
حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ میں تشریف آوری دن کے نصف اول میں
ہوئی ہوگی۔ اور کوچ کا وقت ظہر کا ہو کر چوتھے دن اسی وقت تین دن پورے ہوئے۔ جس وقت کہ آپ مکہ
میں داخل ہوئے تھے۔ اور سہیل اور حویطب قریباً اسی وقت آئے کہ آپ سے مستدعی ہوئے کہ آپ
تشریف لے جائیں۔ اھ

آنحضرت کا مکہ میں نکاح اور ولیمہ کا ارادہ کرنا اور اہل مکہ کا انکار کرنا

زرقانی کہتے ہیں کہ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ قریش نے حویطب کو آپ کے مکہ سے نکالنے پر مامور کیا تھا۔ چنانچہ اس نے کہا: یہاں سے نکل جاؤ۔ آپ نے فرمایا: تمہارا کیا حرج
ہے اگر تم مجھے رہنے کی اجازت دو تاکہ میں تمہارے یہاں رہ کر رخصتی کی رسم انجام دوں اور ہم کھانا تیار
کریں۔ اس میں تم لوگ بھی شرکت کرو۔ انہوں نے کہا ہمیں آپ کے کھانے کی حاجت نہیں۔ پس یہاں
سے چلے جایئے۔ اور خمیس میں ہے کہ روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عمرے سے فارغ ہو گئے

ان کو میں رہنے والی کوئی نہیں ہی۔ ان کی غرض واضح ہو گئی تھی۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمانؓ کو (کفار) کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ اگر تم چاہو تو تمہارے پاس تین دن اور رہوں اور اپنی اہلیہ سے زفاف کروں۔ اور تمہیں ولیمہ کھلاؤں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ سے پہلے حضرت میمونہؓ سے نکاح کیا تھا اور ابھی رخصتی نہیں ہوئی تھی۔ مگر انہوں نے کہا: ہمیں آپ کے ولیمہ کی ضرورت نہیں اس یہاں سے نکل جائیے۔ اس روایت سے ان لوگوں کی تائید ہوتی ہے جو کہتے ہیں کہ آپ نے احرام کی حالت میں حضرت میمونہؓ سے نکاح کیا تھا۔ اور حافظ ابن قیمؒ اور قاضی موسیٰ بن عقبہ کے الفاظ ابن کثیرؒ کی نقل کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حویطب کے مطالبہ کا ذکر کرنے کے بعد یہ ہیں: پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حویطب اور سہیل کو آواز دے کر فرمایا: میں نے تمہارے یہاں کی ایک خاتون سے نکاح کیا ہے۔ اب اس میں تمہارا کیا نقصان ہے کہ میں کچھ وقت مزید ٹھہروں یہاں تک کہ اس سے زفاف کروں۔ اور ہم کھانا تیار کریں گے تو ہم بھی ہمارے ساتھ مل کر کھاؤ گے۔ پس انہوں نے کہا: ہم آپ کو اللہ تعالیٰ اور معاہدہ کا واسطہ دے کر کہتے ہیں کہ آپ فوراً نکل جائیں۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو رافعؓ کو حکم دیا اور انہوں نے ابطح سے کوچ کا اعلان کر دیا کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی مکان میں نہیں ٹھہرے تھے۔

آپ کا قیام ابطح میں رہا

زرقانی کہتے ہیں: واقدی کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی مکان میں نہیں ٹھہرے تھے بلکہ ابطح میں آپ کے لئے چمڑے کا خیمہ نصب کر دیا گیا تھا۔ آپ مکہ سے واپسی تک اسی میں رہے۔ اور یہ کہ کسی مکان کی چھت کے نیچے نہیں گئے اور طبقات میں کوچ کے اعلان کے بعد یہ ذکر کیا ہے کہ شام تک کوئی مسلمان یہاں نہ رہنے پائے۔

مکہ سے واپسی اور حضرت حمزہؓ کی صاحبزادی کا قصہ:

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس روانہ ہوئے تو حضرت حمزہؓ کی صاحبزادی آپ کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ زرقانی نے اس بچی کے نام میں سات قول نقل کر کے حافظؒ کے حوالہ سے کہا ہے کہ اس کا مشہور نام امامہ ہے۔ زرقانی نے حافظؒ سے اسی طرح نقل کیا ہے لیکن فتح الباری کے جو نسخے ہمارے پاس ہیں ان میں یہ ہے کہ حمزہؓ کی صاحبزادی کا نام عمارہ یا فاطمہ یا امامہ یا امۃ اللہ یا سلمیٰ ہے اور اول ہی مشہور ہے۔ یہ بچی آپ کو چچا چچا کہہ کر پکار رہی تھی۔ حافظؒ کہتے ہیں کہ گویا اس نے تعظیم کی بنا پر آپ کو چچا کہا ہوگا ورنہ آپ اس کے چچازاد بھائی ہوتے ہیں۔ پس حضرت علیؓ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کو اٹھا لیا۔ شیخ زرقانی میں

فرماتے ہیں کہ اس روایت کا بیان کہ حضرت علیؓ نے اس کو لے لیا، اس حدیث کے خلاف ہے جو پہلے گزر چکی ہے یعنی ابوداؤد میں کہ حضرت زید بن حارثہؓ مکہ گئے اور حضرت حمزہؓ کی صاحبزادی کو لائے۔ الخ

دونوں روایتوں میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ سب سے پہلے زید بن حارثہ لائے تھے اور اس کی دلیل وہ روایت ہے جو حافظ نے مغازی سلیمان تیمی سے نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے اہل خانہ کی طرف واپس آئے تو حضرت حمزہؓ کی صاحبزادی کو پایا اس سے روایت کیا گیا ہے کہ آپ کے اہل بیت سے ایک شخص بھیجا ہے۔ پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام لاویہ میں ختم ہوا تو لوگوں میں گھومنے لگی اور آپ پر نظر پڑی تو یا عم یا عم کہتی ہوئی آپ کے پیچھے چل پڑی، پس حضرت علیؓ نے اس کو اٹھایا اور حضرت فاطمہؓ کے ہودج میں سوار کر دیا۔ اس میں تائید حافظ کے قول سے ہوتی ہے وہ کہتے ہیں کہ ابن سعد کی روایت میں جو شعبی سے مروی ہے اس اختصار کرنے والوں نے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حضرت علیؓ نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے حضرت فاطمہؓ کے سپرد کر دیا۔ یہ اختصار ہے۔ اور حضرت فاطمہ سے فرمایا کہ اپنی چچا زاد بہن کو لے لو۔ اور حاکم کی روایت میں ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ سے فرمایا جب کہ وہ اپنے ہودج میں سوار تھیں اس کو اپنے پاس رکھ لو۔ چنانچہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اسے اپنے ساتھ سوار کر لیا۔

اس بچی کی کفالت میں تنازعہ

پھر حضرت علی، حضرت زید، حضرت جعفر رضی اللہ عنہم کا اس کی کفالت میں جھگڑا ہوا، اور یہ تنازعہ مدینہ آنے کے بعد ہوا تھا، جیسا کہ مسند احمد اور حاکم میں حضرت علیؓ کی حدیث سے واضح ہے۔ اور مغازی ابو الاسود میں عروہ سے مروی ہے کہ جب مدینہ کے قریب پہنچے تو یہ تنازعہ اس کے بارے میں آپس میں بات کی اور زیدؓ حضرت حمزہؓ کے وصی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم کردہ مواخات کی رو سے ان کے بھائی تھے۔ یہ روایت اس امر کے منافی نہیں کہ منازعت مدینہ میں ہوئی ہو۔ غالباً حضرت زیدؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سلسلہ میں درخواست کی ہوگی، اور منازعت بعد میں ہوئی ہوگی۔ (کذا فی الزرقانی)

شیخ جزریؒ فرماتے ہیں کہ کل خصومت میں اختلاف ہے۔ واقدی نے تصریح کی ہے کہ ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت علی، حضرت جعفر اور حضرت زیدؓ کی نزاعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مر الظہران پہنچنے کے بعد ہوئی۔ بعض اہل علم نے کہا ہے کہ اس سلسلہ میں ان کی خصومت مدینہ آنے کے بعد ہوئی ہے۔ مسند احمد و حاکم میں حضرت علیؓ کی روایت سے ہے۔ اور مغازی ابو الاسود میں ہے کہ آپ یہاں روایت گزشتہ بالا عبارت

پس حضرت میمونہ سے سرف میں زفاف کیا اور عجیب یہ ہے کہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا ازواج میں آخری تھیں اور
ہیں جو حریم نبوت میں آئیں اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ امہات المومنین میں سب سے آخر میں ان کا انتقال
ہوا۔ مگر ان کے سن وفات میں چند اقوال ہیں۔ زرقانی لکھتے ہیں: بعض کہتے ہیں کہ ۵۱ھ میں ان کی وفات ہوئی ہے اور حافظ
نے لکھا ہے کہ سن وفات میں بہت سا اختلاف ذکر کیا ہے۔ اور بعد خود اس طرف مائل ہیں کہ ان کی وفات
کے بعد حضرت عائشہ زندہ رہیں۔ اور عجیب یہ ہے کہ یہ بیمار ہوئیں تو فرمایا کہ مجھے مکہ سے لے چلو کیونکہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بتلایا تھا کہ میں یہاں یعنی مکہ میں نہ مروں گی چنانچہ ان کو مکہ سے اٹھا لائے جب موضع سرف پہنچے
تو اس درخت کے نیچے جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی شب زفاف میں خیمہ نصب کرایا تھا ان کو
رکھ دیا۔ اسی جگہ ان کا وصال ہوا اور اسی جگہ ان کی قبر ہے۔ اور حافظ ابن قیم لکھتے ہیں: پھر آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم موضع سرف سے رات کے آخری حصہ میں روانہ ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے یہاں تک کہ مدینہ منورہ زادہا اللہ
شرفاً وکرماً پہنچے۔ وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلی آلہ وصحبہ وبارک وسلم تسلیما کثیرا کثیرا۔

چوتھی فصل عمرہ جعرانہ میں

جعرانہ کا ضبط حرکات اور محل وقوع | "جعرانہ" بکسر جیم و سکون عین بعدہ تخفیف راء اور بکسر عین و تشدید راء ہے اور اکثر میں اس کی حرکات کے ضبط پر مفصل لکھا ہے۔ اور اسی میں ہے کہ یاقوت حموی لکھتے ہیں کہ جیم کے کسرہ پر تو اجماع ہے مگر اصحاب حدیث اس کی عین پر کسرہ اور راء پر تشدید پڑھتے ہیں یہ مکہ اور طائف کے درمیان ایک کنواں ہے جو مکہ سے قریب تر ہے یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد اور کچھ کنوئیں قریب قریب ہیں۔ اور یہ مکہ سے ایک برید کے فاصلہ پر عراق کے راستہ میں واقع ہے" اور باجی کہتے ہیں کہ اس کے اور مکہ کے مابین اٹھارہ میل کا فاصلہ ہے۔

فتح مکہ کیلئے روانگی کا سبب | عمرۂ حدیبیہ کے بیان میں گزر چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کفار قریش نے اس شرط پر صلح کی تھی کہ دونوں فریقوں کے مابین دس سال تک لڑائی موقوف رہیگی۔ مگر قریش اپنی شرط پر قائم نہیں رہے کیونکہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلفاء بنو خزاعہ کے مقابلہ میں بنو نفاثہ کی خفیہ مدد کی۔ اس کے جواب میں بنو خزاعہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مدد کی درخواست کی اور یہ صلح حدیبیہ کے ٹھیک بائیس مہینے بعد شعبان ۸ھ کا واقعہ ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دس ہزار کی جمعیت کے ساتھ دس رمضان کو مدینہ سے روانہ ہوئے اور ۲۰ رمضان کو مکہ فتح ہوا۔ پس آپ وہاں پندرہ راتیں یا اس سے زیادہ مقیم رہے اور اس مدت میں مختلف اطراف کی جانب چھوٹے چھوٹے دستے (سرایا) بھیجتے رہے۔

غزوۂ حنین کے لیے روانگی | بعد ازاں شوال کی چھٹی تاریخ کو اہل مدینہ کا بارہ ہزار کا لشکر لے کر حنین کی طرف روانہ ہوئے مسلمانوں کو پہلے تو خود پسندی اور اپنی کثرت پر ناز کرنے کی وجہ سے ظاہری شکست کا ابتلاء پیش آیا۔ مگر اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے انہیں غلبہ نصیب ہوا چھ ہزار قیدی، چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار سے زیادہ بھیڑ بکریاں اور چار ہزار اوقیہ چاندی غنیمت میں ہاتھ آئی، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طائف تشریف لے گئے۔ اور اٹھارہ دن تک ان کا محاصرہ کئے رکھا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جعرانہ کی جانب مراجعت فرما ہوئے۔ کذا فی الجمع

جعرانہ میں مال غنیمت کی تقسیم اور تخمیس میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وحنا جبر قرن المنازل پھر نخلہ سے گزرتے ہوئے واپس لوٹے یہاں تک کہ جعرانہ آ نکلے۔" اور اسی کتاب میں ہے: "پس پانچ ذی قعدہ کو جعرانہ آ پہنچے۔ وہاں تیرہ دن قیام ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طائف جاتے ہوئے حکم فرما گئے تھے کہ جنگ حنین میں حاصل شدہ قیدیوں اور مال غنیمت کو جمع کیا جائے چنانچہ یہ ساری چیزیں جعرانہ میں جمع کر دی گئی تھیں۔" اور اسی جگہ مال غنیمت تقسیم فرمایا۔ چنانچہ امام بخاری نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جعرانہ سے عمرہ کیا، جہاں آپ نے حنین کا مال غنیمت تقسیم فرمایا تھا۔"

وفد ہوازن کی آمد اور آئمہ کی کتاب ذہبیہ کے حاشیہ میں ہے کہ حافظ لکھتے ہیں کہ موسیٰ بن عقبہ کی مغازی میں یہ قصہ پوری تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: "پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شوال میں طائف سے جعرانہ واپس ہوئے اور یہاں بنو ہوازن کے قیدی جمع تھے۔ ہوازن کا وفد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بغرض اسلام حاضر ہوا۔ چنانچہ یہ لوگ اسلام اور بیعت سے مشرف ہوئے پھر آپ سے اپنے قیدیوں کی رہائی کے سلسلہ میں گفتگو کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تمہارے قیدی سب تقسیم کئے جا چکے ہیں۔ لیکن میں تمہاری خاطر ان کی واپسی کا مطالبہ کروں گا۔ مگر دو قسم کی چیزوں میں سے کس کی واپسی تمہیں زیادہ محبوب ہے۔ قیدیوں کی یا مال کی؟ (یعنی ایک چیز واپس کی جا سکتی ہے)۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ نے ہمیں مال اور حسب میں سے ایک چیز کا اختیار دیا ہے۔ حسب ہمیں زیادہ محبوب ہے۔ (یعنی مال کے بجائے قیدی واپس کئے جائیں)۔ فرمایا: بنی ہاشم کے حصے کے قیدی تو تمہارے ہیں اور دوسرے مسلمانوں سے تمہاری خاطر گفتگو کروں گا۔"

یہاں پورا قصہ تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے اور اس کے آخر میں ہے ——— "پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں نے تمہارے انتظار میں قیدیوں کی تقسیم میں تاخیر کی تھی مگر تم لوگ آنے میں تاخیر کی۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قیدیوں کو تقسیم کئے بغیر چھوڑ کر طائف تشریف لے گئے تھے۔ کئی دن طائف کا محاصرہ رہا، پھر وہاں سے جعرانہ واپس ہوئے، پھر وہاں اموال غنیمت تقسیم کئے۔ اس کے بعد ہوازن کا وفد آیا۔"

زرقانی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دس دن سے زائد تک جعرانہ میں وفد ہوازن کا انتظار

فرماتے ہیں کہ وہ مسلمان ہو کر آئیں گے جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے۔ اور جعرانہ وہ جگہ ہے جہاں طائف اور مکہ سے مدینہ جانے کے دونوں راستے جمع ہو جاتے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جعرانہ میں حنین کے اموال غنیمت تقسیم فرمائے تھے۔

زرقانی کہتے ہیں کہ اہل مغازی نے کہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تیرہ دن بعد حکم فرمایا کہ لوگوں کو جمع کیا جائے اور مال غنیمت لیا جائے۔ پھر آپ نے لوگوں میں مال غنیمت تقسیم کیا، چنانچہ ہر شخص کا حصہ چار اونٹ اور چالیس بکریاں نکلا، پھر آپ نے وہاں سے عمرہ کیا۔" اور صاحب خمیس کہتے ہیں: "پھر آپ جعرانہ سے عمرہ کے لیے نکلے، اور باقی ماندہ "سبی" کے بارے میں حکم فرمایا کہ اسے مر الظہران کی جانب مجنہ نامی جگہ پر رکھا جائے۔" پھر عمرہ سے فراغت کا ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں: "پھر واپس مدینہ کی طرف روانگی ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باقی ماندہ "سبی" کو ساتھ لیا۔" اور اس بات کو ابن ہشام نے ابن اسحاق سے بھی نقل کیا ہے۔

عمرہ جعرانہ کا احرام باندھنا اور امام ابو داؤد نے محرش کعبی سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جعرانہ میں داخل ہوئے، پس وہاں مسجد تک اس کی طرف آئے۔ پس جتنی رکعتیں اللہ کو منظور تھیں ادا کیں۔ پھر عمرہ کا احرام باندھا۔ واقدی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ کا احرام باندھا تھا جب کہ ذیقعدہ کی بارہ راتیں باقی تھیں۔ کذا فی التلخیص۔ اور ابن قیم کہتے ہیں: "عمرہ جعرانہ اول ذی قعدہ میں ہوا۔" عینی کہتے ہیں: "تیسرا عمرہ، عمرہ جعرانہ ہے، اور یہ بھی ذیقعدہ میں ہوا۔ یہ عروہ بن زبیر اور موسیٰ بن عقبہ وغیرہ کا قول ہے اور واقعہ بھی یہی ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں حضرت انس سے مروی ہے۔ ابن حبان نے اپنی صحیح میں کہا ہے کہ عمرہ جعرانہ شوال میں ہوا۔ محب طبری کہتے ہیں کہ جہاں تک مجھے علم ہے یہ بات ابن حبان کے سوا کسی نے نہیں کہی اور مشہور یہ ہے کہ ذی قعدہ میں ہوا ہے۔ کذا فی الاوجز۔

عمرہ شوال کا مصداق اور اوجز ہی میں ایک جگہ شوال کے عمرہ پر مفصل بحث کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ابن قیم کہتے ہیں: "اگر یہ بات محفوظ ہو تو غالباً یہ عمرہ جعرانہ کا واقعہ ہے، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شوال میں نکلے تھے اور احرام ذیقعدہ میں باندھا تھا۔" اور ابن ہمام نے فتح میں اور قسطلانی نے شرح بخاری میں بھی اسی پر جزم کیا ہے۔ چنانچہ وہ دونوں کہتے ہیں: "اس میں اختلاف نہیں

کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ کے عمرے چار سے زائد نہیں تھے۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ان کی تعیین کر دی ہے اور ان کو شمار کر کے بتا دیا ہے۔ ان میں بجز ذی قعدہ کے کسی عمرے کا ذکر نہیں بجز اس عمرے کے جو آپ نے حج کے ساتھ کیا تھا۔ پس جہاں تطبیق ممکن ہو تعارض دور کرنے کے لیے تطبیق دینا ضروری ہے، اور جہاں تطبیق ممکن نہ ہو وہاں ارجح و اثبت کے مقتضی پر حکم کیا جاتا ہے۔ اور یہاں عمرہ جعرانہ مراد لیکر تطبیق ممکن ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حنین کی طرف شوال میں نکلے تھے اور عمرہ کا احرام ذیقعدہ میں باندھا تھا۔ لہذا قرب کی وجہ مجازاً شوال کا مہینہ کہلایا۔ اور اس تطبیق کی ضرورت جب ہے جبکہ شوال کا عمرہ صحیح اور محفوظ روایت سے مروی ہو۔ ورنہ جو ثابت ہے وہی قابل اعتماد ہے۔"

اوجز میں اس پر تفصیل سے لکھا ہے کہ محققین کے نزدیک عمرۂ شوال کا محمل عمرۂ جعرانہ ہے۔ اور اوجز میں یہ بھی ہے کہ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جعرانہ سے یہ احرام باندھنا متعدد وجوہ کے لیے محتمل ہے۔ ایک یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ کو ہی مقصد بنا کر اس کا ارادہ کیا ہو کیونکہ آپ اس وقت ان علاقوں سے مدینہ منورہ کی طرف مراجعت کرنے والے تھے، اس لئے ارادہ فرمایا کہ اس وقت آپ کا آخری عمل عمرہ ہو۔ اس صورت میں آپ کے اس فعل میں اس امر کی دلیل ہے کہ جو شخص داخل میقات ہو اور وہ حج یا عمرہ کا ارادہ کرے تو اس کے احرام باندھنے کی جگہ وہی مقام ہے جہاں وہ موجود ہو، چنانچہ حدیث میں ہے کہ جو شخص میقات کے اندر ہو۔ پس وہ جہاں سے حج یا عمرہ کا قصد کرے وہی جگہ اس کے لیے میقات ہے۔"

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ چونکہ یہ مدینہ کی طرف واپسی کا وقت تھا اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے بعد اہل مکہ کے حالات معلوم کرنا چاہتے تھے۔ اس صورت میں آپ احرام کے بغیر بھی مکہ میں داخل ہو سکتے تھے۔ لیکن عمرہ کی فضیلت حاصل کرنے کے لیے احرام باندھا اور خود عمرہ مقصود نہیں تھا۔ ان کے علاوہ اور وجوہ بھی محتمل ہیں۔

پس رات کو مکہ میں داخل ہوئے اور راتوں رات طواف اور سعی کی اور مروہ کے پاس عمرہ کا احرام کھولا۔ صاحب خمیس کہتے ہیں کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف کیا اور سعی کی اور اپنے سر کا حلق کرایا۔ حلق کرنے والے کا نام ابو ہند ہے۔"

حضرت معاویہؓ کی حدیث کا مصداق اور شارحینِ حدیث کے یہاں معروف یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کی یہ حدیث کہ "میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سر کا قصر کیا مروہ کے پاس تیر کے پیکان کے ساتھ" اس کا محل عمرۂ جعرانہ ہے۔ جیسا کہ جزء حجۃ الوداع میں گزر چکا۔ اور بخاری کے حاشیہ میں ہے کہ نوویؒ کہتے ہیں: "اور یہ حدیث اس پر محمول ہے کہ انہوں نے (یعنی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے) عمرۂ جعرانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قصر کیا تھا۔ کیونکہ حجۃ الوداع میں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قِران تھا اور یہ ثابت ہے کہ منیٰ میں آپ نے حلق کرایا۔ اور عمرۃ القضاء پر محمول کرنا اس بنا پر صحیح نہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے۔ وہ فتح مکہ میں مسلمان ہوئے یہی مشہور ہے" الخ۔

راتوں رات جعرانہ واپس آنا پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رات ہی کو جعرانہ واپس آگئے جیسا کہ جعرانہ میں اسی طرح صبح کی گویا رات یہیں رہے تھے۔ تمام روایات میں یہی روایت ہے۔ اس کے برعکس ابوداؤد میں جو آیا ہے کہ "آپ نے مکہ میں صبح کی گویا رات یہیں رہے تھے" یہ وہم ہے جیسا کہ شیخ نے بذل میں کہا ہے۔ صحیح وہ ہے جو ترمذی، نسائی اور احمد وغیرہ کی روایت میں ہے کہ "پس جعرانہ میں صبح کی مثل رات یہاں رہنے والے کے"۔

جعرانہ سے مدینہ کی طرف واپسی پس جب اگلے دن زوال آفتاب ہوا، بظاہر بدھ کا دن مراد ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بدھ کی رات احرام باندھا تھا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ تو اپنی اونٹنی پر سوار ہوئے اور بطن سرف کا رخ کیا۔ یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے راستے تک جا پہنچے۔ یا یہ مراد ہے کہ وہ راستہ جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آئے تھے راہِ مدینہ سے آملا۔ اور یہ بطن سرف ہے (جو جامع الطریق کہلاتا ہے) کیونکہ مکہ اور جعرانہ سے جو راستے مدینہ جاتے ہیں وہ دونوں یہاں جمع ہو جاتے ہیں۔

جامع الطریق طریق المدینۃ کی بحث میں کہتا ہوں کہ اس لفظ میں روایات کا اختلاف ہے۔ یہاں جو لفظ ذکر کیا گیا یہ ابوداؤد کا لفظ ہے۔ اور یہ زیادہ واضح ہے اور نسائی اور مسند احمد وغیرہ کا لفظ یہ ہے: "حتیٰ جامع الطریق طریق المدینۃ" (یہاں تک کہ جمع ہو گیا راستہ راہِ مدینہ کے ساتھ) یعنی جس راستے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جعرانہ سے تشریف لا رہے تھے وہ مدینہ کے راستہ کے ساتھ جمع ہو

گویا اس روایت میں الطریق کا لفظ فاعل اور طریق مدینہ کا لفظ مفعول ہے اور ترمذی کے الفاظ یہ ہیں:
"خرج في بطن سرف حتى جاء مع الطريق طريق جمع ببطن سرف" یعنی آپ نکلے بطن سرف
میں، یہاں تک کہ اس راستہ کے ساتھ وہ راستہ آملا جس نے بطن سرف میں (حرمین کے راستہ کو) جمع
کر رکھا تھا۔)

اور شیخ کوکب میں فرماتے ہیں: "سرف ایک وسیع و عریض جگہ ہے جس میں مکہ اور جعرانہ سے مدینہ کو
جانے والے دونوں راستے جمع ہو جاتے ہیں۔ اسی بنا پر راوی نے یہ کہا: "یہاں تک آملا اس راستے کے
ساتھ" اور اس راستے سے مراد جعرانہ کا راستہ ہے جس سے آنحضرت تشریف لا رہے تھے، اور لفظ
طریق جادہ کا فاعل ہے۔ اور جمع ببطن سرف اس کی صفت ہے اور جمع کا مفعول شاید محذوف ہے
یعنی طریق الحرمین (یعنی جس نے جمع کیا تھا بطن سرف میں حرمین کے راستہ کو) پس دریافت کیا جائے؟
اور اس کا نقشہ جو میں نے [illegible] میں کوکب کے حاشیہ میں دیا تھا حسب ذیل ہے۔
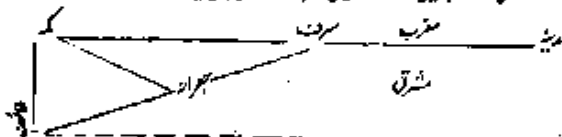
مکہ
سرف
مغرب
مدینہ
جعرانہ
مشرق

عتاب بن اسید کو گورنر بنا کر مدینہ واپس آنا

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ شریف سے
آگئے اور آنے سے پہلے حضرت عتاب بن اسید کو مکہ کا گورنر مقرر کیا اور ان کے ساتھ معاذ بن جبل کو
اور واقدی اور حاکم نے ابو موسیٰ کے نام کا بھی اضافہ کیا ہے کہ یہ دونوں لوگوں کو قرآن اور فقہ فی الدین
کی تعلیم دیں۔ ابن ہشام کہتے ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عتاب کو مکہ کا حاکم مقرر کیا تو
یومیہ ایک درہم ان کا وظیفہ مقرر کیا۔ انہوں نے خطبہ دیا جس میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کا پیٹ
ہمیشہ بھوکا رکھے جو ایک درہم کے باوجود بھوکا رہتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے لئے
ایک درہم یومیہ کا وظیفہ مقرر فرمایا ہے۔ اب مجھے کسی کی حاجت نہیں۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
دو مہینے سولہ دن مدینے سے باہر رہنے کے بعد اس وقت مدینہ میں تشریف لائے جب کہ ذیقعدہ کی
تین راتیں باقی تھیں۔ اور ابن ہشام نے کہا کہ چھ راتیں باقی تھیں اور حافظ فتح میں فرماتے ہیں کہ غیبوبت
کی مدت اسّی دن سے زیادہ تھی۔ واللہ اعلم۔ کذا فی الزرقانی۔

حضرت ابن عمرؓ کا عمرۂ جعرانہ سے انکار | اور یہاں اس امر پر تنبیہ ضروری ہے کہ یہ عمرۂ جعرانہ اصحابِ
مغازی و سیر مثلاً عروہ بن الزبیر، موسیٰ بن عقبہ، ابن اسحاق، ابن ہشام، ابن حبان اور واقدی وغیرہ
نے ذکر کیا ہے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے آزاد کردہ غلام حضرت نافعؒ نے اس سے انکار
کیا ہے، چنانچہ امام بخاریؒ نے بطریق ایوب نافع سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے جعرانہ سے عمرہ نہیں کیا اور اگر کیا ہوتا تو عبداللہ (بن عمر رضی اللہ عنہ) پر مخفی نہ رہتا۔ اور امام مسلمؒ
نے اس سند سے نافع کی یہ حدیث نقل کی ہے کہ ابن عمرؓ کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمرۂ جعرانہ
کا ذکر کیا گیا تو انہوں نے فرمایا جعرانہ سے آپؐ نے عمرہ نہیں کیا۔" ان دونوں بزرگوں نے جس چیز کی نفی
کی ہے دوسرے حضرات نے اس کا اثبات کیا ہے اور اثبات نفی سے مقدم ہے۔ نوویؒ لکھتے ہیں "یہ ان کے
علم کی نفی پر محمول ہے۔ یعنی ان کو اس کا علم نہیں، اور یہ بات ثابت شدہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ
وسلم نے جعرانہ سے عمرہ کیا تھا اور اثبات نفی سے مقدم ہے کہ اس میں زیادتِ علم ہے، اور امام مسلمؒ
نے کتاب الحج میں حج کے سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جعرانہ سے عمرہ کرنا حضرت انس رضی اللہ
تعالیٰ عنہ کی روایت سے ذکر کیا ہے۔"

عمرۂ جعرانہ کی احادیث کی تخریج | میں کہتا ہوں کہ حضرت انسؓ کی حدیث امام احمدؒ، شیخینؒ،
ابوداؤد اور ترمذیؒ نے روایت کی ہے۔ اور عمرۂ جعرانہ حضرت ابن عباسؓ کی حدیث میں بھی آیا ہے جس
کو ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ اور ترمذی نے اس کی تحسین کی ہے۔ نیز حضرت
جابرؓ سے بھی ثابت ہے جس کو بزار اور طبرانی نے اوسط میں روایت کیا ہے اور ہیثمیؒ نے کہا ہے کہ
اس کے تمام راوی صحیح کے راوی ہیں۔ نیز حدیث محرش کعبیؓ سے ثابت ہے جس کو امام احمد، حمیدی،
ابوداؤد، ترمذی اور نسائیؒ نے روایت کیا ہے۔ نیز حدیث خالد بن عبدالعزیز بن سلامہ الخزاعی
سے ثابت ہے اس کو حسن بن سفیان اور نسائیؒ نے "الکنیٰ" میں روایت کیا ہے جیسا کہ اصابہ وغیرہ میں
ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں "ان دو بزرگوں (ابن عمرؓ، نافعؒ) کے علاوہ تمام اہلِ نقل اصحابِ صحاح
اصحابِ سنن اور اصحابِ مسانید اس کی روایت پر متفق ہیں اور اس کو تمام اصحابِ مغازی و سیر
نے ذکر کیا ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ غالباً یہی وہ ہے جو محرش کعبیؓ کی حدیث میں مسند احمد اور جامع ترمذی میں مذکور

شب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رات کی تاریکی میں عمرہ کے لیے تشریف لے گئے تھے، رات ہی کو مکہ گئے اور راتوں رات عمرہ کر کے واپس جعرانہ پہنچ گئے۔ اور وہاں اس طرح صبح کی گویا رات وہیں رہے تھے" الخ۔ اسی روایت میں ہے کہ "اسی وجہ سے آپ کا یہ عمرہ لوگوں سے مخفی رہا" اور امام احمد کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ محرش فرماتے ہیں "پس اسی وجہ سے آپ کا یہ عمرہ بہت سے لوگوں سے مخفی رہا" یعنی کہتے ہیں "نافع کا قول حجت نہیں کیونکہ ابن عمرؓ کو جتنی احادیث معلوم تھیں وہ ساری انھوں نے نافع سے بیان نہیں کر دی تھیں، نیز ضروری نہیں کہ جتنی انھوں نے بیان کیں وہ سب نافع کو یاد بھی رہی ہوں، نیز ضروری نہیں کہ جتنے امور ابن عمر رضی اللہ عنہ کے علم میں آئے ہوں ان میں سے ایک حدیث بھی ان کے حافظہ سے نہ اتری ہو۔ اور جعرانہ کا عمرہ اس قدر مشہور اور ظاہر ہے کہ شک و شبہ سے بالاتر"

پانچویں فصل متفرقات میں

یعنی عمرہ کے ان باب میں جو متفرق روایات مروی ہیں ان پر بحث اور دیگر مباحث۔

بحث اول عمرۂ رجب میں امام بخاری وغیرہ نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار عمرے کئے ان میں سے ایک رجب میں ہوا اور حضرت عائشہ رضی نے اس پر انکار کرتے ہوئے فرمایا "اللہ تعالیٰ ابو عبدالرحمٰن عبداللہ بن عمرؓ پر رحم فرمائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنے عمرے کئے وہ ان سب میں حاضر تھے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رجب میں کبھی عمرہ نہیں کیا" اور زادالمعاد میں چار عمروں کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے "روایات حدیث میں مزید دو عمروں کا ذکر آتا ہے، ایک عمرۂ رجب جو ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے صحیحین وغیرہ میں مذکور ہے۔ حافظ لکھتے ہیں "ابن عمرؓ نے اس کا ذکر کیا ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ابن عمرؓ پر انکار کیا ہے۔ اور بیہقی کہتے ہیں "ابو حبیب مالکی کہتے ہیں کہ یہ ابن عمرؓ کا وہم ہے کیونکہ اجماع مسلمین ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف تین (مستقل) عمرے کئے اور اسی طرح ابن قیمؒ نے "الہدیٰ" میں لکھا ہے کہ یہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کا وہم ہے۔

بیہقی کہتے ہیں "اگر یہ کہا جائے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کی نفی کی ہے اور حضرت ابن عمرؓ

نے اس کا اثبات کیا ہے۔ اور قاعدہ یہ ہے کہ اثبات نفی پر مقدم ہوتا ہے۔ پس حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے خلاف ابن عمرؓ کے حق میں فیصلہ کیوں نہ کیا گیا۔ میں کہتا ہوں کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ ثابت کرنا کہ رجب میں عمرہ کیا۔ اس کے معارض ایک دوسرا اثبات ہے کہ آپ نے ذی قعدہ میں عمرہ کیا۔ لہٰذا دونوں ایک وقت کی نفی کرتے ہیں اور دوسرے وقت کا اثبات کرتے ہیں۔ پس حضرت عائشہؓ نے اگرچہ رجب میں ہونے کی نفی کی ہے۔ مگر ذیقعدہ میں ہونے کا اثبات کیا ہے۔ نیز یہ حضرت عائشہؓ حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ تینوں متفق ہیں کہ آپ کے عمروں کی تعداد چار سے زائد نہیں اور حضرت عائشہؓ عمرۂ حج کے علاوہ تینوں عمروں کا ذیقعدہ میں ہونا ثابت کرتی ہیں۔ لہٰذا حضرت عائشہؓ کا اثبات مقدم ہے کیونکہ ابن عباسؓ کا اثبات بھی اس کا مؤید ہے اور عمرۂ رجب کے اثبات میں ابن عمرؓ متفرد ہیں۔ مزید برآں یہ کہ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عمرۂ رجب کی نفی کی تو ابن عمر اس پر خاموش رہے۔ اس لیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول کی طرف رجوع ضروری ہوا۔"

اور نووی کہتے ہیں: "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے انکار پر ابن عمر رضی اللہ عنہ کا سکوت اختیار کرنا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ خود انہیں بھی اشتباہ ہو گیا تھا، یا وہ بھول گئے تھے یا انہیں شک ہو گیا تھا" الخ۔ ابن جابر کہتے ہیں: "بعض نے ملا علی قاری کے رسالہ موسومہ "الادب فی رجب" سے نقل کیا ہے کہ رجب میں عمرہ کا مسنون ہونا بایں معنی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کیا یا اس کا حکم فرمایا ہو ثابت نہیں۔ البتہ یہ مروی ہے کہ ابن زبیرؓ جب کعبہ کی تعمیر کی تجدید سے ۲۷ رجب سے قبل فارغ ہوئے تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لیے ایک اونٹ کا نحر کیا۔ اور کئی بکریاں ذبح کیں اور اہل مکہ کو عمرہ ادا کرنے کا حکم فرمایا۔ اور اس میں شک نہیں کہ صحابہ کا فعل حجت ہے اور جس چیز کو (اس قسم کے) مسلمان مستحسن سمجھیں وہ عند اللہ مستحسن ہوتی ہے۔ پس یہ وجہ ہے کہ اہل مکہ ماہ رجب میں خصوصیت سے عمرہ کرتے ہیں۔"

اور شیخ ابن قیمؒ بسط کلام کے بعد فرماتے ہیں: "مقصود یہ ہے کہ طریقہ مشرکین کی مخالفت کرتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام عمرے حج کے مہینوں میں کیے کیونکہ مشرکین حج کے مہینوں میں عمرہ کرنا ناجائز سمجھتے تھے اور اس کو افجر فجور (سب سے بڑی بدکاری) کہتے تھے اور یہ اس امر کی دلیل ہے کہ اشہر حج میں عمرہ کرنا رجب کے عمرہ سے بلاشبہ افضل ہے۔"

بحث دوم ۔ عمرۂ شوال | امام مالکؒ نے مؤطا میں ہشام بن عروہؓ کی سند سے

حضرت عروہؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مستقل طور پر صرف تین عمرے کئے۔ ان
میں سے ایک شوال میں تھا۔ یہ روایت امام محمد نے بھی مؤطا میں نقل کی ہے۔ اور اوجز میں ہے کہ
یہ روایت مؤطا میں مرسل ہے مگر ابوداؤد نے اس کو حضرت عائشہؓ سے موصولاً روایت کیا ہے۔
حافظ کہتے ہیں: اس کو سعید بن منصور نے بسند قوی روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے صرف تین عمرے کئے۔ ان میں ایک شوال میں ہوا۔ لیکن حضرت عائشہؓ کا قول کہ ایک شوال میں ہوا
اس کے معارض دوسروں کا قول یہ ہے کہ ذی قعدہ میں ہوا۔ اور ان دونوں کے درمیان تطبیق
یہ ہو سکتی ہے کہ یہ آخر شوال اور اول ذی قعدہ میں ہوا ہو۔ اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے
جو ابن ماجہ نے بسند صحیح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کی ہے کہ آنحضرت نے کوئی عمرہ نہیں کیا
مگر ذیقعدہ میں۔ ابن قیمؒ کہتے ہیں: "یہ حدیث مرسل ہے اور غلط بھی ہے یہ غلطی یا ہشام کو ہوئی یا عروہؓ
کو۔ اور ابوداؤد نے اس کو مرفوعاً حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے۔ اور وہ بھی غلط ہے اس
کا رفع بھی صحیح نہیں۔" ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ "جو مسند روایات امام مالکؒ سے صحت نقل سے ثابت
ہیں یہ روایت ان میں شامل نہیں۔" اور ابن قیمؒ کہتے ہیں: "اور حضرت عائشہؓ سے اس حدیث کے
باطل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ، حضرت انسؓ، حضرت ابن عباسؓ ان تینوں کا بیان ہے
کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ذی قعدہ کے سوا کبھی عمرہ نہیں کیا۔ اور یہی صحیح ہے۔" پوری
تفصیل اوجز میں ہے۔ اور اس کے آخر میں ہے کہ "اس تمام بحث سے معلوم ہوا کہ جمہور نے عمرۂ شوال
کو عمرۂ جعرانہ پر محمول کیا ہے۔"

اور جعرانہ کے بیان میں گذر چکا ہے کہ بہ تقدیر صحت روایت، محققین کے نزدیک عمرۂ شوال
کا محمل عمرۂ جعرانہ ہے۔ اور اوجز میں ہے کہ "بعض نے عمرۂ شوال کو عمرۂ حدیبیہ پر محمول کیا ہے۔ مگر
یہ مناسب نہیں ہے۔" اور حاشیہ ابوداؤد میں جامع شیخ الاسلام شاہ محمد اسحٰق دہلوی قدس سرہٗ
سے نقل کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ کا یہ ارشاد کہ "ایک عمرہ شوال میں ہوا" یہ عمرۂ جعرانہ کی طرف اشارہ
ہے جو ذی قعدہ میں ہوا۔ مگر چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حنین کی طرف تشریف لے جانا شوال
ہی میں ہوا تھا۔ اور حنین سے واپسی پر اسی سال اسی سفر میں یہ عمرہ ہوا۔ اس لیے اسے شوال کی طرف

منسوب کر دیا اگرچہ ہوا ذی قعدہ میں "

بحث سوم: عمرۂ رمضان | باقی رہا رمضان کا عمرہ، تو اوجز میں عمرۃ القضاء کے بیان میں ہے کہ "ابن حبان نے اپنی صحیح میں ذکر کیا ہے کہ یہ رمضان میں ہوا تھا، محب طبری نے کہا ہے کہ یہ بات ابن حبان کے سوا کسی نے نقل نہیں کی۔ اور مشہور یہ ہے کہ ذیقعدہ میں ہوا" اور زرقانی میں ہے کہ "ابن قیم نے اس امر کا انکار کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی عمرہ رمضان میں بھی کیا تھا۔ البتہ دارقطنی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے کہ "میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رمضان المبارک میں عمرہ کے لیے گئی تھی، پس آپ نے افطار کیا اور میں نے روزہ رکھا اور آپ نے قصر کی اور میں نے پوری نماز پڑھی" دارقطنی نے اس کی سند کو حسن کہا ہے اور ابن قیم نے کہا ہے کہ یہ غلط ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان میں کوئی عمرہ نہیں کیا، یہ بات حافظ نے نقل کی ہے۔ اور مصنف (صاحب مواہب) نے اپنے قول میں ان ہی کی پیروی کی ہے کہ "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول "فی رمضان" "خرجت" سے متعلق ہے (یعنی سفر رمضان میں ہوا تھا) اور اس سے مراد فتح مکہ کا سفر ہے۔ کہ رمضان ہی میں مکہ فتح ہوا تھا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی سال فتح کے بعد جعرانہ سے عمرہ کیا تھا۔ فتح کے بعد غزوۂ حنین اور غزوۂ طائف کے لیے تشریف لے گئے۔ پھر حنین کے غنائم تقسیم فرمائے اور بعد ازاں عمرہ ادا کیا۔ مگر وہ ذی قعدہ میں کیا تھا" اور حافظ نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ "یہ حدیث دارقطنی نے ایک اور سند سے بھی ذکر کی ہے اور اس میں رمضان کا ذکر نہیں " اسی طرح شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے بھی دارقطنی کی اس حدیث کا انکار کرتے ہوئے اس پر مفصل کلام کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ قطعاً غلط ہے، اور اس حدیث کے رد کرنے کے وجوہ مفصل ذکر کئے ہیں۔

البتہ یہاں ایک بات باقی رہ گئی کہ باوجودیکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرۂ رمضان کی فضیلت بیان فرمائی۔ مگر خود رمضان میں عمرہ نہیں کیا۔ چنانچہ اوجز میں ہے کہ حافظ کہتے ہیں: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اشہر حج ہی میں عمرے کئے، اور رمضان میں عمرہ کرنے کی فضیلت حدیث الباب سے ثابت ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان دونوں میں سے افضل کیا ہے؟ جو بات مجھے پہلے ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ دوسروں کے لیے تو رمضان میں

عمرہ کرنا افضل ہے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں وہی افضل تھا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل اس چیز کے جواز کو بیان کرنے کے لیے تھا جس سے اہل جاہلیت منع کیا کرتے تھے۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قول و فعل کے ذریعہ ان کی تردید کا ارادہ فرمایا اور یہ چیز اگر دوسروں کے لیے مکروہ بھی ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں وہی افضل تھی"۔ اور صاحب الہدی کہتے ہیں: "احتمال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں ایسی عبادت میں مشغول رہا کرتے ہوں جو عمرہ سے بھی افضل ہو، نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو امت کی مشقت کا اندیشہ تھا کیونکہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں عمرہ کرتے تو لوگ بہرحال اس کی طرف سبقت کرتے جبکہ انہیں عمرہ اور روزہ جمع کرنے سے مشقت لاحق ہوتی۔ اور بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک عمل کرنا چاہتے تھے، مگر صرف اس بنا پر ترک فرما دیتے کہ کہیں امت پر فرض نہ ہو جائے۔ اور ان کی مشقت کا اندیشہ عمل سے مانع ہو جاتا تھا"۔

شیخ ابن حجر نے بھی اس پر بحث کی ہے اور اس کی کچھ بحث حج الوداع کے آخر میں گزر چکی ہے۔

فوائد

پہلا فائدہ: عمرہ کے لیے حل کی طرف نکلنا جائز ہے یا نہیں؟

حافظ ابن قیم کہتے ہیں: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمرات میں سے کوئی عمرہ ایسا نہیں جو مکہ سے باہر نکل کر کیا گیا ہو۔ جیسا کہ آجکل بہت سے لوگ کرتے ہیں۔ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام عمرات باہر سے مکہ میں داخل ہو کر کیے گئے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نزول وحی کے بعد تیرہ سال مکہ میں رہے مگر کہیں منقول نہیں کہ آپ نے اس مدت میں کبھی مکہ سے باہر جا کر عمرہ کیا ہو۔ لہذا جو عمرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کیا اور جس عمرہ کو مشروع فرمایا وہ صرف ایسا عمرہ ہے جو باہر سے مکہ میں داخل ہونے والا ادا کرے۔ نہ کہ اس شخص کا عمرہ جو مکہ میں مقیم ہو اور عمرہ کرنے کیلئے حل کی طرف نکل جائے۔ اس قسم کا عمرہ آپ کے دور میں کبھی کسی نے نہیں کیا البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام رفقاء میں سے تنہا حضرت عائشہؓ اس سے مستثنیٰ ہیں کہ انہوں نے عمرہ کا احرام باندھا تھا۔ چونکہ ان کو ماہواری کا عذر پیش آ گیا تھا اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے انہوں نے عمرہ کو

حج کا احرام باندھ کر قران کر لیا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو فرمایا تھا کہ ان کا طواف بالبیت اور صفا و مروہ کی سعی اکٹھے حج و عمرہ دونوں کے لیے کافی ہو گی۔ مگر ان کے دل میں یہ کھٹک تھی کہ دیگر امہات المومنین تو مستقل حج اور مستقل عمرہ کر کے واپس جا رہی ہیں کیونکہ ان کا تمتع تھا۔ اور انہیں ماہواری کا عارضہ پیش نہیں آیا تھا۔ مگر انہوں نے قران کیا تھا۔ اور یہ ایسے عمرہ کے ساتھ واپس ہوں گی جو ضمن حج ادا کیا گیا۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی دلجوئی کی خاطر ان کے بھائی کو حکم فرمایا کہ انہیں تنعیم سے عمرہ کرا لائیں۔ اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حج میں تنعیم سے عمرہ نہیں کیا، نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی اور رفیق نے" ___ میں کہتا ہوں، ابن قیمؒ نے تو یہی کہا ہے، اور زرقانیؒ نے ان کا کلام نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: "اس پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب حضرت عائشہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے عمرہ کیا تو یہ اس کی مشروعیت کی دلیل ہے۔ اس کے بعد ابن قیمؒ کا سارا کلام بیکار ہو جاتا ہے۔ اور الفاکہی نے محمد بن سیرین کی سند سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں: ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ کے لیے تنعیم کو میقات مقرر فرمایا ہے" اور حضرت عطاء سے نقل کیا ہے کہ "جو شخص عمرہ کرنا چاہتا ہو خواہ وہ اہل مکہ سے ہو یا ان کے علاوہ، اسے چاہیے کہ تنعیم یا جعرانہ کی طرف نکل جائے اور وہاں سے احرام باندھ کر آئے" اور موطا میں ہے کہ امام مالکؒ سے دریافت کیا گیا کہ اہل مکہ میں سے ایک شخص عمرہ کرنا چاہتا ہے کیا وہ مکہ کے اندر ہی سے عمرہ کا احرام باندھے؟ فرمایا: نہیں بلکہ حل کی طرف نکل جائے اور وہاں سے احرام باندھ کر آئے۔ اور اوجز میں ہے کہ جمہور اس کے قائل ہیں کہ احرام عمرہ کے لیے مکہ والوں کا میقات حل ہے۔

موفق وغیرہ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ اگرچہ علماء کے مابین اس امر میں اختلاف ہے کہ احرام کے لیے سب سے افضل جگہ کونسی ہے، اور حل کی طرف نکلنے کے وجوب کی تصریح حافظ، قسطلانی، عینی، قاری، نووی، ابی اور شوکانی وغیرہ نے کی ہے۔ اور امام بخاریؒ نے "صحیح" میں ایک باب کا عنوان قائم کیا ہے: "باب مهل اهل مكة للحج والعمرة" اور اس کے ذیل میں مواقیت کی حدیث ذکر کی ہے جس میں یہ لفظ ہیں: "یہاں تک کہ احرام باندھیں اہل مکہ مکہ سے" لیکن شراح صحیح نے عمرہ کے ساتھ حدیث کی تخصیص کی ہے (یعنی اہل مکہ کو صرف حج کا احرام مکہ سے باندھنے کا حکم ہے، عمرہ کے احرام کا یہ حکم نہیں بلکہ عمرہ کا احرام حدود حرم سے باہر نکل کر باندھا جائے) اور انہوں نے ترجمہ بخاری کی یہ توجیہ کی ہے کہ

سے آئے اور ابن سیرین سے نقل کیا ہے کہ ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ کے لیے تنعیم کو میقات مقرر کیا ہے۔ اور تحفۃ المحتاج میں ہے کہ عمرہ کا ارادہ کرنے والے کے لیے حل کی افضل جگہ جعرانہ ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں سے رات کے وقت عمرہ کیا تھا۔ اس کے بعد تنعیم پھر حدیبیہ۔ اھ۔

میں کہتا ہوں کہ نووی نے "مناسک" میں اور عام فقہائے شافعیہ اور ان کے شارحین نے یہی ترتیب ذکر کی ہے۔ حنابلہ کی کتب نیل المآرب اور الروض المربع میں کسی جگہ کی تعیین کو ترجیح نہیں دی، بلکہ صرف حل کے شرط ہونے پر اکتفا کیا ہے اور ابن قدامہ کہتے ہیں "حل کی جس جگہ سے بھی احرام باندھے جائز ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ کو تنعیم سے اس لیے عمرہ کرایا تھا کہ وہ مکہ سے حل کی قریب تر جگہ تھی" اور دردیر کہتے ہیں: "اور اس کا حل کی طرف نکلنا ضروری ہے، اور جعرانہ دوسری جگہوں سے اولیٰ ہے، اس کے بعد تنعیم" میں کہتا ہوں کہ دسوقی نے ان دونوں کو یکساں قرار دیا ہے۔ گویا ان میں ایک کو دوسری جگہ پر کوئی فضیلت نہیں۔ اھ۔

اور حنفیہ کے نزدیک تنعیم افضل ہے، جیسا کہ بہت سے اہل فروع نے، جن میں صاحب در مختار بھی شامل ہیں، اس کی تصریح کی ہے۔ اھ ملخصاً۔

تیسرا فائدہ: اشہر حج میں عمرہ کرنا

اور سر یہ ہے کہ اہل جاہلیت اس کو افجر فجور (سب سے بڑی بدکاری) سمجھتے تھے پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قولاً و فعلاً باطل قرار دیا۔ اور اسی بنا پر صحابہ کو حج فسخ کرکے عمرہ بنانے کا حکم فرمایا تاکہ اس کے جواز کی خوب شہرت ہو جائے۔ حافظ کہتے ہیں: "اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ جو شخص اہل حج میں سے نہ ہو اس کے لیے تمام ایام میں عمرہ کرنا جائز ہے۔ البتہ حنفیہ سے نقل کیا گیا ہے کہ عرفہ، یوم النحر اور ایام تشریق میں مکروہ ہے۔" میں کہتا ہوں کہ حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: "یہ بات کامل عمرہ کی موجب ہے کہ غیر اشہر حج میں عمرہ کرے۔" سیوطی کہتے ہیں کہ ابن ابی شیبہ وغیرہ نے حضرت ابن مسعودؓ سے نقل کیا ہے کہ ان سے اشہر حج میں عمرہ کرنے کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا "حج کے معروف مہینے ہیں، جن میں عمرہ نہیں۔" اور ابن ابی شیبہ اور ابن جریر نے ابن سیرینؒ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا: "کسی اہل علم نے اس امر میں شک نہیں کیا کہ غیر اشہر حج میں عمرہ کرنا اشہر حج میں عمرہ کرنے سے افضل ہے۔" اور ابن عون سے نقل کیا ہے کہ قاسم سے اشہر حج میں عمرہ کرنے کے بارے میں دریافت

کیا گیا تو فرمایا وہ (یعنی صحابہ کرام) اس کو تمام نہیں سمجھتے تھے۔ اھ ملخصاً۔

اور موطا میں ہے کہ امام مالک، نافع سے اور وہ ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا "اپنے حج اور عمرہ کو جدا جدا ادا کیا کرو، یہ تمہارے حج کو زیادہ پورا کرنے والی چیز ہے۔ اور عمرہ کو زیادہ پورا کرنے والی بات یہ ہے کہ تم اشہر حج میں عمرہ کرو" میں کہتا ہوں کہ حضرت عمرؓ کا مقصود تمتع سے منع کرنا تھا اور اس مسئلہ میں ان کا مسلک معروف ہے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ مکہ کی طرف بکثرت سفر کیا جائے تاکہ حج اور عمرہ کے لیے مستقل طور پر الگ الگ سفر ہوا کرے، علاوہ ازیں اس کی دیگر وجوہ معروف ہیں جن کی تفصیل اوجز اور حاشیہ لامع میں مذکور ہے۔

خاتمۂ رسالہ | اس مختصر رسالہ میں جن امور کے ذکر کرنے کا ارادہ تھا یہاں بحمد اللہ ان کا اختتام ہوتا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عنایت سے جمعۃ المبارکہ کی صبح ماہ مبارک رجب المرجب کی پندرہ تاریخ گزشتہ تیرہ سو نوے ہجری (علیٰ صاحبہا الف الف صلوٰۃ وتحیہ) میں اس کی تسوید سے فراغت ہوئی۔ اس کی تکمیل میں تقریباً ایک مہینے تک توقف رہا، جس کا سبب یہ ہوا کہ محرم الحرام میں جب آنکھ کا آپریشن ہوا اس کے طبی معائنہ اور علاج معالجہ کے لیے علیگڑھ جانا اور وہاں ہسپتال میں رہنا پڑا۔

اس بندہ پر اللہ رب العزت کے جو بہت ہی عظیم الشان انعامات اور بے شمار احسانات ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس بندہ نے جس قدر فضائل کے رسائل تالیف کئے ہیں مثلاً فضائل قرآن اور فضائل حج وغیرہ اور ان کے علاوہ جو کتابیں تالیف کی ہیں ان سب رسائل وکتب کے بارے میں بندہ کو ان کے بعض مخلصین احباب کی رؤیا صالحہ اور مبشرات سے نوازا گیا۔

یہ رسالہ "حجۃ الوداع و عمرات" جب اختتام کے قریب پہنچا تو ہمارے ایک مخلص دوست جناب الحاج سلیمان افریقی نے (جو مدت تک مدینہ منورہ میں اس بندہ کے پاس رہ کر اوراد و اشغال میں مشغول رہے اور سعادت حج سے بہرہ اندوز ہونے کے بعد سہارنپور آگئے۔ اور سفر و حضر میں ہمیشہ میرے ساتھ رہتے ہیں) ایک خواب دیکھا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ حضرت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ عالی میں شرف قبولیت سے سرفراز ہوا۔ الحاج سلیمان کے الفاظ میں خواب کا متن حسب ذیل ہے۔

"میں نے خواب دیکھا کہ میرے دل میں زیارت نبوی کا داعیہ پیدا ہوا اور میں شوق

کی طرف پیدل چل کھڑا ہوا، ابھی تھوڑی ہی دور چلا تھا کہ مجھے دور سے حرم نبوی نظر آنے
لگا۔ دوڑ میں اختیار کر کے میں حرم شریف کی طرف جا رہا تھا اچانک میں اپنے تئیں آپ کے
(یعنی حضرت شیخ کے) حجرے کے سامنے کھڑا پاتا ہوں۔ بہت سے لوگ حجرے کے باہر
کھڑے ہیں اور مولانا محمد یونس صاحب استاذ حدیث مظاہر العلوم سہارنپور حجرے سے
باہر آ رہے ہیں۔ اور مجھ سے کسی نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حجرے کے اندر رونق افروز
ہیں، یہ کہتے ہوئے اس نے مجھے داخل ہونے کا اشارہ کیا، میں اندر گیا تو فرط مسرت
کو ضبط نہ کر سکا اور میرے جسم میں گویا بجلی کی لہر دوڑ گئی، میں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ
علیہ وآلہ وصحبہ وسلم آپ کی چارپائی کے سرہانے کی جانب تکیہ لگائے تشریف فرما ہیں،
سفید دستار زیب سر ہے، ریش مبارک سفید ہے، اور آنکھوں پر چشمہ لگائے ہوئے ہیں۔
میں نے سلام عرض کیا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام
کا جواب مرحمت فرمایا اور مصافحہ کے لیے دست مبارک بڑھایا، پھر آپ کی جانب متوجہ
ہوئے ——— آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دائیں جانب تپائی پر بیٹھے ہیں، رسالہ
"جزء حجۃ الوداع" شائع ہو چکا تھا، یہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کے سننے میں مصروف
ہوگئے اور میں چارپائی سے نیچے اقدام عالیہ کی جانب بیٹھ گیا۔ اھ

اس رؤیا میں جو واقعہ ذکر کیا گیا ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم کا اس ہدیۂ سنیہ
کی طرف سماع کے لیے متوجہ ہونا اور اس کے بعد رسالہ کی قراءت میں مصروف ہونا یہ اس بندۂ ضعیف
کے لیے شرف و ابتہاج کا کافی سرمایہ ہے۔ فللّٰہ الحمد والمنۃ۔

تصانیف

حضرت اقدس شیخ الحدیث

مولانا محمد زکریا صاحب، مظاہر العلوم سہارنپور

★ اُردو تصانیف:

۱۔ خصائل نبوی شرح شمائل امام ترمذیؒ
۲۔ حکایاتِ صحابہؓ
۳۔ فضائلِ ذکر
۴۔ فضائلِ نماز
۵۔ فضائلِ قرآن مجید
۶۔ فضائلِ رمضان
۷۔ فضائلِ تبلیغ
۸۔ فضائلِ درود شریف
۹۔ فضائلِ صدقات
۱۰۔ فضائلِ حج
۱۱۔ تبلیغی جماعت پر چند عمومی اعتراضات اور اُن کے مفصل جوابات
۱۲۔ موت کی یاد
۱۳۔ قرآن عظیم اور جبریہ تعلیم
۱۴۔ تقریر بخاری
۱۵۔ تاریخ مشائخ چشت
۱۶۔ اکابر کا رمضان
۱۷۔ خوانِ خلیل
۱۸۔ اکابر کا سلوک و احسان
۱۹۔ مکتوبات شیخ
۲۰۔ آپ بیتی
۲۱۔ تقریر مودودیت
۲۲۔ حجۃ الوداع
۲۳۔ الاعتدال فی مراتب الرجال (اسلامی سیاست):
اس کتاب میں سیاسی مسائل حاضرہ کے متعلق کافی ذخیرہ جمع کیا گیا ہے۔ سات سوالوں کے جوابات انتہائی سنجیدگی اور متانت سے تحریر کئے گئے ہیں۔

★ عربی تصانیف:

۱۔ اوجز الاحبار شرح معانی الآثار
۲۔ لامع الدراری علی جامع البخاری
۳۔ اوجز المسالک شرح موطا امام مالکؒ
۴۔ الکوکب الدری (شرح ترمذی)
۵۔ حجۃ الوداع و عمرات النبی صلی اللہ علیہ وسلم
۶۔ الابواب والتراجم للبخاری
۷۔ بذل المجہود فی شرح ابی داؤد

ملنے کا پتہ: معہد الخلیل الاسلامی
۳/۳۳۵، بہادر آباد، کراچی ۵، پاکستان